جلد ۲ جنوری سنہ ۱۹۱۲ء نمبر ۲

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ سیاسی۔ اخلاقی۔ تاریخی اور علمی مضامین کا

مخزن

ایڈیٹر شیخ محمد اکرام۔ محمد عبد الراشد الخیری

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبد الرشید الخیری

قیمت سالانہ قسم اول [illegible] قسم دوم [illegible] ۔ تمدن پریس دہلی میں چھپ کر شائع ہوا ۔ قیمت فی پرچہ [illegible] ۔ پتہ [illegible] مدیر [illegible]

عِصمَت

(دہلی)

جہاں یہ سلسلے ہوچکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کے واسطے عصمت ایک نعمت ہے جس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی صلاح و بہبودی ملحوظ ہے کنواری لڑکیوں کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق استانی عصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عصمت اُن کو بتلائے گا کہ کنوار پنے کی زندگی اُن کو کس طرح گزارنی ہے؟ ماں باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت۔ بڑوں کی تعظیم۔ چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں اُن کو شامل ہونا ہے اس کے لئے انہیں کیا تیاری کرنی ہے۔ جو جو دقتیں اُن کو پیش آئینگی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔ غرض ان کی آئندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پُر لطف و باطمینان بسر کرنے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں بیاہی لڑکیوں کو خانہ داری۔ گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے۔ وہ عصمت ہے عصمت اُن کو بتلائیگا کہ جس دولت کو وہ بے فکری و عیش خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کئے ہیں اُن کی ذمہ داریاں اُن پر کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے پل بڑھ کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے۔ اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے عصمت بتلائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائیگا +

ٹائیٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانے والا۔ فرصت میں کہانیاں سنانیوالا۔ مذہب کی وقعت بتانیوالا عصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا۔ عصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے ہر مہینے ۴۴ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول موتی ہیں قیمت سالانہ (۳ روپے)

منیجر عصمت و تمدن

(دہلی)



جلوس شاہی بمقام دہلی مورخہ ۰ دسمبر سنہ ۱۱ء

تمدن

علم ادب کی بے ثباتی

طبع انسانی کی یہ بھی ایک عجیب حالت ہے کہ بعض اوقات ذہن میں خیالات کا کچھ ایسا تار بندھ جاتا ہے کہ اُسکو حالتِ خواب کا مزا آجاتا ہے اور وہ قدرتی طور پر شور و شغب سے بچکر کسی سنسان اور تاریک مقام کی تلاش کرتی ہے۔ جہاں کہ وہ اپنی کیفیت استغراق کا لطف اُٹھائے اور خاموشی کے ساتھ ہوا پر محل تیار کرے۔ ایک دن مجھ پر بھی یہی حالت طاری ہوئی اور میں طرح طرح کے خیالات میں قبرستان ویسٹ منسٹر میں ادھر اُدھر سیر کرتا پھر رہا تھا کہ دفعتہً بچوں کے شور نے جو وہیں کہیں فٹ بال کھیلتے ہوئے آنکلے تھے۔ میری محویت اور اوس جگہ کی خاموشی میں خلل ڈالدیا اور اُن کے قہقہے قبروں سے ٹکرانے لگے۔ میں اس شور سے پریشان ہوکر قبرستان کے اندرونی حصوں میں گھس گیا اور لائبریری کے قریب جا پہونچا۔ یہاں آکر میں نے لائبریرین سے لائبریری کے اندر جانے کی

اجازت چاہی تو اُس نے جواب میں اپنی جیب سے کنجیاں نکالیں اور لائبریری کا دروازہ کسیقدر دقّت سے کہولا معلوم ہوتا تہا کہ وہ بہت ہی کم کام میں آتی تہیں

لائبریرین مجھ کو لیکر اندر گہسا میں نے دیکھا کہ میں ایک بلند ہال میں کہڑا ہوا ہوں جس کی چہت بڑی موٹے موٹے شہتیر و ںپر پہیلی ہوئی ہے۔ چہت سے چند فٹ نیچے اور فرش سے بہت بلندی پر متعدد روشن دان ہتے اور آتش دان کی دیوار پر کسی پادری کی ایک پُرانی تصویر لٹکی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹی سی گیلری میں اور ہال کے اندر چاروں طرف نفیس نفیس الماریوں میں کتابیں چنی ہوئی تہیں جو بڑی بے تکلفی سے ایک دوسرے کے جسم پر سہارا لیے ہوئے تھیں۔ کتابوں کا اکثر حصّہ پُرانے زمانہ کا تھا اور جن کی حالت سے یہ ظاہر ہوتا تہا کہ اُن کے ہاتہوں نے تو آتنا نہیں زمانہ کے ہاتھوں نے اُن کے رنگ و روغن کو بالکل اوڑا دیا ہے۔ کمرے کے مرکز میں ایک خاموش میز تھی جس پر دو تین کتابیں۔ ایک بن سیاہی کی دوات اور ایک قلم جسکی نب استعمال میں نہ آنے سے زنگ آلود ہوگئی تہی۔ رکھی ہوئی تھیں۔ یہ کمرہ خاموشی کے ساتہہ مطالعہ اور گہرے غور و فکر کے لیے نہایت موزوں تھا چونکہ اُس کی تہہ تہہ دیواروں نے دنیا کی آواز چہل پہل کو باہر کے باہر روک رکھا تھا۔

الماریوں سے ایک چھوٹی مگر موٹی کتاب جس پر چمڑے کی جلد پیتل کی پتریوں سے جڑی ہوئی تہی۔ میں نے نکالی اور میز کے قریب ایک شاندار کرسی پر بیٹھ گیا۔ مگر و پیش کی خموشی نے دل میں کچھ ایسی کیفیت پیدا کی کہ میں بجائے پڑہنے کے کچھ سوچنے لگا۔ جبوقت میں سے چاروں طرف نگاہ اوٹھا کر اِدان پرانی کتابوں کو دیکھا جنکو بظاہر کسی نے مدت سے ہاتہ نہ لگایا تہا۔

تو میرے دل میں خیال گذرا کہ کتب خانہ بھی ایک قسم کا علمی گورستان ہے جہاں مصنفین اپنی اپنی کتابوں کی شکل میں - اُن مردوں کی مانند جن کی نعشیں مصالح لگا کر مدت دراز تک گلنے اور سڑنے سے محفوظ رکھی جاتی ہیں الماریوں میں مدفون ہیں -

میں نے خیال کیا کہ ان میں سے ایک ایک کتاب پر کس درجہ دماغ سوزی کی گئی ہوگی - کتنے دل اُکتا دینے والے دن کتنی آنکھوں میں کٹنے والی راتیں صرف ہوئی ہونگی اور کیسے اُس کے مصنف نے - دنیا اور اہل دنیا کے مبارک اور خوشنما چہروں سے اپنی آنکھیں بند کر کے سنسان اور تاریک تہ خانوں میں بیٹھ کر سخت جانفشانی و جانکاہی اور غور عمیق سے اسکو تصنیف کیا ہوگا - مگر یہ جانفشانی اور دماغ سوزی کس لیئے تھی؟ کیا کسی خاک آلودہ الماریوں کی صرف ایک انچ جگہ کے لیے؟ کیا اس لیے کہ زمانہ مستقبل میں اُس جگہ میرا جیسا کوئی بھٹک کر آنکلنے والا نیم خفتہ و نیم بیدار شخص - اُس کے سرورق کو پڑھکر ادھر اُدھر دیکھنے لگے؟ کیا اس لیئے کہ چند صدیوں کے بعد اُس کا نام و نشان تک صفحہ ہستی پر نہ رہے؟ تصنیف و تالیف جسکو مخلوق بقائے نام کا ذریعہ سمجھتی ہے اور جس پر بڑا فخر کرتی ہے کیا اُس کا یہی انجام ہے؟ بقائے نام کی اُمید ایک خوفناک دہوکا ہے! ایک مہمل آواز ہے جو کسی گھنٹے کی آواز کی طرح تھوڑی دیر تک اپنے جسم سے آپ ٹکراتی ہے - کچھ دقیقے تک سننے والے کے کان میں گونجتی ہے اور پھر خلا نسیاں میں ڈوب کر خود اپنے وجود سے بے خبر ہو جاتی ہے -

میں بیٹھا ہوا یہ سوچ رہا تھا اور چپکے چپکے الفاظ شکایت میرے لبونپر لبوں کی جنبش کے ساتھ تڑپ رہے تھے - پھر میرے ایک ہاتھ نے

میرے سرکو سہارا دیے رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ کتاب کے کھیلنے میں مصروف تھا کہ میں نے اُس کتاب کو کھولا تو اُس نے اس طرح دو تین ہلکی ہلکی چیخیں ماریں جیسے کوئی شخص گہری نیند کے بعد سمع خراش آوازیں نکالتا ہوا اُٹھتا ہے اور پھر وہ مجھ سے باتیں کرنے لگی - اوّل اوّل تو اُسکی آواز بڑی موٹی اور جھنجھنی تھی چونکہ اوسکے کنارونپر کسی محنتی مکڑی نے جابجا جالے تن رکھے تھے اور اُس کے صفحے کمرے کی نمی اور سردی سے کہیں سے چپکے ہوئے اور کہیں سے اُبھرے ہوئے تھے مگر کچھ دیر کے بعد اُسکی آواز صاف اور اُس کا لہجہ سمع فریب ہو گیا لیکن اُس کی زبان عجیب اور متروک تھی - ادائے الفاظ میں لب ولہجہ ہمارے زمانہ کے لیے گنوارو تھا - بہرکیف جہانتک ممکن ہو گا میں اُس گفتگو میں اپنا تصرف کر کے اپنے ناظرین کو اُس کی زبان سمجھنے کی تکلیف سے سبکدوش کرونگا

اُس نے اپنی گفتگو شکایت سے شروع کی اور جھنجھلا کر بولی کہ دنیا سخت غفلت شعار ہے اور اُس کے نزدیک قابل قدر شے کی کوئی قدر نہیں آج دو صدیاں گذریں کہ مجھ کو کسی نے چھوا تک نہیں - جب کبھی لارڈ پادری ادہر آنکلتا ہے تو اپنے فرض کو پورا کرنے کے بطور کھڑے کھڑے ایک نظر ہم کو بھی دیکھ جاتا ہے - آخر اس کے معنے کیا ہیں کہ ہم چند ہزار کتابوں کو یہاں بند کر کے رکھ چھوڑا ہے اور ہماری نگرانی کے لیے چند لائبریرین مقرر کر دیے ہیں جو باری باری سے صرف اس بات کی نگاہ رکھتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی غائب تو نہیں ہو گئی - کتابوں کا کام یہ تھا کہ لوگ آکر اونہیں پڑھتے - اون سے حظ حاصل کرتے - اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں ایک قانون پاس کرتی کہ متعدد لوگ ہمارے مطالعہ کے لیے مقرر کیے جائیں - اگر پھر بھی ہماری شکایت رفع نہ ہوتی تو میں حکم دیتی کہ ایک خاص

مدت میں ایک بار ویسٹ منسٹر اسکول کے طلبار کو صرف اس لئے چھٹی دیجائے کہ وہ ہم میں آگھسیں تاکہ کم از کم ہم کو تازی ہوا تو میسر ہو جایا کرے۔ ہماری حالت تو عثمانی حرم کی پردہ نشین بیگموں اور ہندوستان کی خانہ نشین بی بیوں سے بھی گئی گذری ہے"۔ میں نے کہا "میری عالی دماغ دوست۔ اس قدر طیش میں نہ آؤ۔ تم اپنی ہمعصر کتابوں سے جو دنیا کے ہاتھوں میں گئیں اور جن کی زندگی تم سے مختلف رہی۔ کہیں زیادہ خوش نصیب ہو۔ اس قدیم ہال میں آجانے سے تمھاری وہی وقعت اور وہی قیمت ہوگئی جو ان برابر کی قبر والوں کی ہے۔ جن میں اولوالعزم تاجدار۔ جنگجو شہسوار پڑے ہیں۔ جن میں متمول صاحبِ وقار اور خود تمھارے مصنفان نامدار لیٹے ہوئے ہیں اور جن کی خاک جواہرات کا دفینہ سمجھی جاتی ہے برخلاف اس کے تمھاری ساتھی وہ کتابیں جو اس جگہ کے شرف سے محروم رہیں۔ خاک و غبار بنکر مدت ہوئی کہ عدم کے پہلو میں سو چکی ہیں ہوا سے اِس کتاب کی نمی خشک ہونے لگی اور میرے ہاتھوں کی گرمی نے اُس کے صفحے کے گرٹ ہے اور اُبھار دب اور اوبھر کر ذرا سیدھے ہوئے اور اب وہ قد و قامت میں کسی قدر پھیل گئی اور یوں گویا ہوئی۔ "ہم اس لیے تصنیف ہوئی تھے کہ دست بدست پھریں۔ سابق علم کی آنکھ کو اپنے خیالات میں متوجہ کرے۔ دنیا کے مکروہ مناظر سے بچائیں اُس کے دل و دماغ کو عقل و شعور کے نور سے روشن کریں اور نہ اس لیے کہ بتیل کی میخیں ہم کو جکڑلیں۔ الماری کی تاریکی ہمپر اپنی دوداونی چادر پھیلا دے اور بنہ خور کیڑوں کا پیٹ ہمارا قبرستان بنے تم دیکھو اور ذرا انصاف کرو کہ ہماری حالت کیا ہوگئی ہے۔ بے رحم کیڑے

ہماری جلد میں ایک طرف سے منہ ڈالکر ہمارے سینے کو چھیدتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے ہیں۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ تم اتفاق سے آگئے اور کامل ہلاکت سے پہلے مجھ کو دو دو باتیں کرنے کا تم سے موقعہ ملگیا"

میں نے جواب دیا "میری قابلہ۔ دست بدست پھرنے کی حسرت جو تم نے بیان کی اگر اس کے پورا ہونے کی صورت معرض وجود میں آتی تو غالباً اب تک تمھارا وجود تو درکنار نام ونشان بھی باقی نہ رہتا۔ تمھاری صورت سے تمھاری عمر کا پتہ لگتا ہے اور جیسا کہ تم نے ابتدا میں کہا۔ تمھاری عمر واقعی ڈیڑھ سو سال کی جچتی ہے۔ میری دانست میں زیست کا اتنا زمانہ ایک معقول زمانہ ہے۔ لیکن یہ ڈیڑھ سو سال کی عمر تم نے صرف اس قدیم کتب خانہ کی اور دست انسان سے محفوظ رہنے کی بدولت پائی ہے ورنہ تم کو معلوم ہے کہ تمھارے وقت کی کتابوں کا کیا حشر ہوا۔ گرومیٹ ([illegible]) نے اپنے نام کو صفحۂ عالم پر قائم رکھنے کے لیے اسقدر سخت محنت کی۔ اسقدر خون پسینہ ایک کیا کہ کوئی دوسرا مصنف اس اعتبار سے بمشکل اوسکا مقابلہ کرسکتا ہے۔ سنتا ہے کہ اس نے ڈیڑھ سو کتابیں تصنیف کیں۔ گویا کتابوں کا ایک مینار چن دیا۔ مگر افسوس امتداد زمانہ نے اس مینار کو ڈھا دیا اور اس کا ایک ایک پتھر پس کر خاک کا ڈھیر بن گیا۔ دو چار کتابیں جو کسی پرانے کتب خانہ میں پائی بھی جاتی ہیں ان کو بھی آثار قدیمہ کا دلدادہ گاہ گاہ آکر ستا جاتا ہے۔ تم نے کم برین سس (Combnensis) کا جو فلسفہ الٰہیات اور فن تاریخ وغیرہ میں بڑا بلند پایہ کتاب تھا نام سنا ہے اس شخص نے دو بار ایک جلیل القدر عہدہ سے انکار کردیا۔ اور زندگی کی تمام

دلفریبیوں کو حقیر سمجھا محض اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو کسی خاموش مقام پر بند کر کے آنے والی نسلوں کی مسرت اور دلچسپی کے واسطے کچھ سامان مہیّا کر جائے۔ مگر آنے والی نسلوں نے اُس کا نام تک نہ پوچھا اور اُسکی تن دہی کی کچھ بھی داد نہ دی ہنری (Henry H.) جس نے ایک فاضلانہ تاریخ انگلستان کے علاوہ دنیا کے ہیچ اور کمتر از ہیچ ہونے پر ایک رسالہ لکھا۔ دنیا نے اُس سے پورا پورا انتقام لیا اور سہواً بھی کوئی اُسکو اور اُس کی تصانیف کو یاد نہیں کرتا۔ اسی طرح جوزف ولیس۔ ولیم۔ سائی من . . . .

"مُعاف کیجئے" میرے کلام کو کاٹ کر کتاب نے کہا" تم میری عمر کیا سمجھتی ہو۔ تم اُن مصنفوں کے ذکر میں چلے گئے جنکا زمانہ میرے زمانہ سے بہت قبل گذرا ہے اور جن کی تصانیف یا تو لاطینی یا فرانسیسی زبان میں تہی اور غیر زبان غیر ملک میں جس بخت کی مستحق ہے وہی سلوک اِن کتابوں کے ساتہہ کیا گیا وہ مستحق تہیں کہ انگلستان اُن پر گمنامی کا پردہ ڈالدے وہ مستحق تہیں کہ تباہ و برباد ہو جائیں مگر جناب میں۔ میں تو ایک مشہور آفاق مطبع میں چھپی اور اس ملک کی مادری زبان میں لکھی گئی اور ٹھیک اُسوقت جب کہ انگریزی زبان زمانہ شیر خواری سے نکل کر لڑکپن اور لڑکپن سے شباب اور شباب سے کاروبار دنیا کے لیے اچھی طرح قابل ہو گئی تہی اور میری زبان نہایت شستہ و پاکیزہ سمجھی جاتی تہی۔"

(یہہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کتاب نے اِس موقعہ پر ایسے کہنہ اور متروکہ محاورات استعمال کیئے جنکو صورت بالا میں لانے میں مجہہ کو کمال دشواری کا سامنا کرنا پڑا)

میں نے کہا۔ اچھا تو تم اپنی ہی زمانے کی تصنیفات کو لو اُن کے وجود کا خاتمہ بھی کنارِ گمنامی میں ہو چکا ہے۔ زبان کی شستگی اُس کی وسعت اُسکا پورے طور پر رواج پا جانا جن کی بنا پر تم بقائے دوام کا دعویٰ کرتی ہو مصنفوں یا مولفوں کے طبع زاد مگر کمزور تصور ہیں۔ ہر زمانے کے مصنفین یہی خیال کرتے چلے آئے ہیں کہ جس زمانہ میں ہم تصنیف و تالیف کر رہے ہیں اوس میں حسن و روانی آچکی ہے۔ اُس میں ہر قطع کے جذبات ہر طرح کی کیفیات کو ہر علم کے مطالب و مصطلحات کو بآسانی ادا کرنے کی قوت پیدا ہو چکی ہے۔ اُس میں استحکام اور کامل رواج کی شان قایم ہوگئی ہے۔ اس لیے اس زبان کا مردہ یا ہماری تصنیف و تالیف کا ضائع ہونا ایک ایسا امر ہے جس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ حالانکہ کوئی وجہ نہیں کہ زبان میں تجدید و توسیع (تمام زبانوں میں الفاظ کے معنی گھٹتے اور بڑھتے رہتے ہیں) کے ذریعہ سے الفاظ۔ محاورات اور طرز بیان میں تبدیلی واقع نہو اور زبان نیچر کے قانون تغیر کے جس کے تسلط میں عالم موجودات کی ہر ایک شے ہے تحت میں نہ آئے میری دانست میں ہر لائق و ہر دل عزیز مصنف کو جسے اپنے علمی کارنامہ پر ناز ہے اور جو اپنی روشن دماغی کو دائمی شہرت کا سبب سمجھتا ہے ضرور اس قانون کا خیال رکھنا چاہیے۔ اُسکو لازم ہے کہ وہ امتداد زمانہ سے زبان کی رفتہ رفتہ تبدیلی اور مذاق طبائع کے تغیر و تبدل کو مدنظر رکھے۔ اُسکو نظر اٹھا کر اپنے ملک کے قدیم مصنفوں کو دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنے زمانہ میں بڑے عالم اور بڑے فاضل سمجھے جاتے تھے۔ یہ لوگ اُن کے لیے ادب کی تکیں بچھانے اور تحسین کے ہونٹ

ہلانے میں سرگرم تھے مگر جب اونکا زمانہ گذر گیا۔ دوسرا دور آیا۔ نئی نئی طبیعتیں اور نئے نئے مذاق پیدا ہوئے تو خود اُن کی تصانیف نے اپنی کہنگی اور فرسودگی کے سبب اُنکو شہرت و فضیلت کی مسند سے اوتار کر اُن کی جگہ نئے مصنفوں کو مسند آرا کیا۔ وہ خود پردۂ گمنامی کے سپرد ہوئیں اور اُس کے بعد کیڑوں کی غذا بنکر جس مادّہ سے اُن کا گوشت و پوست تیار ہوا تھا اس ہی میں جا ملیں مصنف کو یقین رکھنا چاہیئے کہ اُسکی اپنی زبان کو بھی جو اپنے وقت میں نعرۂ آفریں بلند کروا رہی ہے جوشتگی کا نمونہ سمجھی جا رہی ہے ایک زمانہ میں پُرانی پڑتی اور ترک ہوتی جائے گی اور آخر کار خود اپنے ہی وطن میں ایسی اجنبی اور غیر مانوس ہو جائے گی جیسے کہ مصر میں احرام مصری یا جیسے ملک تاتار میں قدیم کتبے جو اب تک جا بجا پائے جاتے ہیں میں اس وقت جوش سے کسی قدر گرما گیا تھا۔ میں نے کہا جب کبھی میرا گذر کسی جدید لائبریری میں ہوتا ہے اور وہاں میں چمکدار کناروں اور نہایت آب و تاب کی مجلد کتابیں دیکھتا ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ دیر وہاں بیٹھکر آنسو بہاؤں اور مجھ پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو زرزکسیں شاہ ایران کے دل میں پیدا ہوئی تھی جبکہ وہ اپنی ٹڈی دل فوج کا زرق برق وردیوں اور چمکتے ہوئے ہتھیاروں میں سجی کھڑی تھی۔ معائنہ کر رہا تھا اور اُس کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ ایک صدی کے اندر اندر ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے گا۔"

مگر میں زبان کے تغیر کو عموماً تمام عالم کے واسطے اور خصوصاً اہل تصانیف کے لیے خدا کی ایک ایسی رحمت سمجھتا ہوں جو کمال دانائی پر مبنی ہے اس کا ثبوت میرے پاس موجود ہے جسکو میں ایک مثال کے پیرایہ میں

بیان کروں گا۔ ہم روزمرّہ دیکھتے ہیں کہ انواع و اقسام کے اشجار زمین سے نکلتے ہیں۔ پھلتے پھولتے ہیں اور کچھ مدت تک میدان اور کھیتوں کو اپنے برگ و بار سے پُرفضا بناکر مرجھا جاتے ہیں اور آخرش مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتے ہیں تاکہ ان کے بعد کے آنے والے درختوں کے لئے جگہ خالی ہو جائے۔ اگر یہ صورت نہوتی اور کوئی بھی درخت قدرتاً نیست و نابود نہوا کرتا تو زمین کی سرسبزی و زرخیزی بجائے رحمت کے ایک زحمت ہو جاتی۔ کثرت اشجار و قش یک آثار کے بوجھ سے زمین چیخ اُٹھتی۔ اور روئے زمین ایک ایسی سطح بنجاتی جس پر آپس میں پھنسے ہوئے۔ شاخوں میں شاخیں اڑائے ہوئے درختوں کا جال چھا جاتا۔ انسان کو قدم اوٹھانا اور زمین پر رہنا مشکل ہو جاتا۔ اسیطرح علم و ذہانت۔ غور و فکر کے نتائج کو زوال ہوتا ہے تاکہ جانشین مصنفوں کی جولانی طبع کو کھلا میدان ملے اور اسیطرح زبان آہستہ آہستہ جگہ چھوڑتی جاتی ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ کتابیں ایک وقت خاص تک اپنی شہرت کا پھریرا اوڑا کر رخصت ہوتی جاتی ہیں۔ اگر یہ نہوتا تو پچھلے اور موجودہ خیالات کا ہجوم دماغوں میں سخت پریشان کرنے والا تلاطم پیدا کر دیتا۔ زمانہ گذشتہ میں خیالات کا دائرہ محدود کرنے کے لیے چند قدرتی سامان موجود تھے۔ اول تو کتابیں قلم سے نقل ہو کر چلتی تھیں اور ظاہر ہے کہ یہ مشکل وقت اور دیر طلب تھی دُوم جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ یا تو چمڑے پر اور چمڑا ایک قیمتی شے تھی اس لئے نئی نشارت قلمبند کرنے کے لیے اسباب کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ پہلے نوشتہ کو مٹایا جائے یا خیالات پے پائی ہیں papyrus (P) مصری پودے کے پتوں پر لکھے جاتے تھے جو خستہ اور

اور جلد خراب ہوجانے والے تھے۔ سوم تصنیف و تالیف کا کام نہایت محدود اور کم بار آور تھا۔ صرف وہ لوگ اس مشغلہ میں حصّہ لیتے تھے جو خانقاہوں میں سجّادہ پر بے فکری اور آرام سے زندگی گذارتے تھے۔ ان حضرات کا ہم کو ممنون ہونا چاہئے کیونکہ یہی تھے جنھوں نے قدیم زمانے کے خیالات کے سیلاب کو دیوار بنکر روکا ورنہ موجودہ ذہانت انہیں تھپیڑے کھاتے کھاتے غرق ہوجاتی۔

لیکن اب علم کی ترقی اور کاغذ و پریس کی ایجاد نے مذکورہ بالا کاوٹوں کو بالکل صاف کردیا۔ پریس نے ہر ایک شخص کو مصنف بنادیا اور ہر ایک دماغ کو اس قابل کردیا کہ اپنے نتیجہ فکر تمام علمی دنیا میں پھیلا دے مگر اسکا انجام بڑا اندیشہ ناک ہوگا۔ علم ادب جو پہلے ایک چشمہ تھا دریا بنا اور دریا سے اب ایک بحرِ زخار ہوگیا۔ چند صدیاں پہلے ہزار پانسو مجلدات ایک بڑا کتب خانہ شمار ہوتی تھیں مگر آجکل کے کتب خانوں کا جن میں لاکھوں جلدیں قسر اسم ہیں کیا نام رکھتا ہوگا۔ طرفہ تر یہ کہ پریس کو اس پر بھی قرار نہیں وہ تعداد مذکور کو دن دونی اور رات چوگنی کرتے میں بڑی عجلت کے ساتھ مصروف ہے۔ یہ دیکھکر مستقبل پر مجھ کو بڑا ترس آتا ہے وہ خیالات کا کہاں تک مطالعہ کرے گا۔ اور کہاں تک اُن کو اپنے دماغ میں محفوظ رکھہ سکے گا۔ مجھ کو خوف ہے کہ زبان کا آہستہ تغیر و تبدل پریس کی تیزی رفتار کا ہرگز مقابلہ نہیں کرسکتا۔ میں نے یہ بھی خیال کیا تھا کہ کتنہ چینوں کا گروہ خیالات کی کثرت کو روکے گا جو مکروہ شتاقان تصنیف کو میدان تصنیف کے اندر قدم رکھنے سے روکتا ہے اور اوس کا دائرہ بھی نسبتاً روز بروز وسیع ہوجاتا ہے مگر میرا خیال

تجربہ نے غلط ثابت کر دیا۔ میں دیکھتا ہوں کہ چھاپنے والے سرگرمی سے چھاپ رہے ہیں اور لکھنے والے جوش سے لکھ رہے ہیں اور وہ دن قریب ہے جبکہ دنیا کی سطح سے سینکڑوں کاغذی ہمالیہ اٹھتے نظر آئیں گے اور صرف کتابوں کے نام پڑھنے کے لیے پورا زمانہ عمر درکار ہوگا۔ اِس کے آثار ابھی سے نظر آتے ہیں۔ چونکہ آجکل بھی اکثر لوگوں کو کمی وقت اور کثرت کتب کے باعث صرف مطالعہ ریویو پر قناعت کرنی پڑتی ہے اور چند صدیوں بعد تو فاضل متبحر وہ شخص کہلائیگا جس کا دوسرا نام زندہ فہرست کتب ہوگا

کتاب نے کہا "حضرت تمہارا قطع کلام ہوتا ہے جس کی میں معافی چاہتی ہوں اور میں گمان کرتی ہوں کہ تم کو فقط نثر سے شوق ہے تمہیں اُس شخص کا بھی کچھ حال معلوم ہے جس نے میرے آوازہ شہرت کے دبتے ہی زمین پر شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ اور عام طور پر اُسکی شہرت چند روزہ سمجھی جاتی تھی اور فضلا اس سے نفرت کرتے تھے۔ چونکہ وہ ایک نادار اور نیم تعلیم یافتہ شخص تھا۔ نہ وہ لاطینی جانتا تھا۔ اور نہ یونانی سمجھ سکتا تھا اور ایک زمانہ میں اُس کو ہرن چرا لینے کا چسکا تھا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو غالباً اُس کا نام شکسپیر تھا۔ شاید اب تک تو وہ گمنام ہو چکا ہوگا۔

میں نے جلدی سے جواب دیا "نہیں نہیں۔ بالکل اس کے برعکس۔ بلکہ محض اُس کے طفیل میں اُس کے زمانہ کے علم ادب نے غیر معمولی استحکام پایا۔ شکسپیر تو اُن لوگوں میں سے تھا جو صدیوں میں ایک آدھ بار خاص دماغ لے کر دنیا میں آتے ہیں اور علم ادب کی قدرتی بے ثباتی کا کامیابی سے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ فطرت انسانی کو وہ اپنے خیالات کا مرکز بناتے ہیں۔ وہ اُن عظیم الشان درختوں کے مانند ہوتے ہیں جو ہم کو کبھی کبھی

دریا کے کنارے پر دکھائی دیتے ہیں اور جو اپنی موٹی موٹی جڑیں زمین کے اندر گزوں گہری پہونچا دیتے ہیں اردگرد و پیش کی مٹی بلکہ چھوٹے چھوٹے پودوں اور ردّی گھاس کو سیلاب دریا سے بچا لیتے ہیں - یہی حال شکسپیر کا ہے - وہ زمانہ کی دست برد سے سینہ سپر ہوا - اوس نے اپنے زمانے کے محاورات اور زبان کو قایم رکھا اور متعدد ادنیٰ رتبے کے مصنفوں کو صرف اسوجہ سے کہ وہ اُس کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے نسیاً منسیاً ہونے سے بچایا - مگر ہاں اب اوس کا بھی خدا حافظ ہے - چونکہ بے شمار حواشی اور بے تعداد معانی اُس کی تصانیف پر اُس بیل کی طرح جو کسی درخت پر لپٹ کر اُس درخت کو نظروں سے بالکل پوشیدہ کر دیتی ہے چھا گئے ہیں "

یہ سنکر اُس کتاب نے بڑے زور سے قہقہہ مارا - اور کہا تو کیا تم مجھے یہ یقین دلانا چاہتے ہو کہ کسی زمانہ کا ادب ایک آوارہ - ہرن جو جاہل تک بند کے ہاتھوں سے پائدار ہو سکتا ہے " اور پھر ہنسنے لگی -

مجھ کو اُس کا قہقہہ کسی قدر ناگوار گذرا مگر میں نے اُس کی اِس حرکت کو نادانی پر محمول کیا اور جواب دیا " بے شک ایک شاعر کو اپنے اشعار کی بدولت بقائے نام کا بہت عمدہ موقع ہے - شارد ماغ سے لکھتے ہیں اور ایک شاعر دل سے لکھتا ہے اور اپنے مفہوم کو دل ہی میں اوتارتا ہے وہ نظر فریب نیچر کا ایک وفادار نقاش ہوتا ہے - اُس کا کلام مؤثر اور شگفتہ ہوتا ہے - وہ پاکیزہ جذبات کو زبان کا پاکیزہ لباس پہناتا ہے وہ انسانی زندگی کی مختلف شکلوں کو جو اُس کی نظر کے روبرو گذرتی ہیں مختلف تصویروں میں پیش کرتا ہے - اُس کا کلام اُس کے زمانے کی

تہذیب وشائستگی کی صحیح تاریخ ہوتا ہے اور زبان کے قیمتی موتیوں کو چن چن کر محفوظ کر لیتا ہے۔"

میں موجودہ شعرا کی توصیف میں کچھ اور کہنے والا تھا کہ دفعتہً لائبریری کا دروازہ کھلا۔ میں نے مڑکر دیکھا تو لائبریرین نے کہا کہ لائبریری بند کرنے کا وقت ہوگیا ہے۔ میں اوٹھ کھڑا ہوا۔ اور میں نے اُس کتاب سے باقاعدہ رخصت چاہی مگر وہ کچھ نہ بولی اور میں وہاں سے چلدیا۔

سید سجاد (دہلوی)

ہماری فریاد

یا ہمی تذکرۂ دردِ نہاں کرتے ہیں — آپ پر حالِ زبوں اپنا عیاں کرتے ہیں
آج دل تھام کے حسرت سے فغاں کرتے ہیں — صرف سُن لیجئے شاہا جو بیاں کرتے ہیں

عرضِ حالت نہ سہی، بخت کا شکوہ ہی سہی
شکوۂ حق نہ سہی، شکوۂ بیجا ہی سہی

دیکھئے اپنی اس امت کو، جو تھی خیرِ امم — آج ہر بات میں ہر قوم سے وہ ہو گئی کم
اب نہ دل ہے نہ شجاعت نہ خلوص باہم — نہ وہ پہلا سا جلال اور نہ وہ پہلا سا حشم

نہ بزرگوں کو ہے خوردوں کے مناصب کا لحاظ
اور نہ خوردوں کو بزرگوں کے مراتب کا لحاظ

طالبِ سیم و زر و درہم و دینار ہے یہ — طمعِ مال کے پھندے میں گرفتار ہے یہ
دین کو بیچ کے دنیا کی خریدار ہے یہ — نفعِ دو روزہ کے لالچ میں زیاں کار ہے یہ

الغرض گرم ہے بازار گنہ گاری کا
اس کے دل پر ہے جما سکہ سیہ کاری کا

فرقے اتنے ہوئے پیدا کہ عیاذاً باللہ — نفرت ان سے ہے انہیں، ان سے انہیں استکراہ
ٹیڑھے رستوں کی یہ کثرت ہے کہ اِنَّا لِلّٰہ — رہروؤں کو کہیں ملتی نہیں اب سیدھی راہ

بھیس میں راہنماؤں کے ہیں رہزن لاکھوں
پُرہنر ایک نہیں، اور ہیں پُرفن لاکھوں

فلسفہ عینِ تدیّن ہے، تدین الحاد — علما ہو گئے تحریفِ کلم میں استاد
صفرِ ناسخ پہ بنائے گئے، منسوخ پہ صاد — متواتر ہوئے موضوع، تو مشہور آحاد

آیتیں جتنی تھیں محکم متشابہ ٹھیریں -
نہ مأوّل تو مأوّل کے مشابہ ٹھیریں

جو مقلد ہیں وہ تقلید سے ہیں کوسوں دور — اپنی تقلید پہ ہیں غیر مقلد مجبور
بھائی شیعوں کو تبرّے نے کیا ہے مخمور — شرک و بدعت میں ہیں ارباب تصوف محصور

ہیں تنے چند، جو محفوظ ہیں ان باتوں سے
ورنہ لاکھوں میں ہیں جو محظوظ ہیں ان باتوں سے

خدمت مجتہدین کے ہیں نہ قدر شناس — نہیں رکھتے ہیں نہ کچھ محنت اسلاف کا پاس
اب نہ قرآن و احادیث، نہ اجماع و قیاس — رکن اسلام بس اک عقل ہے صرف نے پاس

پھر سے فہم صحابہ تو نہ حجت ٹھیرے
ہاں مگر ان کے سمجھنے کو فضیلت ٹھیرے

یہ عجب طرح کی پھیلی ہے ہوا دنیا میں — ہیں جو کچھ مدعی صدق و صفا دنیا میں
ان کے نزدیک ہے جو غیر خدا دنیا میں — وہ خدا ہے کہ ہوا جلوہ نما دنیا میں

یہ بداندیش ہیں ممکن کو ہی واجب کہتے
شرم آتی نہیں موہوب کو واہب کہتے

پہلے دوزخ سے ڈراتے تھے سبھوں کو علما — دوزخی کہنے لگے اب علما کو جہلا
کیوں شریفوں نے نہ آوازے کسیں اب کمتا — کہ کمینے ہیں کمینوں سے زیادہ شرفا

گرم بازاری حرص و طمع و زور ہے اب
منزل زہد و ورع ان سے بہت دور ہے اب

کہیں قرآن سے ثابت ہوئی ہے حرمت سود[1] — ہے کہیں حلت مَے ناصرف بمقدار سرور

[1] اکثر لوگ تعدی امراض کے شک پر جھوٹے کے استعمال کو مہلک یا مضر سمجھتے ہیں - اور لا تلقوا بایدیکم الی التہلکہ کی رو سے اسکو حرام کہتے ہیں - فنعوذ باللہ من شرور انفسنا

نظم قرآں میں دکھاتا ہے کوئی نقص وقصور کوئی اقوالِ پیمبر میں بتاتا ہے فتور

کوئی کہتا ہے کہ منسوخ ہیں آیاتِ نماز

سودخواری کا نکالا گیا قرآں سے جواز

ہے خدا کی نہ پیمبر کی محبت دل میں جوشِ مذہب ہے نہ اسلام کی جرأت دل میں

نہ حدیثِ نبوی کی ہے وقعت دل میں نہ وہ قرآن کے احکام کی عظمت دل میں

حکم ناواجبِ تعمیل ہیں اب صوم وصلوٰۃ

امر ناقابلِ تسلیم ہیں اب حج وزکوٰۃ

چند لیڈر جو ہیں اس قوم کے جن پر ہے یقین کہ یہ ہیں مذہب وملت کی ترقی کی مشین

واقفیت انہیں اتنی بھی نہیں بالتعیین کیا ہے ایمان کی تعریف کسے کہتے ہیں دین

کس طرح منزلِ مقصد کو وہ رہرو پہونچے

رہنما جس کا ہو گمراہ زیادہ اوس سے

ہم نے مانا کوئی جج کوئی کلکٹر ہو جائے یا کوئی محکمۂ فوج کا افسر ہو جائے

یا ترقی میں کوئی اس سے بھی بڑھ کر ہو جائے وقت کا اپنے یہاں تک کہ سکندر ہو جائے

یوں ترقی ہوئی شخصی تو بھلا عام کو کیا

نفعِ دنیا سے غرض مذہبِ اسلام کو کیا

ہے یہ لازم جو ہو دنیا کی ترقی کا خیال پہلے عقبےٰ کی ترقی میں کریں استکمال

ورنہ ہو جائیگی معکوس ترقی کی مثال کچھ نہ ہاتھ آئیگا آخر کو بجز رنج وملال

کیوں سمجھتے نہیں اتنا ہے اگر عقل وقوف

کہ ہے مومن کے لیے دین پہ دنیا موقوف

الغرض راہنما جتنے ہیں سب نام کے ہیں نہ کسی نفع کے ہیں اور نہ کسی کام کے ہیں

قوم کے ہیں تو بھی خواہ نہ اسلام کے ہیں چاہنے والے فقط اپنے ہی آرام کے ہیں

خادم اپنے کو بناتے ہیں کہ مخدوم نہیں
ایسے موجود سے بہتر ہی کہ معدوم نہیں

یا نبی! ہو چکی کمزوری اخلاق بیاں   مذہبی رنگ جو تہا وہ بہی ہو صاف عیاں
آپ سے حالتِ ملکی بھی نہیں گرچہ نہاں   کھولتے ہیں مگر اس میں بہی ہم اپنی زباں
مطلب اس عرض سے کہ یاد دلا لی گویا
سامنے اپنے بپتی سنئے کہانی گویا

ہائے وہ قوم! کہ جرأت میں تھا شہرہ جس کا   جمگیا تھا دلِ اغیار پہ سکہ جس کا
ساری اقوام تھی مانے ہوئے لوہا جس کا   کانپ جاتے تہے جگر، رعب تہا ایسا جس کا
بادشاہوں سے لیا کرتی تہی جو باج، افسوس!
سو ذلیلوں میں وہ ہے ایک ذلیل آج افسوس!

گھٹ گئی سلطنتِ ملکِ عجم کی بنیاد   ہوگئی قرطبہ و مصر کی شوکت برباد
اپنے قبضے میں ہیں دریا، نہ بیابان، بلاد   خانہ ویران ہیں وہ جن سے ہوئی دنیا آباد
سلطنت اب نہیں دنیا میں مسلمانوں کی
روم و ایران کی بہی اب خیر نہیں جانوں کی

پھیلی ہے آجکل ایران میں وہ بدنظمی   کہ یہاں ہند میں سن سن کے ہمیں بےچینی
سلطنت چین سے ہے، اور نہ رعایا کو خوشی   الغرض کچھہ نظر آتی نہیں حالت اچھی
سب کو ہے فکر کہ ایران دبالیں کیوں کر
اب مسلمانوں کو یاں سے بہی نکالیں کیوں کر

ہائے وہ روم جو ہے مرکزِ اسلام اب تک   مذہبی جوش کا باقی ہے جہاں نام اب تک
جس جگہہ باتوں میں کھنچ جاتی ہے صمصام اب تک   مارنا مرنا ہی لوگوں کا جہاں کام اب تک
وہ بھی آنکھوں میں کھٹکتا ہے جفا کاروں کی

ہے چڑھا دیں گے نظروں پہ ستمگاروں کی

آج اٹلی نے دبایا ہے جو اک ملک اُس کا دوسرے ملک پہ کل کوئی کریگا دھاوا۔
کان شیطان کے بہرے، جو یہی طور رہا نام پھر سطوتِ اسلام کا مٹ جائیگا

دینِ اسلام کی شوکت نہ رہے گی باقی
یا نبیؐ آپ کی اُمت نہ رہے گی باقی

آخر اب ہم یونہیں تڑپا کریں کبتک اُٹھیے آفتیں روز کی جھیلا کریں کبتک، اُٹھیے
یا نبیؐ! صدمے اٹھایا کریں کبتک اُٹھیے حشر کی راہ ہی تکھا کریں کبتک، اُٹھیے

ہوچکا خواب گراں آئیے اب بس اُٹھیے
اُٹھیے اے ہمنفسِ اُمتِ بیکس اُٹھیے

رکھیے اب دوشِ مبارک پہ وہ پُرنور عبا باندھیے سر پہ عمامہ، کہ ہوں مشتاق بندا
نازنیں ہاتھوں سے کیجیئے گرہ بندِ قبا لیجیے دستِ مبارک میں تنور سا عصا

آیئے روضے سے باہر ہیں بہت یاں مشتاق
ایک مدت سے مدینے کی ہیں گلیاں مشتاق (تمنا)

تصویر جلوس شاہی

جو آج کے پرچہ میں زینتِ ورقِ اول ہے اُسوقت کا ایک نظارہ ہے جب جلوس شاہی قلعہ معلّٰی سے نکلکر جامع مسجد کیطرف آرہا ہے۔

شہنشاہ معظم کی تشریف آوری سے دلی کو جو رونق نصیب ہوئی اُس کا مختصر سا خاکہ یہ تصویر ہے جس سے ناظرین تمدن کو معلوم ہوگا کہ یہ جلوس کس شان اور کروفر سے روانہ ہوا۔ اُمید ہے کہ یہ تصویر نہایت دلچسپی سے دیکھی جائے گی۔

مسئلہ ازدواج و طلاق

ایک دھریہ کی نظر میں

(۱) کیا تم کسی حالت میں طلاق کے اصول کو جائز و مناسب قرار دیتے ہو؟

بالعموم مردے دنیا پر راج کر رہے ہیں۔ اور زندہ لوگ مردہ لوگوں کے زیر ظلم ہیں۔ پرانے خیالات جو اپنی اپنی ضروریات کے وقت پیدا ہو کر معدوم ہو چکے ہیں۔ ابھی تک دلوں میں جاگزیں ہیں۔ بہت سے لوگ طبعاً قدامت پرستی کی طرف مائل ہیں اور پرانی ڈگر پر چلنا چاہتے ہیں۔ بغیر دریافت کئے کہ وہ راستہ انہیں کدھر لے جائیگا۔ اور بغیر جانے کہ وہ خود کس طرف جانا چاہتے ہیں +

طلاق کے متعلق خیالات ہمیں قرن اولین کے عیسائیوں سے ورثہ میں ملے ہیں اور ہم تک مذہبی رنگ میں پہنچائے گئے ہیں۔ ابتدائی زمانے کے عیسائیوں کا خیال تھا۔ کہ دنیا یا تو اب نیست و نابود ہونے والی ہے۔ یا بذریعہ آگ صاف دپوتر کی جائے گی۔ تمام شریر النفس غارت ہونے والے ہیں۔ اور نیک لوگ ہوا میں بلند ہو کر اپنے خداوند سے جا ملیں گے۔ تاکہ وہ وہاں اس وقت تک قیام پذیر رہیں۔ جب تک کہ زمین مبارک لوگوں کے رہنے کے قابل نہ ہو جائے اس خیال اور یقین کی موجودگی میں دنیا کی کوئی چیز مقابلتاً کچھ اہمیت نہ رکھتی تھی ایسا شخص جو اناج جمع کرنے کے لیے بڑے بڑے ذخیرہ خانے بنواتا۔ ایک بیوقوف زمیندار سمجھا جاتا تھا۔ جو اناج کی دھن میں اپنی روح کی قدر و قیمت کو نہیں پہچانتا۔ وہ خوش حال اور ملتے پنیے لوگوں کو دولت کے قدا کی

اولاد سمجھتے تھے۔ اور بد قسمت مصیبت زدہ اور بیمار لوگوں کو خدا سے برحق کے پسندیدہ بندے وہ تمام دنیا کے کاروبار کو حقارت کی آنکھ سے دیکھتے اور سوائے زکوٰۃ دینے کے اور سب کاموں کو بند کرنے کی کوشش کرتے۔ شادی کرنے کا کوئی وقت نہ تھا۔ اور اسیطرح اپنے گھر بار بنانے کا بھی کوئی وقت نہیں تہا۔ ان کے تمام خیالات سلے دے کے آسمان کیطرف لگے ہوئے رہتے تہے جس کے وہ وراثت میں پانے کی امید موہوم لگا رہے تہے۔ تجارت۔ محبت۔ اور تمام دنیاوی چیزیں فضول سمجھی جاتی تہیں +

نئے عہدنامہ میں حواریوں کے گہر بار کی نسبت کچھ مرقوم نہیں ہے اور اسی طرح ان کی گہر بار کی زندگی۔ گہر کی خیر و برکت تعلیم و تعلّم کی ضرورت اور دماغ کی نشو و نما اور ترقی کی نسبت بہی کچھ ذکر نہیں ہے۔ یہ چیزیں دل و دماغ سے صرف اس بنا پر بھلا دی گئی تہیں کہ پیش آنے والے واقعہ کے سامنے اِن کی کچھ ضرورت نہیں سمجھی گئی تہی۔ سوائے اسکے کہ لوگ مسیح کے آنے پر تیار رہیں۔ اسی خیال کی بنیاد پر خود مسیح ان لوگوں کو انعام دیتے تھے۔ جو اپنے بیوی بچوں کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہکر چھوڑ دیتے تہے انسانی محبت نفرت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تہی مردوں کو اپنے مردے گاڑنے دے۔ تو میرے پیچھے آ۔ مجھے اس سے کیا مطلب[1]۔ لوگ نہ صرف اِن باتوں پر یقین رکھتے تہے بلکہ ان پر

[1] مقدس متی کے آٹھویں باب ۱۸ ویں آیت سے لیکر ۲۲ ویں آیت کی طرف اشارہ ہے:۔
جب یسوع نے بہت سی بھیڑ اپنے آس پاس دیکھی اس نے حکم کیا کہ پار جاویں اور ایک فقیہ نے آکے اس سے کہا۔ اے استاد۔ جہاں کہیں تو جائے میں تیرے پیچھے چلوں گا۔ اور یسوع نے

عامل بھی تھے۔ جن کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ زندگی کے تمام تعلقات کی مخالفت کی گئی اور ان کو توڑ دیا گیا۔ اور ان کی پابندی ضروری نہ سمجھی گئی۔ شادی کی مخالفت کی جاتی تھی۔ اور اس کی نسبت یہ خیال تھا کہ نکاح ظاہرا اور بے لگام گناہ سے ایک درجہ بڑھکر ہے۔ اور اس کا جواز انسانی کمزوری پر دال ہے۔ نکاح نہ کرنا زیادہ اچھا سمجھا جاتا تھا۔ عورت سے محبت کرنے کی نسبت خدا سے محبت کی لو لگانا زیادہ اعلیٰ اور ارفع تصوّر کیا جاتا تھا۔ انتہا درجے کے اللہ والے اور عابد تجرّد کی زندگی کو روا رکھتے تھے اور عورت کو بنظر حقارت دیکھتے تھے۔ لیکن ان تمام باہمی اختلافات اور متضاد باتوں کے ہوتے ہوئے جو پادریوں میں امتیازی حیثیت سے پائی جاتی ہیں۔ نکاح ایک طرح کی قسم خیال کیا جاتا تھا۔ قاضی (یعنی پادری) شادی کرنے والوں سے کہتا تھا کہ "یاد رکھو۔ تم عمر بھر کے لیے گرفتار رکئے گئے ہو۔ یہ دروازہ صرف ایک دفعہ کھلتا ہے[۲] نکاح کی زندگی کو پیشتر تمام راستے ایک ہی منزل مقصود کا پتہ دیتے ہیں" اور یہ گویا نکاح کرنے کی ایک سزا تھی پادری محسوس کرتا تھا کہ نکاح کا عہد اگر خدا تعالیٰ کے احکام کے خلاف نہیں ہے۔ تو کم سے کم اس کی نصیحت کے خلاف ہے جس کی پاداش میں ازروئے انصاف شادی کرنے والے کو کسی نہ کسی طرح

بقیہ [۱] نوٹ صفحہ ۲۱) اس سے کہا کہ لومڑیوں کے لیے ماندیں اور ہوا کے پرندوں کے واسطے بسیرے ہیں۔ پر ابن آدم (مسیح) کے لیے جگہ نہیں جہاں اپنا سر دھرے۔ اس کے شاگردوں میں سے دوسرے نے اس سے کہا۔ اے خداوند مجھے رخصت دے کہ پہلے جا کر اپنے باپ کو گاڑوں یسوع نے اس سے کہا۔ کہ تو میرے پیچھے آ۔ اور مردوں کو اپنے مردے گاڑنے دے۔" مترجم

[۲] مطلب یہ ہے۔ نکاح کرنے کے بعد کسی حالت میں دوبارہ نکاح نہیں کرسکتا۔ مترجم۔

سزا ملنی چاہیئے اس دھمکی پر اس کا بھی اضافہ کیا جاتا تھا اور اچھی طرح سے کان کھول کر جتا دیا جاتا تھا کہ طلاق کسی حالت میں ممکن نہیں۔ اور اس غلطی کی اصلاح ناممکن ہے۔ ہر شادی و بیاہ کے موقعہ پر یہ پادری اپنی خشک انگلی کو دولہا اور دلہن کی طرف بڑھاتا تھا۔

تقریباً تمام عقلمند اصحاب نے اب اس خیال کی پیروی چھوڑ دی ہے کہ دنیا کا جہاز اب ساحل اختتام پر آن لگا ہے۔ اور عنقریب اس کا خاتمہ ہو جائیگا۔ وہ اس کا بھی یقین نہیں کرتے۔ کہ خوشحالی بدی کی کوئی خاص علامت ہے یا مفلسی اور ناداری نیکی کے مسلّم سرٹیفکیٹ ہیں انہیں اب اس بات کا بھی یقین نہیں آتا۔ کہ ڈائیوز[1] کو محض اس کے مالدار ہونے کی وجہ سے دوزخ میں

[1] مقدس لوقا کی انجیل میں ایک دولتمند اور مفلس کے قصہ کیطرف اشارہ ہے اور وہ یہ ہے :-
ایک دولتمند تھا (جس کا نام ڈائیوز تھا) جو لال اور مہین کپڑے پہنتا۔ اور روز روز شان و شوکت سے عیش کرتا تھا۔ اور لاذر نامی ایک غریب آدمی جو ناسوروں سے زخمی تھا لوگ اسکی ڈیوڑھی پر ڈال جاتے تھے اور وہ آرزو رکھتا تھا۔ کہ ان ٹکڑوں سے جو دولتمند کی میز سے گرتے تھے۔ اپنا پیٹ بھرے بلکہ کتّے آکے اس کے گھاؤ چاٹتے تھے۔ اور ایسا ہوا کہ وہ غریب مر گیا۔ اور فرشتوں نے اسے لیجا کے ابراہیم (علیہ السلام) کی گود میں رکھا۔ اور دولتمند بھی موا اور گاڑا گیا۔ اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہوکے اپنی آنکھیں اٹھائیں۔ اور ابراہیم کو دور سے دیکھا۔ اور اسکی گود میں لاذر کو اور اس نے پکار کے کہا کہ اے باپ ابراہیم! مجھپر رحم کر اور لاذر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے بھگو کے میری زبان ٹھنڈی کرے کیونکہ میں اس لو میں تڑپتا ہوں۔ تب ابراہیم نے کہا کہ اے بیٹے۔ یاد کر کہ تو اپنی زندگی میں اچھی چیزیں لے چکا اور لاذر بری چیزیں۔ سو اب وہ تسلّی پاتا ہے اور تو تڑپتا ہے۔ اور ان سب کے سوا ہمارے تمہارے درمیان ایک بڑا گڑھا دھرا گیا ہے ایسا کہ وہ جو یہاں سے تمہارے پاس جایا چاہیں۔ نہ جا سکیں۔ اور نہ وہ لوگ، جو وہاں ہیں اس پار

ڈالا ہوگا۔ اور یا یہ کہ لعزر غریب ہونے کے سبب ہمیشہ کی خوشی یعنی بہشت کا مستحق ہوا۔ اب ہم جانتے ہیں کہ خوشحال نیک ہو سکتے ہیں۔ اور بدقسمت بد۔ اب ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ شرائطِ خوشحالی کی عدم پابندی یقینی طور پر بدقسمتی اور مصیبت کا راستہ دکھاتی ہے۔

ایک زمانہ تہا جب کہ لوگوں کا خیال تہا کہ شخص واحد کا گناہ تمام فرقے۔ برادری یا قوم پر غرض جس کسی کا اِس سے کچہ بہی تعلق ہے۔ پڑتا ہے۔ یہ بات بہی درجۂ یقین کو پہنچگئی تھی۔ کہ اگر کسی مرد یا عورت نے خدا سے کچہ نذر نیاز مان رکھی ہے۔ اور کسی طرح وہ اپنے عہد کے پورا کرنے میں قاصر رہی ہے۔ تو خدا تعالیٰ اس کے بدلے میں تمام قوم و فرقہ کو سزا دے گا اِس خیال کو بہی اب کوئی نہیں مانتا۔ جوں جوں ہم ترقی کر رہے ہیں۔ دوں دوں ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر شخص واحد کے حقوق کیا ہیں۔ اور یہ بھی ہمیں کسی حد تک معلوم ہوگیا ہے۔ کہ شخصی حقوق سے بڑھکر اور کسی کے حقوق نہیں ہیں ایک زمانہ تھا جبکہ عوام کا یہ خیال تہا کہ سزا درست کرنے والی زبردست طاقت ہے۔ گویا بالفاظ دیگر لوگ حیوانی جبر کے فیض اور اثر کے قائل تہے۔ لیکن دنیا اب بدل رہی ہے۔ ایک وقت میں لوگ اِس

بقیہ نوٹ صفحہ ۲۳) اِس پار ہمارے پاس آسکتے ہیں۔ تب اُس نے کہا پس اے باپ! تیری منت کرتا ہوں کہ تو اسے میرے باپ کے گہر بہیج۔ کیونکہ میرے پانچ بہائی ہیں تاکہ انپر گواہی دے ایسا نہو کہ وہ بہی اس عذاب کی جگہ میں آویں۔ ابراہیم نے اسے کہا۔ کہ ان کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) اور انبیا ہیں۔ چاہیئے۔ کہ وہ ان کی سنیں۔ اسنے کہا کہ نہیں۔ اے باپ ابراہیم! پر اگر کوئی مُردوں میں سے اِن کے پاس جائے۔ وہ توبہ کریں گے۔ اسنے اسے کہا۔ کہ جب وے موسیٰ اور نبیوں کی نہ سنتے ہیں تو اگر مُردوں میں سے کوئی اٹہے تو اسکی نہ مانیں گے۔" ۱۲ منہ (از ترجمہ انجیل) مترجم

امر کے بھی قائل رہے ہیں۔ کہ کیتھولک مکتب[51] درحقیقت سوسائٹی کا منجی ہے اور یہ کہ ایک فلاسفر کا قتل سلطنت کے انتظام کے لیے ازبس ضروری ہے[52] اور خواہ کچھ ہی ہو سلطنت کی حفاظت کرنی چاہیئے لیکن اب ہم زیادہ روشنی میں آ گئے ہیں۔ اور اس روشن نقطہ پر جسکو زمانۂ حال کہتے ہیں۔ کھڑے ہوکر مجھے تمھارے سوالات کا جواب دینا چاہیئے۔

نکاح ایک نہایت ہی ضروری اور نہایت ہی مقدس عہد ہے جسکو بنی نوع انسان انجام دے سکتے ہیں۔ اِس کا کچھ مضائقہ نہیں کہ ہم اسے کس نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ خواہ عہد و پیمان کے نام سے۔ خواہ قسم سے لیکن بہرحال مطلب ایک ہی ہے۔ سچا نکاح دراصل روحوں کے اتحاد اور ملاپ کا نام ہے۔ ایسا اتحاد جس میں جھگڑے کا خیال ہی نہیں آتا۔ یہ ایک ایسا اتحاد ہے جس میں کل چیزیں واحد نظر آتی ہیں۔ تمام امتیاز اٹھ جاتے ہیں۔ اور زمانۂ حال دائمی معلوم ہوتا ہے۔ ان اعلیٰ گھڑیوں میں کل چیزیں روشنی کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ اندھیرا نام کو نہیں دکھائی دیتا۔ اور جب دو وجود اس طرح محبت کریں اور آپس میں مل کر ایک ہو جائیں تو فی الحقیقت دو روحوں کا یہی ایک نکاح ہے۔ جو کچھ مذبح۔ پادری۔ مجسٹریٹ یا دوسرے گواہوں کے سامنے کہا جاتا ہے۔ وہ ایک صرف اس عہد کی جو دل میں کیا جاتا ہے۔ ایک ظاہری گواہی اور نشانی ہے۔ وہ تو صرف اس اتحاد کی تائید کرتا ہے۔ جو ابھی دونوں کے دلوں میں طے ہو چکا ہے۔ یا ایسی

---

[51] کیتھولک مذہب کے مکتب عیسائیوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سزا دیا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ایسے لوگوں کا عدم وجود سوسائٹی کی خوشحالی کے لیے ضروری ہے۔ مترجم۔

[52] مثلاً گیلیلو کو صرف اس بنا پر قتل کر دیا گیا تھا کہ وہ زمین کے سورج کے گرد پھرنے کا قائل ہے۔ مترجم۔

دو صحبوں کی جو شام سے ایک ساتھ ملنے کی متوقع ہیں ہر ایک نے اپنا اپنا آئیڈیل دمافی الضمیر) معلوم کر لیا ہے مرد نے تمام دنیا میں سے ایک ایسی عورت کو منتخب کر لیا ہے۔ جو اس کے نزدیک محبت۔ پاکیزگی۔ جذبات دل لگی خوبصورتی اور ناز و انداز کی مجسم تصویر ہے اور عورت نے بجائے خود ساری دنیا میں سے ایک ایسے مرد کو پسند کیا ہے۔ جو اس کے نزدیک اس کا آئیڈیل ہے۔ اور جو کچھ بھی وہ دلیری۔ بہادری۔ اور ایمانداری کی نسبت جانتی ہے سب کچھ اپنے خاوند کے وجود میں دیکھتی ہے۔ عہد و پیمان کا خیال جاتا رہتا ہے۔ فرائض اور حقوق فی الفور محبت اور خوشی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور دو زندگیاں دو دریاؤں کی طرح ایک ہو کر بہنے لگتی ہیں۔ اس نکاح اور ان کے باہمی فرائض کے مقدس ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔ اور رسوم میں تو سوائے اس کے کہ مرد اور عورت دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی چاہ ہو۔ اور تمام دنیا یہ جان لے کہ وہ فی الحقیقت بیاہے گئے ہیں۔ اور ان کی روحیں آپس میں مل گئیں اور کچھ نہیں ہوتا۔

نکاح کے کھلم کھلا اور علانیہ طور پر ہونے کی طرفداری میں ہزاروں وجوہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔ سب سے بڑھکر تو یہ کہ لوگوں کو اس خاص کی پاکیزگی معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ رسوم نہ صرف دولہا دولہن کی حفاظت اور بھلائی کے لیے ضروری ہیں۔ بلکہ ان کے بچوں کی حفاظت اور سوسائٹی کی عام بہبودی کے لیے بھی ویسی ہی فائدہ بخش ہیں لیکن پھر بھی نکاح ایک ارفع و اعلیٰ درجہ کا عہد و پیمان ہی رہتا ہے۔ ایسا عہد جس میں ہر ایک دل دیتا اور لیتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نکاح کسی حالت میں فسخ بھی ہو سکتا ہے؟ مختلف فرقوں کی طرف سے جو کچھ جوابات دیے گئے ہیں۔ آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں لیکن ان مذہبی رایوں کے اندر عہد و پیمان کا سوال چھپا ہوا ہے اس نکاح کے قول و قرار میں مرد اپنی بیوی کی حفاظت کرنے اور اسکو ہر طرح سے خوش رکھنے کا عہد کرتا ہے۔ فرض کرو کہ وہ اب اسکی حفاظت کرنے سے منکر ہے اور اپنی منکوحہ کو گالیاں دیتا ہے اور پیٹتا ہے۔ اور اس پر ہر قسم کا ظلم روا رکھتا ہے۔ اب اس مظلوم کا کیا تدارک کرنا چاہیئے؟ کیا وہ عورت ان حالتوں کے ہوتے ہوئے اپنے خاوند کی کی پابند ہے؟ خاوند نے عہد شکنی کی ہے۔ وہ اسکی حفاظت کرنے میں ناکامیاب ہوا ہے۔ اور اس کے علاوہ اس نے اس عورت کو جانوروں کی طرح پیٹا ہے۔ پھر کیا وہ عورت اپنے خاوند کی پابند ہے؟ کیا اس عورت پر اپنے خاوند کے عہد و پیمان کا کچھ زور اور اثر ہے؟ اگر ہے تو وہ اثر کس قسم کا ہے؟ کیا اس عورت کو اپنے خاوند کے ساتھ صرف اسکی خاطر رہنا چاہیئے۔ اور اگر وہ عورت اسکو اپنی جان بچانے کے لیئے چھوڑتی ہے۔ تو پھر کیا یہ ضروری ہے کہ عورت اپنے خاوند کی خاطر اسکی بیوی بن کر رہے؟۔ کوئی عقلمند آدمی ان سوالات کا جوابات اثبات میں نہیں دے سکتا +

اب اگر عورت اپنے خاوند کی خاطر اسکی بیوی رہنے کی پابند نہیں ہے تو پھر کیا وہ صرف اس بنا پر کہ نکاح ایک قسم ہے۔ اسکی بیوی رہنے پر مجبور ہے؟ کیا خدا کی طرف سے عورت پر کوئی جبر ہے کہ وہ اس وحشی خاوند کے ساتھ زندگی بسر کرے؟ کیا اس عورت کا طریق زندگی

لامحدود ذات کی خوشی پر کچھ اثر ڈال سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ انسان لامحدود ذات کی خوشی کو گھٹا بڑھا سکے؟

اس معاملہ کے متعلق دوسرا سوال سوسائٹی کی فلاح و آسودگی ہے۔ یہ تو بالضرور مان لیا جائیگا۔ کہ سوسائٹی کی بہبودی ایسے لوگوں کی علحدگی پر ممکن ہے یقیناً سوسائٹی کسی عورت پر جبر نہیں کر سکتی۔ کہ وہ ایسے خاوند کے ساتھ رہے جو ہر وقت اس کو پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہو شادی شدہ عورتیں بھی حفاظت کا حق رکھتی ہیں۔ ذاتی محافظت کا حق کسی عہد پیمان یا قول و قسم سے ضائع نہیں ہو جاتا۔ اس معاملہ میں اگر ان کی نسبت نہایت ہی ادنے درجہ کی رائے بھی قایم کیجائے۔ تو بھی وہ ادنے متحرک جانداروں کے برابر حق رکھتی ہیں*

اس بات کو غالباً بہت سے طلاق کے دشمن بھی تسلیم کرلیں گے لیکن وہ پھر اس امر پر زور دیں گے۔ کہ اگر بیوی کو اپنے خاوند کے مکان سے بھاگ جانے اور اپنے خویش و اقربا کے ہاں پناہ لینے کا حق حاصل ہے تو کم سے کم نکاح جو ایک قسم ہے۔ فسخ نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا ایسا کرنے میں کچھ سوسائٹی کا نفع ہے۔ کہ جو لوگ آپس میں نفرت رکھتے ہوں۔ ایک ساتھ رہیں؟ کیا یہ زیبا ہے کہ دنیا ایسے افراد سے آباد ہو جو نفرت۔ بغض۔ شہوت اور حسد کی ذریات ہوں۔ یا باہمی محبت کی مبارک نسلوں سے؟ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ دانا اور رحیم خدا اس امر پر زور دے کہ ایک بیکس عورت ایک کمبخت کی بیوی بن کر رہے؟ کیا اس فعل سے بہشت کی خوشی میں کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ یا وہ دونو ایک ہو کر رہ سکتے ہیں؟ کیا گورنمنٹ کے لیے اس سے بڑھکر کوئی اور بات معیوب ہو سکتی ہے کہ وہ

عورت کو کسی ایسے شخص کی جس سے اسکو دلی نفرت ہے۔ بیوی بنے رہنے کے لیے مجبور کرے؟ کیا کوئی معقول آدمی اپنی بیوی کو اپنے ہی گہر رکہنے کے لیے کسی کانسٹبل یا شریف جج یا پادری سے مدد کی درخواست کرتا ہے؟ کیا ایسے آدمی سے جو اس معاملہ میں زبردستی روا رکہتا ہو۔ بڑھکر کسی نفرت انگیز انسان کا خیال کرنا ممکن ہے؟ عام طور پر یہ بہی کہا جاتا ہے۔ کہ عورت گہر سے نکل جانے کے معاملہ میں ہر طرح سے آزاد ہے اور یہ کہ عدالتیں عورت کو ایک ایسے شخص کی شرارت اور وحشی پن سے ضرور محفوظ رکھیں گی جس نے کہ اس کے محافظ بننے کا وعدہ کیا تہا لیکن سوال یہ ہے۔ کہ عورت جائے کہاں؟ ممکن ہے کہ اس کے رفقا اور دوست نہ ہوں۔ یا یہ کہ وہ غریب ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے رشتہ داروں میں سے کوئی بہی زندہ نہو۔ تو پہر کیا اسے دوسرا گہر آباد کرنے کا حق حاصل نہیں ہے؟ کیا ضروری ہے کہ یہ صحیح و تندرست عورت جس میں مہربانی اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس زندہ لاش کے ساتہ جکڑ کر باندہ دی جائے؟ کیا اِس کے لیے اب کوئی مستقل نہیں ہے؟ کیا اب ہمیشہ کے لیے اسے مردود اور خارج کر کے اس سے بیوفائی کرنی چاہیئے؟ کیا وہ اب اپنے بچوں کے نازک بازوؤں کو اپنی گردن کے ارد گرد ڈال کر کسی ایسی جگہ ایک ایسے خاوند کے ساتہ جو اس سے محبت کر سکتا ہو۔ اور اِس کی حفاظت کا ذمہ دار ہو نہیں بیٹھ سکتی؟ کیا یہ اچھی بات ہے کہ سوشل امور میں اس عورت کو نہایت ادنےٰ اور حقیر سمجھا جائے۔ اور کیا ایسا سمجھنا بنی نوع انسان کے مفاد کی خاطر ہے یا اس کمبخت کی خاطر جس نے اپنی جان کو تباہ و برباد کر دیا ہے؟

بالعموم یہ دلیل پیش کیجاتی ہے کہ اگر نکاح فسخ کردیا جائے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ عورت اپنا وقار اور عزت غرض سب، کچھ کہو بیٹھے گی۔ کیا اپنا اخلاقی کیرکٹر برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ بچاری آزادی سے ہاتھ اٹھائے؟ کیا یہ اچھی بات ہے کہ اپنی عفت[1] و پاکبازی قائم رکھنے کے لیے ایک حیوان یا سوسائٹی یا بدطینت دیو کی غلام بن کر رہے۔

اگر کوئی لااحد و وجود عہد و پیمان کرنے والے فریقین میں سے کسی ایک کا شریک ہے۔ تو کیا یہ اس کا فرض نہیں ہے کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرے کہ اس عہد و پیمان کی کہاں تک پابندی ہوئی ہے؟ اگر کوئی عورت اپنے خاوند کے حقوق صرف اس بنا پر ادا نہیں کرتی کہ اس کے خاوند نے عہد کے خلاف کیا ہے۔ بلکہ اس کی جان تک لینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ تو کیا یہ ممکن ہے۔ کہ عورت کے دل میں خاوند کی طرف سے محبت کا احساس پیدا ہو؟ اور اگر ان کے دل میں محبت کا احساس پیدا نہیں ہوا ہے۔ تو پھر نکاح کی کیا قدر قیمت ہے اور اس عہد نامہ یا قسم میں سے باقی کیا خاک رہ جاتا ہے؟ عورت اب بیوی کے تعلقات قائم نہیں رکھ سکتی۔ کیونکہ اسکو اپنے خاوند سے نفرت ہے اب وہ اس کے مکان میں بھی رہنے سے قاصر ہے۔ کیونکہ وہ ڈرتی ہے کہ کہیں اس کا خاوند اسے مار نہ ڈالے۔ اس کے بعد اب اگر ان کے درمیان کچھ تعلقات باقی رہ جاتے ہیں۔ تو وہ ایسے ہوتے ہیں جیسے کسی شکاری اور شکار۔ ظالم اور مظلوم کے مابین ہوں کیا یہ امر قابل تعریف ہے کہ ایسا تعلق زندگی بھر قائم رہے۔ اور اس پر مذہبی رسوم کی رنگ آمیزی کرکے اس رشتہ کو اور زیادہ مقدس بنادیا جائے؟

---

[1] خلع بربادی عصمت کا باعث نہیں ہے۔ ایڈیٹر۔

میں یہ پھر پوچھتا ہوں کہ باوجود نفرت ہوتے ہوئے ایسی عیالداری کی زندگی بسر کرنا کچھ نیک بات ہے ؟ کیا ہمیں ایسے بچوں کی کچھ ضرورت ہے جو ایسے کمبخت والدین کی اولاد ہوں - ؟ کیا دوسرے لوگوں کی عفت و پاکبازی صرف اس عیش کی پامالی اور ہمیشہ کی قید سے قائم و برقرار رہ سکتی ہے ؟ -

جس عقد کی بنیاد محبت پر قائم نہیں ہے - بہت خراب ہے - اور جب شادی کی غرض و غایت ذاتی وجاہت اور دولت کا حصول ہو - بہت ادنے ہے لیکن ہم ایسے نکاح کے متعلق کیا کہیں گے جہاں کہ فریقین (دولہا اور دلہن) قطعی طور پر ایک دوسرے سے نفرت رکھتے ہوں ؟ کیا ایسا کرنا نیکی میں داخل ہے یا یہ فعل اخلاق کے کسی محاسن میں شمار کرنے کے قابل ہے ؟ کیا بغیر اصلی اور سچے تعلق کے ہوتے ہوئے محض خاوند - اور بیوی کا نام قائم رکھنے میں کوئی خاص نیکی ہے ؟ کیا کوئی معقول عورت یا کوئی معقول مرد یہ ظاہر کرنے پر رضامند ہوگا کہ ایک سچی محبت کرنے والی عورت ایسے بچوں کی ماں بننے کے لیے مجبور کی جائے جن کے والد کو وہ نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے ؟ کیا صفحہ ہستی پر کوئی ایسی عورت ہے جو دوسری عورت کو ایسا کرنے پر مجبور کرے جس سے وہ خود دور بھاگتی ہو ؟

شادیاں مردوں اور عورتوں سے انجام پذیر ہوتی ہیں - نہ کہ سوسائٹی اور سلطنت سے - اور نہ مذہب یا مافوق الانسان سے اسوقت تک ہمیں یہ بخوبی معلوم ہو چکا ہوگا - کہ جو کام نفس رکھنے والے انسانوں کی بہتری اور فلاح پر مبنی نہیں ہے - ہرگز ہرگز اخلاقی نہیں ہو سکتا - اگر فی الواقع ہمیں ہمیں کچھ علم ہے - تو ہم جانتے ہیں - کہ نیکی کرنے کی طرفداری میں اور گناہ کرنے کے خلاف تمام وجوہ اسی دنیا میں پائے جاتے ہیں - اپنے

آپ کو کسی دوسرے کی حالت میں ڈالنے کے لیے ہم میں قوت متخیلہ کا ہونا بسا ضروری ہے۔ اس لیئے تھوڑی دیر کے لیے مرد اپنے آپ کو ایک ایسی بیکس مظلوم عورت سمجھ لے جو وحشی خاوند کے زیر تشدد ہو۔ پھر کیا وہ طلاق کو ناجائز قرار دیگا۔ اور اسکی تائید کریگا۔؟

بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جنہیں ماؤں اور بچوں کی تکالیف کا پورا احساس ہے یعنی ایسی بیشمار بیویوں کی تکالیف کا جو اپنے خاوند کے آتے ہوئے قدموں کی چرچراہٹ سنتے ہی خوف زدہ ہو کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اور ایسے بہت سے بچوں کی مصیبتوں کا جو اپنے والد کی آواز سنتے ہی چھپ جاتے ہیں۔ بہت ہی تھوڑے لوگ ان تماچوں کی تعداد کو جانتے ہیں۔ جو ہر روز اس بیکس کے منہ پر پڑتے ہیں۔ اور غالباً صرف گنتی کے لوگ ان خوفناک آلول کا علم رکھتے ہوں گے جنکو غریب مائیں اپنے بچوں کو چھاتی سے لگا کر بسر کرتی ہیں۔ ان تکالیف کے مقابلہ میں فلاکت و ناداری کی تمام سختیاں جن کو باہمی محبت کرنے والے دولہا دولہن جھیلتے ہیں۔ ہیچ ہیں۔ ایسے مرد اور عورت جو آپس میں نہایت سچے دل سے بیاہے گئے ہیں۔ مفلس اور ناداری کی آفتوں کی مشقتوں کو باہم مل کر برداشت کر لیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو تسلی اور تشفی دیتے رہتے ہیں۔ شب دیجور میں بھی وہ ستارہ کی روشنی کو دیکھتے ہیں اور ان کی محبت ہر ایک کے دل میں ہمیشہ ہمیشہ سورج کی کرنیں ڈالتی رہتی ہے۔

اچھا گھر اچھے انتظام اور عمدہ سلیقہ کی گواہی دیتا ہے۔ ایسے گھر کے چولہے کی ہر ایک اینٹ تہذیب و تمدن کی کامل نشانی ہے۔ سوسائٹی نفرت کرنے والے گھروں کے وجود سے خوش نہیں ہوتی بلکہ ایسے

گھروں کے وجود سے جہاں کے خاوند اور بیویاں خودغرض رہیں اور بیرحم ہوں۔ سوسائٹی کا اس میں کچھ نفع نہیں ہے۔ کہ اچھے آدمی غلام ہو کر رہیں اور ہمیشہ پُرخطر زندگی بسر کریں۔ یا یہ کہ وہ ایسے خاوندوں کے ذریعہ مائیں بنیں جن کو وہ نفرت سے دیکھتی ہیں۔ گھر ہمیشہ نیک اور فیاض والدوں اور سچی محبت کرنے والی ماؤں سے بھرے جانے چاہییں۔ اور جب کہ وہ اس طرح سے بھرے جائیں گے۔ دنیا شائستہ اور متمدن ہو جائے گی فراست پنگوڑوں کو جھلائے گی۔ انصاف عدالتوں میں نظر آئے گا۔ عقل قانون کے کمروں میں براجے گی۔ اور سب سے بڑھکر جو بات ہے وہ یہ ہے کہ آسمان کے گنبد کی طرح آزادی کی روح ہر چیز پر حکومت کرتی ہوئی دکھائی دے گی۔

اگرچہ نکاح ایک نہایت ضروری چیز اور نہایت ہی مقدس عہد و پیمان ہے۔ جسکو بنی نوع انسان انجام دے سکتے ہیں۔ تاہم عہد و پیمان کے ٹوٹنے پر عدالتوں کو اختیار دینا چاہیئے کہ وہ اس کے فسخ کا فتوے عادلانہ طریقوں پر دے سکیں۔

جیسا کہ قاعدہ ہے عورت خاوند کے سامنے اپنے کل مال و متاع یعنے اپنی جوانی۔ اپنی خوبصورتی اور اپنی محبت کا جہیز پیش کرتی ہے۔ اور یقیناً اس عہد سے اسوقت تک خاوند کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ خود بیوی ہی قول و قرار کی شرائط کو نہ توڑے طلاق بھی علانیہ دینی چاہیئے۔ اور اس کے انجام دینے کے لیے گواہوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ تاکہ لوگ عہد و پیمان کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ شادیوں کا داخل دفتر ہونا بھی ظاہر طور سے

ہونا چاہیے۔ اور طلاق کے معاملے میں بھی اس قسم کے اصولوں کی پابندی ضروری ہے۔ شرائط پیش ہونی چاہئیں مال کو چند بڑے بڑے آدمیوں کی مدد سے آپس میں انصاف تقسیم کر دینا چاہیے۔ اور بچوں کی حفاظت اور ان کے رکھ رکھاؤ کا سوال بھی زیر شرائط ضروری ہے۔

مرد اور عورتیں کسی قانونی بندش سے نیک نہیں ہیں۔ قانون بذات خود نیکی کا احساس پیدا نہیں کرتا۔ اور نہ وہ محبت کا سرچشمہ اور بنیاد ہے لیکن قانون کے لیے نیکی اور عصمت کی حفاظت کرنی ضروری ہے۔ اگر عورت نے خلاف عہد کوئی بات نہیں کی۔ تو قانون کے لیے نہایت ضروری ہے کہ عورت کو اپنی پناہ میں لے کر اس کی حفاظت کرے۔ اسی طرح مرد کی حفاظت کرے۔ اگر اس نے عہد کی شرائط کو پورا پورا نبھایا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ محبت کا عدم وجود۔ نکاح کا اخیر ہے محبت ایک قدرتی امر ہے۔ ان تمام رسوم کے در پردہ محبت کی مبارک شمع جلتی رہتی ہے۔ اور ہمیشہ جلتی رہے گی۔ دنیا کی تاریخ میں ایسا کوئی سا موقع نہیں ہوا۔ کہ یہ مقدس شمع بجھ گئی ہو۔ ہر زمانے میں ہر ملک میں اور ہر قوم میں سچی خالص اور بے غرض محبت ہوتی چلی آئی ہے۔ پادری کے وجود اور نکاح کے ساتھ ان رسوم کے اجرا سے بہت عرصہ پیشتر دنیا میں سچی اور خالص شادیاں ہوتی تھیں عام رائے کے در پردہ قدرتی حیا اور دل کی محبت ہے۔ اور قانون کے ہوتے ہوئے مرضی کی سلطنت ہے۔ جو ہمیشہ ہمیشہ رہے گی۔ جہاں کہیں محبت ہے وہ خالص ہے۔ اور ہر وقت اور ہر جگہ شادی کی رسوم اس اتحاد کی تائید کرتی ہیں۔ جو انسان کے دل کے مقدس مندر میں انجام پذیر ہوا ہے۔

(۲)

(ب) کیا طلاق شدہ لوگوں کو کسی حالت میں شادی کرنے کی اجازت دینی چاہیے

اِس سوال کا جواب تو اُس سوال پر منحصر ہے کہ آیا نکاح کوئی جرم ہے یا نہیں۔ اگر بالفرض وہ جرم نہیں ہے تو اس پر سزا لگانے کی کیا وجہ ہے؟ کیا کوئی شخص اس امر کی نیورمیں عقلی دلائل پیش کر سکتا ہے۔ کہ کیوں ایک عورت کو جسے بغیر کسی قصور کے طلاق دی گئی ہے۔ بطور سزا کے مجبور کیا جائے۔ کہ وہ ہمیشہ کے لیے تنہائی کی زندگی بسر کرے؟ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس غریب کو کسی دوسرے شخص (خاوند) کے وحشیانہ پن اور بے ایمانی کے سبب کیوں سزا دی جاتی ہے؟ یا اسی طرح کیوں کسی ایسے شخص کو جس نے شادی کے معاہدہ کو ایمانداری اور وفاداری کے ساتھ نبھایا ہو۔ لیکن اس کی بے وفا بیوی اسے چھوڑ کر بھاگ گئی ہو محض سوسائٹی کے مفاد کی خاطر سزا کے شکنجہ میں کھینچا جائے؟ اور اسے عمر بھر تنہا رہنے کے لیے مجبور کیا جائے؟۔

مندرجہ بالا سوال کا ابھی ایک اور رخ باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیں یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ طلاق کے بعد انسانی جذبات ویسے ہی رہتے ہیں جیسے کہ طلاق سے پیشتر تھے۔ دوبارہ نکاح کی اجازت نہ دینا یا بالفاظ دیگر اسے روکنا گویا گناہ کرنے کے لیے عذر مہیا کرنا ہے۔

(ج) طلاق کا اثر عملی تعلقات پر کیا پڑتا ہے؟

جس طرح سچی طلاق طلاق نامہ کی پشت پناہ ہے۔ اسی طرح سچا نکاح شادی کی روح کی پشت پناہ ہے۔ جب محبت مردہ ہو۔ یا خاوند اور بیوی آپس میں ایک دوسرے سے متنفر ہوں۔ تو دراصل ان کے درمیان طلاق ہو گئی۔ بات

صرف اتنی ہے کہ جس طرح شادی کی رسم اس معاہدہ کی جو ایسا انجام کو پہنچا ہے تصدیق کرتی ہے۔ بعینہ اسی طرح طلاق نامہ باضابطہ طور پر اس واقعہ (دلی نفرت) پر جو اس سے پیشتر ان دونوں کے دلوں میں واقع ہو چکا ہے محض صاد کر دیتا ہے۔

سچی گھرستی زندگی سچی شادی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور اسی بات کے قائم رکھنے کے لیے سب سے زیادہ کوشش کرنی چاہیئے اگر قانون ان لوگوں کو جو آپس میں دلی نفرت رکھتے ہیں۔ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھنے کے لیئے مجبور رہے۔ تو گھریلو زندگی کی برکت کیا خاک ہوئی۔ اس قسم کا عمل شادی کے معیار کو نہایت ادنےٰ بنا دیتا ہے۔ اور گھر کی بشاش چاردیواری کو ایک تنگ و تاریک قید خانہ سے تبدیل کر دیتا ہے۔ اگر ہم گھربار کی زندگی کی برکت اور خوشی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں چاہیئے کہ خاوند اور بیوی کی مکمل اور پوری مساوات کو قایم رکھیں۔ جبر اور خوف کا استعمال ان کے درمیان نہ ہونا چاہیئے۔ عورت کو عدالت یا پادری کے حکم یا سوسائٹی (برادری) کے تشدد کا پابند نہ رہنا چاہیئے۔ بلکہ برخلاف اس کے اسے پوری آزادی کے ساتھ آپ اپنی ملکہ ہونے اور آپ اپنی روح اور اپنے جسم کی شہنشاہ ہونے کی حیثیت سے بیٹھنا چاہیئے۔ گھر کی سچی خوشی جبر۔ غلامی۔ اور باطل خیالات کے ذریعہ سے کبھی قایم نہیں رہ سکتی۔ دنیا میں گھر سے زیادہ متبرک کوئی جگہ نہیں۔ اور دسترخوان سے بڑھکر کوئی مذبح زیادہ پاک صاف نہیں ہے

(د) کیا طلاق کا کلی طور پر عدم جواز جہاں کہیں بھی وہ پایا جائے۔ سوسائٹی کی اخلاقی پاکیزگی پر کچھ اثر رکھتا ہے ؟ ۔

سب سے پیشتر ہمیں اپنی اصطلاحات کی تعریف کرنی چاہیئے۔ اخلاقی پاکیزگی

سے کیا مراد ہے؟ اس دنیا کے عقلمند آدمی اپنی فلاح و بہبودی کے ساتھ دوسروں کی بہتری بھی چاہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اصلی خوشی ہمارے زندگی کا مقصد ہے۔ اور اسی بات کے حاصل کرنے کے وہ درپے رہتے ہیں فلاح و بہبودی کی شرائط کے مطابق زندگی بسر کرنا اعلیٰ درجہ کا اخلاقی کام سمجھا جاتا ہے اعلیٰ مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے۔ اعلیٰ ذرائع کا استعمال کرنا سب سے بڑا اخلاقی خیال ہے۔ یا بالفاظ دیگر اخلاق چال چلن یا طرز زندگی کی تکمیل کا نام ہے۔ ایک ایسا شخص جو خوف یا لاعلمی کی وجہ سے کسی کی اطاعت کرتا ہے۔ نیک نہیں ہے۔ نیکی اور اخلاق خیالی جبر کی سلطنت میں رہتے ہیں اور جہاں کہیں بھی کوئی شخص خیالی جبر کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ نیک ہے۔ اخلاق غلامی کا مترادف نہیں ہے۔ اور نہ جہالت نیکی کا کامل نشان ہے۔

انسان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی طرف رجوع کرے۔ اسے یہ دیکھنا چاہئے کہ آیا وہ دوسرے لوگوں پر کچھ بار تو نہیں ڈالتا۔ اپنی عزت آپ کرنے کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ اپنی روزانہ حاجتوں کا خود کفیل ہو۔ جو شخص کہ آئیڈیل کے مطابق رہتا سہتا ہے وہ گویا نہایت ہی نیک کام کرتا ہے۔ سچے نکاح میں مرد اور عورت نہ صرف اپنے جسموں کو بلکہ اپنی روحوں کو ایک دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اسی کا نام آئیڈیل شادی ہے اور اسی کو نیک یا سچا نکاح کہتے ہیں برخلاف اس کے جو لوگ اپنی روحوں کے بجائے اپنے جسموں کو ایک دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ سچے نکاح میں داخل نہیں ہوتے۔ خواہ رسوم کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہوں۔ اور یہی فعل نیکی کے خلاف ہے۔

اگر یہ بات سچی ہو۔ تو عورت کس اصول محبت کے زائل ہو جانے کے پر بیاہ

رشتہ کو قایم رکھہ سکتی ہے؟ کیا سچی محبت کے علاوہ کوئی اور اصول ایسا ہے جو اس کام کو انجام دے سکے؟ کیا اس عورت کو روپیہ پیسہ۔ جائداد۔ بلند مرتبہ اور شہرت کی شوت دیکر اس مقصد کو انجام تک پہنچا سکتے ہیں۔ کیا اس پر بھی نیک کا لقب ایسی عورت پر چسپاں ہو سکتا ہے؟ کیا اس میں کچھ برادری کا فائدہ ہے کہ سلطنت اور مذہب دونوں کے ہاتھوں نیکی کی خوب گت بنے؟ پھر کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ فعل بنی نوع انسان کی اخلاقی پاکیزگی پر کچھ اثر رکھتا ہے؟

کیا ایسے ممالک میں جہاں طلاق جائز نہیں ہے۔ ان ممالک کی نسبت کہ جہاں جائز ہے۔ اخلاق کا کوئی اعلیٰ معیار قایم ہے؟ جہاں خاوند اور بیوی جن کی آپس کی محبت بالکل مفقود ہو گئی ہے طلاق نہیں پا سکتے۔ کیا ایسی جگہ عاشق اور معشوق پائے جاتے ہیں؟۔

یہ خیال کہ شادی ایک قسم ہے اور نہیں ٹوٹ سکتی۔ برائی کی ڈھال ہے دنیا اس عورت پر جس کے خاوند نے اس کے ساتھہ برا سلوک کیا ہے۔ اور جو اپنے خاوند کے گھر سے نکالی گئی ہے۔ رحم کھاتی ہے۔ اور جب وہی عورت کسی دوسرے مرد کے ساتھ محبت کرتی ہے۔ تو دنیا اسے معذور سمجھتی ہے بعینہ اسی طرح دنیا اس خاوند پر بھی جو امن کے ساتھہ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اور جو اپنے گھر سے ہی نکال دیا جاتا ہے۔ رحم کرتی ہے۔ اور اگر وہ کسی عورت کے ساتھ رابطۂ محبت قایم کرے تو اسے معذور خیال کرتی ہے

اس سے بڑھکر کوئی اور فعل برا نہیں ہے۔ کہ انسان اپنی بیوی کو جس کے دل میں خاوند کی محبت نہیں ہے۔ اپنے ساتھہ رہنے کے لیے مجبور کرے کیا یہ ہمیشہ کا گناہ نہیں ہے؟ کیا عورت اپنے انسان ہونے کی حیثیت کو

زائل کرنے؟ کیا انتخاب کرنے میں اسکی مرضی کو کچھ دخل نہیں ہے؟ کیا اسکی شرم و حیا کسی دوسرے کا مال ہے؟ کیا وہ شخص جس سے اسکو دلی نفرت ہے اسی کی خواہشات کا مالک ہے؟ کیا اسے اپنی روح کے جواہرات کی حفاظت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے؟ کیا اخلاق اسی بنیاد پر قایم ہے؟ اور کیا سوسائٹی کی اتنی ہی تہذیب ہے؟ اور کیا تہذیب بذات خود اسی بنیاد پر قایم ہے؟ کیا ایک طرف اسی ایثار نفسی اور قربانی کا نام لیکر اور دوسری طرف قسم کا حوالہ دیکر خدا کو خوش کیا جاتا ہے؟

میرے نزدیک، نہایت ہی نرم لفظ ہماری زبان میں موجود ہے اور جس سے ہمارا علم کا دائرہ نہایت ہی متاثر ہے۔ وہ میٹرنٹی (یعنے ماں کی محبت) ہے اسی ایک لفظ پر دنیا بھر کے بنی نوع انسان کے رنج و خوشی۔ جان کنی اور فرط جوش کا انحصار ہے۔ ماں موت کے سایہ میں چلتی ہے۔ تاکہ وہ ایک دوسری زندگی دے۔ محبت کی قربانگاہ پر وہ اپنی زندگی کو گروی رکھتی ہے۔ جب دنیا مہذب ہو جائے گی تو کوئی بیوی اپنی مرضی کے بغیر ماں بننا قبول نہ کرے گی۔ اس وقت مردوں کو معلوم ہو جائے گا کہ دوسرے کو غلام بنانا درحقیقت اپنے آپکو قید کرنا ہے۔ (ترجمہ)

ضیاء الدین احمد برنی

عید قرباں

کیا عجب جوش بہا عیدِ قرباں ہو گیا   بسملوں کے خون سے ہر کوچہ گلستاں ہو گیا
مثلِ گل ہر غنچۂ دل کھل کے خنداں ہو گیا   سارے عالم میں خوشی کا ساز و ساماں ہو گیا
محفلِ عیش و طرب ہر جا مہیّا آج ہے
اک ہمارا خانۂ دل ہے کہ جو تاراج ہے

اک طرف مجرمست حسینوں کا ہے یاں انداز و ناز   اک طرف کوئی بنا محمود اور کوئی ایاز
جانبِ مسجد نمازی ہیں رواں بہرِ نماز   دیدۂ بینا میں اپنی محو شانِ بے نیاز
ہوں زمانے میں تو قربانی کی خوشیاں اک طرف
اور دلِ بسمل کسی کا خوں میں غلطاں اک طرف

باعثِ جمعیتِ خاطر ہیں احباب اک طرف   بزمِ رنگیں میں ہے دورِ بادۂ ناب اک طرف
غم کا ساماں اک طرف شادی کا اسباب اک طرف   اک طرف شاداں ہے دنیا کوئی بیتاب اک طرف
پر مزا ہی عید کا کیا ہے نہ جب تک دید ہو
دوست کا ماتم ہو جس گھر میں وہاں کیا عید ہو

عیدِ قرباں کی ادا پر ایک عالم ہے نثار   لوٹنا قدموں کا کر دیتا ہے دل کو بیقرار
کیا کریں کچھ اپنا قابو ہے نہ اپنا اختیار   جان قرباں کر کے دکھلا دیتے ہم تو جو پیار
کیا کہیں جو کچھ ہے غم سے اضطرابِ دل کا حال
زیرِ خنجر بھی نہیں ایسا کسی بسمل کا حال

عید ہے جشنِ ہر خورد و کلاں دل شاد ہے   کوچہ و بازار میں شورِ مبارکباد ہے
عیش سے کاشانۂ دل سب کا آج آباد ہے   اک مکاں اپنا ہے آبادی میں جو برباد ہے

چاند ہم کو عید کا امسال مہِ غم ہو گیا + اب کے پہلے ہی محرم سے محرم ہو گیا + آغا غلام حسین ارشد

سوسائٹی کا اثر بے زبان فرقہ نسواں پر

مدت سے یہ خیال دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے کہ سوسائٹی کا یقیناً یہ ظلم ہے کہ اگر کوئی عورت دھوکہ سے بھی ایک دفعہ صراط مستقیم سے بھٹک جائے تو وہ قابل نفرت اور مرد دبڑتے سے جو چاہے سو کرے۔ حالانکہ قانون فطرۃ اور شرع ہمکو روز روشن کی طرح بتا رہا ہے کہ جو احکام مردوں پر نافذ ہیں وہی عورتوں کے لیے۔ پھر کیا وجہ کہ ہم قانون فطرۃ اور شرع کے خلاف عمل پیرا ہیں۔

کس قدر اندھیر اور صریح ظلم ہے کہ ہم علانیہ دیکھ رہے ہیں کہ ایک مرد دنیا کے امراض خبائث میں مبتلا ہے اور زمانہ بھر کا آوارہ گرد مشہور ہے اگر وہ یہ کہے کہ میں نے افعال شنیعہ سے توبہ کر لی اور آیندہ ایسے افعال قبیحہ کا مرتکب نہ ہونگا تو محض دولت کی وجہ سے حسین سے حسین لائق سے لائق لڑکی کو اس کے والدین اس کے عقد میں دینے کو موجود۔ مگر وہ لڑکی جو تعلیم یافتہ ہے حسین اور پاکباز ہے محض مرد کی چاپلوسانہ گفتگو اور جھوٹی محبت کے سحر سے مسحور ہو کر (جسکو وہ جانتی نہ تھی کہ یہ آیندہ چل کر دغا کرے گا) اگر بغیر ازدواج شرعی کے مرد کی منت و خوشامد سے طرح طرح کے سبز باغ دکھانے سے بنا۔ بے کی قسمیں کہانے سے راہ مستقیم سے بھٹک گئی تو سوسائٹی اُس کو سخت حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اور وہ ملنے جلنے کے قابل نہیں رہتی۔

خدا لگتی کہنا۔ عورت کا برباد کرنے والا۔ اس کو صراط مستقیم سے بہکانیوالا

اُس کی خوبیوں کو غصب کر لے والا۔ اسکو چاہ مذمت میں گرانے والا۔ صرف مرد ہی تو ہے۔ جبکہ صورت حال یہ ہے تو ستم ہے کہ خود ہی ایک فعل کا سبب ہو اور پھر اس کی مخالفت کرے۔ اگر قانون فطرۃ مردوں کو عورتوں پر حکومت کی اجازت دیتا ہے تو کیا یہ نہیں کہتا کہ عدل کو ہاتھ سے نہ دو۔

اگر باعتبار ضروریات مقابلہ کیا جائے تو مرد عورت مساوات کا درجہ رکھتے ہیں۔ بدصورت سے بدصورت مرد کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ حسین سے حسین عورت کا مالک ہو۔ علیٰ ہذا عورت کی بھی یہ خواہش ہے کہ وہ بھی حسین سے حسین مرد کو اپنا رفیق ابدی بنائے۔ کیا اُسکو محبت کی خواہش نہیں۔ کیا اسمیں قدرت نے شاعرانہ مادہ نہیں رکھا۔ کیا اسمیں جذبات نہیں ہیں اُس کا جی نہیں چاہتا کہ اپنا درد دل کسیکو سنا کر اوس سے داد چاہے گو عورت کے خواہشات مرد سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ مگر پھر بھی کس قدر صابر بیٹھی ہے کہ باوجود اپنی تعلیم۔ حسن۔ اخلاق کے دم نہیں مارتی اور اپنی عزیز زندگی اوسی شے کے ساتھ تمام کردیتی ہے جس کے ہاتھ میں والدین ہاتھ دیدیتے ہیں۔ اگر بفرض محال کوئی لڑکی اپنی آیندہ تقدیر سے خوف زدہ ہوکر والدین کو اطلاع دیتی ہے کہ یہ تعلق مناسب نہیں تو اُسکو دریدہ دہن۔ بے حیا۔ بے شرم۔ خاندان کا نام ڈبونے والی۔ کے خطابات دیئے جاتے ہیں۔ والدین بیزار اور متنفر نظر آتے ہیں۔

شرع میں قبل از شادی۔ مرد عورت کا آپس میں دیکھ لینا مستحب قرار دیا گیا ہے تاکہ بعد عقد جوتیوں میں دال نہ بٹے۔ پھر کیوں اس سے اسقدر غفلت اور لاپروائی کیجارہی ہے۔ حالانکہ ہم صریح دیکھ رہے ہیں

کہ جانبین میں سچی محبت ہے۔ اور ایک دوسرے کی ہمدرد پر آ منی ہیں کہ حسب شرع مبنی خوشی عقد ہوجائے تو بقیہ زندگی نہایت آرام و سایش میں گذر جائے مگر ہندوستان کا یہ کیسا دستور ہے کہ جہاں والدین کو یہ معلوم ہوا کہ جانبین میں محبت و الفت ہے اور وہ یہ جانتے ہیں کہ اس عقد مناکحت سے دونوں کی زندگی قابل اطمینان ہوگی۔ تو محض اس وجہ سے کہ کم بخت "محبت" ہے (کیا اچھا ہوتا کہ اس کا وجود ہی نہ ہوتا) ضرور ایک دوسرے کو جدا کر دیں گے اور کسی اور کے گلے منڈھ دیں گے۔ بعدہ کیسے ہی خوفناک نتائج کیوں نہ پیدا ہوں۔ اور وہ قبل از وقت دنیا سے ہی کیوں نہ سدھاریں۔ محض اس جرم پر کہ آپس میں سچی محبت کیوں کی۔ یہ گویا اس سچی محبت کی سزا ہے جو والدین کے ہاتھوں مل رہی ہے +

ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ والدین اپنی اولاد کی فلاح اور بہبودی کے خواہاں ہیں لیکن بعض اوقات وہ بجائے راحت و آرام کے ان کے حق میں کانٹے بچھا رہے ہیں۔ ہم کہیں گے کہ والدین کی محبت کافی نہیں ہے اس لیے کہ ہم اکثر خیالات ان سے پوشیدہ رکھتے ہیں اور ان کے اظہار کا بظاہر کوئی موقعہ بھی نہیں رکھتے اس لئے وہ ہمارے ساتھ پورے طور پر ہمدردی ظاہر کرنے سے قاصر ہیں۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ اگر بیان بھی کر دیں تو ہم کو وضاحت سے بیان کرنے میں سوسائٹی اور حیا مانع ہے۔

اسی خلش کے رفع کرنے کے لیے کہ ایسی عورت کی قدر کیوں نہ کیجائے جو دائرہ مستقیم سے باہر قدم دھرنے کے بعد راہ راست پر آتی ہو

بہت ساری کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی۔ ہم یہاں چند مثالیں لکھتے ہیں:

مثلاً ایک یونانی فلاسفر کہتا ہے، عورت ایک ایسا پھول ہے جسے ایک ہی سونگھ سکتا ہے۔ دوسرے کی سونگھنے سے اُس کی وہ آب و تاب باقی نہیں رہتی"۔

ایک ہندی فلاسفر اس سے بھی بڑھکر کہتا ہے، عورت کی آب اور عصمت صرف اُس کی نگاہوں اور اُس کے ہاتھوں ہی میں باقی اور محفوظ رہ سکتی ہے۔ کوئی دوسرا ہاتھ اُس کا ضامن اور کفیل ہو نہیں سکتا"۔

یہ مثالیں ایسی نہیں ہیں جو قابل تسلیم ہوں محض حالات سے اقتباس کی گئی ہیں۔ اس کو بھی ہم سوسائٹی کا بنایا ہوا کہتے ہیں قانون فطرت اور شارع کا حکم ایسا نہیں ہے بلکہ وہ صاف الفاظ میں حکم کر رہا ہے کہ حد جاری ہو اور درّے لگائے جائیں۔ تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور ایسے افعال سے باز آئیں۔

غرض ہم اس امر کے ثبوت میں کہ عورت کو صراط مستقیم سے بہکانے والا مرد ہے۔ اخبار المؤید سے ایک آرٹیکل نقل کرتے ہیں "جو غرفۃ الاحزان" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس سے عورتوں کی بے گناہی کا سچا ثبوت دستیاب ہوتا ہے۔ حالانکہ اس قبیل میں عورتوں سے زیادہ مرد سزاوار سزا ہیں۔ پھر عورتیں کیوں قابل مواخذہ سمجھی جاتی ہیں اور مرد بری +

"کہتا ہے (قاہرہ) میں میرا ایک دوست تھا میں اُس کے صلاح اور پرہیزگاری سے بڑھکر اوس کی لیاقت اور حسن اخلاق کا گرویدہ تھا۔

اس کے بعد مجھکو کوئی ایسی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ میں یہ دریافت کرتا کہ اُس کے چال چلن کیسے ہیں۔ اور اُس کی عبادت کا کیا ڈھنگ ہے۔ فاسق ہے یا پاکباز۔ زاہد ہے یا رند۔ کیونکہ مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اُس سے علوم شریعت پڑھوں۔ یا اخلاق کا سبق لوں۔ یقیناً میں اس بات کو سمجھ چکا تھا کہ محبت کرنے کے لیے جو کچھ کہ میں نے اندازہ لگایا تھا وہ کافی بلکہ کافی سے زیادہ تھا۔

اسی طرح ہماری دوستی اور محبت میں ایک زمانہ گذر گیا۔ نہ کبھی میں اُس کو کسی بات سے رنجیدہ کرتا نہ کبھی وہ کسی ناشائستہ حرکت سے صدمہ پہونچاتا یہاں تک کہ میں قاہرہ سے ایک دور دراز سفر کے لیے روانہ ہوگیا۔

تاہم ہماری مراسلت برابر جاری رہی۔ مگر پھر ہماری مراسلت بند ہوگئی جس سے میرے دل میں اُس دوست کی نسبت وہی خیالات و شکوک پیدا ہونے شروع ہوئے جو ایسی حالت میں جیسے کچھ کہ پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور پیدا ہونا ضروری ہیں۔ پھر میں قاہرہ واپس آیا۔ اور پوری ہمت و کوشش سے اُس عزیز دوست کی جستجو و تلاش جاری رکھی نشست و برخاست کے وہ تمام مقامات چھان مارے جہاں جہاں کہ اُس کا گذر ہوتا تھا۔ اور جس کو میں جانتا تھا۔ لیکن اُس کا پتہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر میں اُس کے محلہ کیطرف گیا اور پڑوسیوں سے دریافت کیا جواب ملا کہ ایک زمانہ گذرتا ہے کہ وہ لوگ یہاں سے اُٹھ گئے۔ معلوم نہیں کہ اب کہاں رہتے ہیں۔ اس جواب سے میرے خیالات میں عجیب تلاطم پیدا ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے لیے یاس و نا اُمیدی میں جنگ چھڑ گئی پھر میں سمجھ گیا کہ اول الذکر نے آخر الذکر پر فتح حاصل کرلی۔ اور مجھکو معلوم ہوگیا کہ میں

اوس عزیز دوست کو کھو چکا ہوں - اور اس روز سے یقیناً میں اس کی تلاش کا کوئی ایک راستہ نہ پاتا تھا -

اس وقت وفورِ غم سے میرے آنسو جاری ہو گئے - کیوں نہ جاری ہوتے کہ اس دنیا میں مجکو دوستوں سے بہت کم حصہ ملا تھا اور زمانے نے میرے وفادار دوست کو گم کر دیا تھا اور میں آسمان کا نشانہ بن گیا جس کے تیر خطا نہیں کرتے اور جس کی نازل کردہ مصیبتیں غائب نہیں ہو سکتیں !

اس یاس و غم کی حالت میں میرے دن قاہرہ میں بسر ہونے لگے ایک روز میں قمری مہینہ کی آخر شب میں جبکہ گہر کو واپس آ رہا تہا تو تاریکی کی وجہ سے راستہ بھول گیا اور ایک تاریک وحشت ناک گلی میں نکل گیا - جو آیند و روند سے بالکل سنسان اور خالی تہی اسوقت کی چھائی ہوئی تاریکی و وحشت سے یہ خیال پیدا ہوتا تہا کہ یہاں یا تو جنات و شیاطین رہتے ہیں یا غول بیابانی کا مسکن ہے - میں یہ سمجھتا تھا کہ دو سر بلند پہاڑوں کے درمیان بحر اسود تلاطم برپا کر رہا ہے گویا وحشت ناک موجیں مجھکو آگے اور پیچھے بہائے لیئے جاتی ہیں یا اٹھاتی بٹھاتی ہیں +

میں اسی پریشانی اور حیرت میں تھا کہ قریب کے کسی ایک مکان سے ایک دردناک چیخ کی آواز سنائی دی - اور مجھے غور و فکر لاحق ہوا - کہ یہہ آواز کدہر سے آئی - پہر وہی آواز مکرر سنائی دی - اس کے بعد اون دردناک آوازوں کا تانتا لگ گیا - جنھوں نے میرے دل پر نہایت گہرا اثر پیدا کیا - میں بول اٹھا یا للعجب ! اس سیاہ رات کے سینے میں کتنے مایوسوں کے اسرار اور غم زدوں کے راز پوشیدہ ہیں

میں نے خدا سے اقرار کر لیا کہ اگر میں اس غمزدہ کو پاؤں تو ضرور اُس کی
ہمدردی میں جاسہے وہ کوئی ہو کبھی دریغ نہ کروں۔ اور اُس کے لیے
کوشش کروں۔ بشرطیکہ وہ معاملہ میرے بس کا ہو۔ ورنہ آنسو بہانے
میں تو مجھے کبھی تامل نہوگا۔ پھر میں آواز پر پتہ لیتا ہوا اوس گھر پر
پہونچا جہاں سے کہ یہ دردناک آواز آرہی تھی۔ دروازہ کو کھٹکھٹایا۔
تھوڑی دیر کے بعد ایک کمسن لڑکی جس کی عمر دس سال سے زیادہ
نہ ہوگی جس کے ہاتھ میں ایک دھندلی روشنی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ تھا
اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھی آئی۔ گویا ماہ کامل ابر کے پھٹے
پھٹے بادلوں میں گھرا ہوا ہے۔ جسکو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ میں نے
پوچھا حور کے بچے کیا تمھارے گھر میں کوئی بیمار ہے؟ میری اس
سوال پر اُس نے ایک دردناک چیخ ماری جس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں
اوس ننھے دل کے پرزے نہ ہو جائیں۔ اُس نے کہا اے نیک مرد
کیا تم میرے باپ کی مدد کر سکتے ہو جو عالم سکرات میں بستر مرگ پر لیٹا ہوا
دم توڑ رہا ہے۔ یہ کہکر وہ آگے ہوئی اور میں اُس کے پیچھے ہو لیا۔
آخر ہم ایک تنگ و تاریک کمرہ میں داخل ہوئے جس کا ایک چھوٹا سا
دروازہ تھا۔ جب میں اُس میں داخل ہوا تو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم ایک
زندہ دنیا سے نکل کر مردہ دنیا میں جا پہونچے کمرہ گویا قبر ہے اور بیمار میت
میں آہستہ آہستہ قدم بڑھا کر بیمار کے قریب بیٹھ گیا بیمار کی حالت نہایت
عبرتناک ہو رہی تھی اس کا جسم قفس استخواں بن گیا تھا نفس کی آمد و رفت
ایسی ہی تھی کہ جیسے لکڑی کے گنبد میں ہوا گونج رہی ہے۔ میں نے
مریض سے دریافت کیا کہ اب وہ کیا چاہتا ہے۔ میری اس آواز پر

اُس نے اپنی آنکھیں کھولدیں اور اپنی نظر میرے چہرے پر جما کر اور تھوڑی دیر کے بعد آہستہ آہستہ اپنے ہونٹوں کو حرکت دی اور نہایت پست آواز میں یہ کہا "الحمدللہ فقد وجدت صدیقی" (خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنے دوست کو پالیا)۔

میں یہ سمجھنے لگا کہ میرا دل رنج و قلق سے پہلو میں دھڑک رہا ہے میرے ہاتھ سے صبر جاتا رہا جس کو میں ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ میں چاہتا تھا کہ بے صبری ظاہر نہ کروں جو ایسے موقعہ کے لیے نہایت بری ہے مگر اُس وقت کا صبر کرنا میرے اختیار سے باہر تھا کیونکہ وہ قریب مرگ تھا۔ میرے اُس غم کا اندازہ ناممکن تھا جو میرے دل میں پوشیدہ تھا۔ اور پہلوؤں میں دفن تھا۔ میری اس ملاقات نے اُس کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ حیات کو اکسا دیا۔ اُس میں کچھ توانائی آئی اور اشارہ کیا کہ مجھکو اُٹھا کر بٹھا دو۔ میں نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا جس کے سہارے وہ اُٹھ بیٹھا۔ اور اپنا قصہ نہایت ناتوان آواز میں رک رک کر اس طرح بیان کرنا شروع کیا:۔

دس سال کا عرصہ بلکہ کچھ مہینے زیادہ ہوتے ہیں کہ میں اور میری والدہ ایک مکان میں رہتے تھے جس کے پڑوس میں ایک امیر متمول بھی رہتا تھا اس کے مکان میں ایک دوشیزہ پری تھی میں کہہ سکتا ہوں کہ کسی ایک مکان میں بھی ایسی حسین جمیل شکیل۔ زیبا۔ خوبصورت۔ حور نہ ہوگی۔ اُس کو دیکھنا تھا کہ میرا دل ہاتھ سے جاتا رہا اور ہزار جان سے پروانہ صفت اُس کے شمع حسن کا شیفتہ و شیدا ہوگیا۔ صبر و تحمل مجھسے سلب ہوگیا۔ رشتۂ محبت قائم کرنے کے لیے ہزار دل منصوبے۔

لاکھوں تدبیریں کیں - اور اُس کے دل پر اثر پیدا کرنے کے لیے مختلف ڈھنگ سوچے - ایک مدت کے بعد محبت نے اپنا اثر دکھایا - یہ بت سیمیں آہوے رم خوردہ رام ہوا - اور بتِ نامہربان نے بھی مہربانی کرنی شروع کی رفتہ رفتہ اُس کو آیندہ زندگی کا سبز باغ دکھا کر اور عہد و پیمان کی گرہ اُستوار کر کے ایک دن بہلا پھسلا کر بغیر قاضی کے عقد پر راضی کر لیا

ابھی تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا کہ مجھکو معلوم ہو گیا کہ اُس کے پاس ایک ننھی اور جدید مخلوق حرکت کر رہی ہے - اُس خبر سے میرے حواس باختہ ہو گئے - اور میں سوچنے لگا کہ آیا ایفاے وعدہ کروں - یا مرے سے رشتۂ الفت ہی منقطع کر دوں - اسی حیص بیص میں پچھلا خیال پہلے خیال پر غالب آ گیا - اور میں اُس مکان سے اُس شب اٹھ آیا - کہ جہاں اسے دوست تو مجھ سے ملاقات کیا کرتا تھا - اس کے بعد اس مظلوم نازنین کی کوئی کیفیت معلوم ہی نہیں ہوئی - نہ میں نے کبھی اس ویرانے کی زحمت گوارا کی - اس حادثہ کے بعد چند سال گذر گئے ایک روز مجھے ایک خط ڈاک کے ذریعہ ملا - (اس وقت مریض نے تو تکیے کے نیچے سے جس پر بیٹھا ہوا قصہ بیان کر رہا تھا ایک خط نکال کر میرے حوالے کیا) میں نے پڑھنا شروع کیا لکھا تھا:-

اگر مجھے کوئی ایسی ضرورت محسوس ہوتی کہ میں پھر کبھی اُن شکستہ عہد پیمان یا اُس قدیم محبت کی تجدید کرنے کے لیے خط لکھوں تو بھی میں تم کو ایک سطر نہیں بلکہ ایک حرف بھی لکھنا کبھی پسند نہ کرتی کیونکہ مجھے یہ کامل اعتقاد نہیں کہ ایسا عہد جیسا کہ تمہارا دغابازانہ عہد تھا - اور ایسی محبت کہ جیسی تمہاری جھوٹی محبت تھی - اس امر کا

استحقاق رکھتی ہے کہ اس کی عزت کروں جس کا میں نہایت افسوس کے ساتھ ذکر کرتی ہوں۔ پھر اس کے تجدید کی درخواست کروں!

جس وقت تم مجھکو چھوڑکر فرار ہوئے تمہیں معلوم تھا کہ میرے پہلو میں ایک آگ سی بھڑک رہی ہے اور جنین اس دنیا میں آنے کے لیے موجود ہے مگر تمھارے اس بھاگنے کے دو سبب تھے ایک یہہ کہ تمکو ان مصیبتوں کے دیکھنے کی آفت نہ پڑے جو تمھاری لائی ہوئی تھیں۔ اور تمھارے ہاتھوں کو ان آنسوؤں کے پونچھنے کی مشقت نہ اٹھانی پڑے جو تمھارے ہی جاری کیے ہوئے تھے۔

اس کے بعد میں تمکو ایک شریف انسان سمجھ سکتی ہوں؟ نہیں بلکہ اس کے سمجھنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتی کہ تم کو "انسان" تصور کروں تصور تو کیا انسان سے تعبیر کروں۔ اس لیے کہ یقیناً جو لوگ درندہ جانوروں۔ وحشی گزندوں کے متفرق خصائل سے کوئی ایک خصلت ایسی نہیں چھوٹی جو تمہاری ذات والاصفات میں جمع نہ کی گئیں ہوں نہ ان تمام خصائل اور صفات کے تم مظہر واحد ہو۔ تم اپنے اس دعوے میں بے حد جھوٹے ثابت ہوچکے ہو جس میں تم کہا کرتے تھے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے تھے مگر اپنی ذات کے لیے۔ خلاصہ یہ کہ تم یہ دیکھ چکے تھے کہ میں ہی ایک ایسا راستہ اور ذائقہ ہوں جس پر سے عبور کرکے اور اسکو چکھکر اپنے نفس کو راضی رکھ سکتے ہو۔ اس لئے تم نے مجھ پر سے گذر کر اپنے نفس پرستی کے راستہ کو حاصل کرلیا!

اگر یہ بات نہ ہوتی تو تم کبھی میرے پانے کے لیے کوشش نہ کرتے نہ میرے لیے کوشش کرنے میں کوئی وجہ دیکھتے تم اپنے اس وعدے میں دغابازی کر چکے ہو جبکہ تم نے مجھ سے حتمی وعدہ کیا تھا کہ تم مجھ کو اپنی بیا ہتا بی بی بناؤ گے۔ مگر تم نے اپنے اوس حتمی وعدہ کے خلاف کیا۔ اس لیے کہ تم یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ ایک ایسی عورت سے جو مجرمہ ہے ذلیل ہے اُس سے نکاح کرو۔ للہ بتاؤ کہ یہ کونسا گناہ ہے؟ اور یہ کونسی ذلت ہے؟ یہ تمھارے ہی ہاتھوں اور نفس کے لائے ہوئے ہیں اگر تم نہ ہوتے تو میں نہ گنہگار ہوتی نہ ذلیل ہوتی۔ حالانکہ حتے الامکان میں تم سے بچنے کی کوشش کرتی رہی۔ آخر تمھارے مقابلہ میں مجکو ہارنا پڑا اور شکست فاش نصیب ہوئی اور میں اوس بچہ کی طرح تمھارے سامنے گر کر رہ گئی جو جلیل القدر پہلوان کے مقابلہ میں بے بس ہو جاتا ہے۔ اور تم نے اس موقع کو غنیمت جانکر مجکو برباد کر دیا۔ اس کے بعد میرا نفس ندامت سے بھر پور اور دل پژمردہ ہو کر رہ گیا۔

زندگی کو الوداع اور موت کو خیر مقدم کہنے لگی۔ قیامت کا آنا برحق ہے۔ خدا کو منہ دکھانا ضروری ہے۔ للہ سچ کہنا۔ بھلا اُس عورت کو زندگی کا کیا خاک لطف مل سکتا ہے جو نہ کسی شوہر کی بی بی بن سکتی ہے۔ اور نہ کسی بچہ کی ماں۔ بلکہ دنیا کے معاشرتی جلسوں میں بھی شریک نہیں ہوسکتی۔ تمام عمر ندامت سے سر نیچا کیے باغیرت کے مارے نگاہ زمین پر

گڑی ہوئی۔ ہاتھوں سے منہ چھپائے ۔طعنہ دینے والوں اور فضیحتی کرنے والوں کے خوف سے دل پژمردہ کیے ہوئے حسرت سے دیکھ رہی ہو۔

تم نے میری راحت ۔میرا چین ۔میرا آرام ۔میری عزت ۔میری حرمت ۔ بعوض کائنات عالم کی کل خوشی لوٹ لی۔ کیونکہ اس حادثہ کے بعد اُس قصر سے جہاں مجھے اپنے والدین کے ساتھ شادمانہ مسرت انگیز زندگی بسر کرتی تھی فرار ہونا پڑا۔ اور اُن بیشمار نعمتوں کو جو میرے آس پاس تھیں اور اس خوشحال زندگی کو چھوڑ کر ایک دور و دراز سنسان محلّہ کے ایک حقیر جھونپڑے میں محض اس لیے نکل جانا پڑا کہ پھر مجکو کوئی نہ پہچانے ۔اور اس طرح بقیہ زندگی کس مپرسانہ حالت میں تمام ہو جائے۔

تم میرے والدین کے بھی قاتل ہو کیونکہ مجھے تحقیق طور پر معلوم ہوا ہے کہ وہ میرے فرار ہونے کے بعد مر چکے ہیں اور میں یقینی سمجھتی ہوں کہ وہ صرف میرے ہی کھوئے جانے اور میرے ہی دیدار کی آرزو اور تمنا میں قبل از وقت چل بسے فقط اس لیے کہ میں اُن کی اکلوتی اور نازونعم کی پالی لڑکی تھی۔

تم میرے بھی قاتل ہو کیونکہ زندگی کا وہ تلخ پیالہ جو میں نے تمھارے ہاتھ سے چکھا یہ طول غم و الم جو تمھاری وجہ سے مجھے نصیب ہوا ہے میرے جسم و روح پر اس طرح اثر کر رہا ہے کہ اب میں ایک دہکتے ہوئے انگارہ کی طرح بستر موت پر

پڑی ہوئی ہوں۔ اور سمجھتی ہوں کہ خدا نے مجھ پر مہربانی کی اور میری دعا قبول کی اور اب کہ مجھے موت جلد اس بدنصیب دنیا سے نکال کر عالم حیات ابدی ، اور سرور جاودانی میں پہونچادے حاصل کلام تم ایک جھوٹے مکار۔ دغا باز۔ خونخوار۔ قاتل چور ہو اور میں سمجھ نہیں سکتی کہ وہ منتقم حقیقی میرا بدلہ لیے بغیر تمہیں یوں ہی چھوڑ دے گا ؟

میں یہ خط تمھیں اس لیے نہیں لکھ رہی ہوں کہ تم سے پھر تجدید ایفائے وعدہ کے مداومت کی درخواست کروں۔ یا محبت کی سوگند دے کر استحکام محبت کی خواہش ظاہر کروں۔ تم خود اتنی سمجھنے کی قابلیت تو ضرور رکھتے ہو کہ تمھارے متعلق میرے دل میں کیا کیا خیالات ہوں گے ؟ سوا اسکے اس وقت میں قبر کے دروازہ پر کھڑی ہوں۔ اس زندگی اور اس زندگی کی تمام بھلائیوں۔ برائیوں۔ خوش نصیبیوں اور بد نصیبیوں کے موقف وداع (جائے رخصت) پر کھڑی ہوں۔ اور میں تمکو یہ خط اس لیے لکھ رہی ہوں کہ میرے پاس تمھاری ایک امانت ہے جسکو تم بھول گئے۔ وہ امانت مجھے بہیر دینی ضرور ہے یعنی "وہ تمھاری لڑکی ہے" اگر تمھارے دل میں کچھ بھی پدرانہ شفقت ہے تو چلے آؤ۔ اور اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ڈرتی ہوں کہیں ایسا نہو وہ بھی اُس بدنصیبی میں حصہ پائے جو اس سے پیشتر اُس کی ماں پا چکی ہے "

جب میں یہ خط پڑھ چکا تو اپنے دوست کی جانب نظر کی۔

دیکھتا کیا ہوں کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں میں نے
پوچھا کہ کہئے اس خط کے وصول ہونے کے بعد کیا ہوا۔ بولا!
اس خط کے پڑھنے کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے
پہلو میں بادل کی سی گرج پیدا ہوئی اور وفور اضطراب اور غم سے میرا
دل وسینہ پھٹ رہا ہے۔ فوراً خط کے پتہ پر مکان کی طرف روانہ
ہوگیا اور وہ مکان یہی ہے کہ جہاں تم بیٹھے۔ اس وقت دیکھ رہے ہو میں نے
اُس مظلوم کو اس حجرہ میں جس میں اس وقت میں ہوں جسم بے جان
مردہ پایا۔ اور اس لڑکی کو اس کے بازو پر بیٹھے ہوئے نہایت
تلخ آنسو بہاتے اور روتے دیکھا۔ اس عبرتناک سین کو دیکھکر مجھے غش
اور چکر آگیا اور اوسی عالم غشی میں میرے تمام جرائم مجھے وحشی درندہ
سانپ بچھو ہوکر ڈسنے لگے جب مجھے افاقہ ہوا تو میں نے خدا سے
یہ پختہ عہد کرلیا کہ جب تک میں زندہ رہوں گا اس حجرہ سے
باہر نہیں نکلوں گا جس کا نام میں نے "غرفۃ الاحزان" (ماتم کدہ)
رکھا ہے۔ میری زندگی بھی اُسی کی طرح پُر درد ہوگی۔ اور میری تقدیر
بھی اُسی کی طرح یکسانہ ہوگی۔ اور آج میں بے انتہا جوش اور مسرت
کے ساتھ مرتا ہوں اور میرا دل مجھے بتا چکا ہے کہ ان رنجوں اور
ان بدنصیبیوں کے سبب جو میں اُٹھا چکا ہوں خدا نے میرے تمام
گناہوں کو معاف کردیا۔

جب سلسلہ سخن اس کا یہاں تک پہونچا تو اُس کی زبان میں لکنت پیدا
ہوگئی۔ چہرہ زرد پڑگیا اور بستر مرگ پر یہ کہتے ہوئے جان دی۔
دامنی یا صدیقی یا اے میرے دوست میری لڑکی اب تیرے حوالہ ہے۔

میں اس کے بازو میں ایک گھنٹہ کامل تک اسی رسم کو ادا کرتا رہا جو ایک دوست دوسرے دوست کے لیے ایسے موقع پر کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اُس کے دوسرے دوستوں شناساؤں کو اسکی موت کی مختصر کیفیت سے اطلاع دی۔ سب جمع ہوئے اور اُس کو آخری منزل تک پہونچا آئے۔ اور میں نے کبھی عورتوں۔ مردوں کو آجکی طرح اس قدر روتے ہوئے نہیں دیکھا۔

قارئین سچ سمجھنا۔ میں اسوقت یہ واقعہ لکھ رہا ہوں مگر میرا دل رونے سے نہیں تھمتا۔ اور میں جب تک زندہ رہوں گا اُس کے الوداعی الفاظ کبھی میرے دل سے نہیں نکلیں گے۔" انتہی۔ بتصدیق

اے مضبوط دل والے مرد! کمزور طبیعت والی عورتوں پر رحم کرو جب تم اُن کی عزت عفت عصمت۔ کو لوٹتے ہو تو تم یہ نہیں خیال کرتے کہ تم کیسے معصوم اور شریف خون کا ستیاناس کر رہے ہو۔

کیا اس قدر واقعات سے بھی ہم میں احساس نہیں پیدا ہوتا جو ہم آئے دن کمزور فرقہ پر ظلم و زیادتی کر رہے ہیں۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ زمانہ جاہلیت کی طرح لڑکی پیدا ہونے کے ساتھ ہی زندہ دفن کر دی جائے۔ تاکہ سوسائٹی کا اثر اوس پر نہ پڑے۔ اور ہم جلد گناہگار نہ بنیں حالانکہ ہمارے ان گناہوں کی انتہا نہیں ہمارے نامۂ اعمال میں نقطۂ موہوم کو سپیدی باقی نہیں۔ للہ کمزور بے زبان فرقہ پر رحم کرو۔ انہیں اُن کے جائز حقوق عطا کرو۔

اے سوسائٹی اور اس کے قانون کے بنانے والو جس کی آنکھیں کھولو دیکھو بھالو۔ کہ ہماری وجہ سے عورتوں پر کیسے کیسے مظالم ہو رہے ہیں

[illegible]

یادِ نذیر

ہاں اے غروبِ مہروش   اے جاذبِ تارِ نظر
دیکھوں تجھے شام و پگہ   ہو آہ لب پر چشم تر
مژگاں ہوں میری خونچکاں

اے سرخیِ رنگِ شفق   اے مرغزارِ آسماں
خورشید کا کیوں منہ ہے فق   چہرہ سے ہی جو یوں عیاں
کیا دل میں ہے دردِ نہاں

اے روشنیِ صبحدم   اے پیکرِ نور و ضیا
کیا ہے قمر کو رنج و غم   چہرہ ہے جو اترا ہوا
کہہ مجھ سے اپنی داستاں

جو شے ہے حسرت خیز ہے   جو چیز ہے سنسان ہے
کب دل ہی فرحت ریز ہے   ہر عضو گر بے جان ہے
ماتم کدہ سا ہے جہاں

کیوں ہے فسردہ قلب و جاں   کیا ہو گیا جوشِ طرب
پژمردہ ہے جو ہے جہاں   سب مٹ گیا شور و شغب
کیوں روح ہے میری تپاں

ہاں اے نذیرِ بے وفا   کیوں پھیر لی ہم سے نظر
ہم سے ہوئی تھی گر خطا   تو اسکو کرتا درگذر
تو فطرتاً تھا مہرباں

تیری محبت بے ریا   تیری اعانت مخل

تیری صداقت برملا تھی بزم میں ضرب المثل
لیکن ہے اب اک داستاں

دلسوز تھا ہمدرد تھا۔ ہوتا تھا تجھ سے دور غم
محفل میں اپنی فرد تھا مشہور تھا تیرا کرم
پورا ہو کیوں کر یہ زیاں

تو کیا چھٹا راحت چھٹی تو کیا گیا تسکیں گئی
عشرت چھٹی راحت چھٹی رونق گئی تزئیں گئی
سونی ہے بزم داستاں۔

عجلت تجھے آخر تھی کیا جو چل دیا منہ موڑ کر
لی تو نے کیوں راہ فنا الفت کو سب سے توڑ کر
کیا ہیں وہاں آسانیاں؟

تعمیر ہے کیا خلد کی بہتر وطن کی خاک سے
کیوں مٹ گئی وابستگی گھر کے خس و خاشاک سے
اچھا ہے کیا باغ جناں

کیسے کہوں تو کھو گیا تھا تو تو شیدائے وطن
پھر کیا ہوا کیوں کر ہوا بلبل سے چھوٹا کیوں چمن
ایسی کشش کیا ہے وہاں؟

جانے کو تم جاؤ اجی اتنا سمجھ رکھو مگر
بس اِن گذرتا ہے کوئی تم سے ملے یہ نوحہ گر
اور ہو گلہ نوکِ زباں

ہاں اے نیازِ نیمجاں پوری ہو جب تک آرزو
ہو نوحہ خواں، گرم فغاں ——— سوکھے نہ آنکھوں کا لہو + ہو قبر پر تو گلفشاں۔

نیاز محمد خاں۔ نیاز فتحپوری

مکتوبات میر قمر الدین خانؒ

(آصف جاہ اول)

از

پروفیسر ڈاکٹر محمد شرف الحق صاحب حقی - ایم - اے - پی - ایچ - ڈی -

کچھ مدت پہلے جب میں مشہور تاریخی شہر دار الظفر بیجاپور کے متصل سرکار عالی متعالی کے قصبہ لنگسگور کی نواح میں شکار کھیل رہا تھا - ہماری چھوٹی سی جماعت میں اس تعلقہ کے ایک رئیس بھی شامل تھے جو شکار کی تلاش اور اس کا پیچھا کرنے میں باوجود کبر سنی ہم سب سے زیادہ سرگرم اور انتھک تھے - بس تو ان کی اس طرح کی مستعدی اور ساتھ ہی دوست نوازی کے سبب سے ہمیں نہ صرف جی بھر کر شکار مل جاتا تھا بلکہ اور بھی چھوٹے موٹے کام بآسانی نکل آتے تھے - چنانچہ زیادہ تر انہی کی کوشش سے چند قلمی کتابیں میرے ہاتھ لگ گئیں - ایسے نسخے اب دن بہ دن عنقا ہوتے جاتے ہیں - ان میں سے ایک وہ تھی جس کا نام میں نے اپنی طرف سے ٹھیرا کے اس مختصر مضمون کی سرخی قرار دیا ہے - میں سمجھتا ہوں میری لاپروائی جب تک بھی جاری رہتی یہ نایاب نشانات ہیں جن کا تعلق اس عہد کے بعض تاریخی واقعات سے ہے جس میں وہ قلم بند کئے گئے تھے ویسے ہی چھپے رہتے جیسے کہ اب تک رہے میرے پاس پہونچکر بھی جو یہ کچھ عرصہ ظاہر نہ ہوسکے اس کی وجہ یہ ہوئی

کہ یہ ایسی ایک تصنیف کے ساتھ مجلد کے آخر میں منسلک کر دیے گئے تھے کہ جس کی اس زمانہ میں کتب سے اٹھنے کے بعد ذرا کم ہی تلاش ہوتی ہے یہ ایک محمد تاج الدین متخلص بہ بہجت کی لکھی ہوئی چمنستان معنی بہجت بیان۔ یعنی گلستان سعدی کی شرح ہے۔ جو ایک سو بہتر ۱۷۲ ویں صفحہ (۸ ½ × ۱۱ ½) پر تمام ہوئی ہے۔ اس کے نام سے اس کی تالیف کا سنہ ۱۱۴۶ھ نکلتا ہے موجودہ نسخہ مگر اس کے سترہ برس بعد سنہ ۱۲۶۳ ہجری میں حافظ محمد فضل اللہ ولد میرزا ابراہیم قاضی کے ہاتھ سے بمکان اودونی صوبہ دار الظفر بیجاپور نقل ہوا۔ یہاں سے اسی کاتب کے قلم سے لکھے ہوئے چار صفحہ اور ہیں جن کی سرخی از کتاب سفینۃ النجات مولانا اسلمی صاحب سلمہٗ ہے۔ اور اب ان کے بعد سے ہمارے مکاتیب شروع ہو جاتے ہیں جن کا شمار جیسا کہ میں نے ان کو گنا اٹھاسی ہے۔ یہ حصہ جو بالکل جدا ہے اس کا کاغذ پہلے حصوں سے زیادہ پتلا خط ملتا جلتا مگر صاف تر نستعلیق ہے۔ شروع جہاں سے ہوا وہاں اور جہاں تمام ہوا وہاں اس کا کوئی نام وغیرہ ایسا لکھا ہوا نہیں ہے جس سے غور سے مطالعہ کیے بغیر اس کا کچھ پتہ چل سکے۔ سر صفحہ پر یا فتاح لکھا ہوا ہے جس کے نیچے بسم اللہ الرحمن الرحیم اور پھر پہلا رقعہ شروع ہو جاتا ہے۔ آخر میں اٹھاونویں صفحہ پر آخری خط ان الفاظ میں کہ مجموع نہ ہزار سوار و یازدہ ہزار پیادہ ملازم سرکار نظر بر جمیع اخراجات سابق و لاحق کہ نمودہ میشود و نظر بر مداخل نمودہ میشود تحریر رسید۔ یکایک ختم ہو جاتا ہے گویا نقل ادھوری چھوٹ گئی۔

اس وقت تک میں نے اس حصہ کے پہلے چالیس ۴۰ مکتوبات کو کسی قدر تفتیش سے پڑھا ہے۔ ان میں جو جو حالات پائے گئے اور جو بالعموم

دکن کے مہمات سے وابستہ ہیں ان کو ہم عصر واقعات سے جو بعض مروجہ تاریخی کتابوں میں ثبت ہیں جو بمجھے مقابلہ کے لیے یہاں مل سکیں ملانے سے یہ صاف طور سے روشن ہو جاتا ہے کہ یہ ابتدائی منشآت بلکہ عرضداشتیں وہ ہیں جو میر قمرالدین خاں آصف جاہ اول نے روشن اختر محمد شاہ بادشاہ غازی کی خدمت میں گذرانی تھیں۔ اور جب اُن اشخاص کا پتہ چلتا ہے جن کے نام ان میں واقع ہیں (مثلاً خدویر قمرالدین کا جو اکتیسویں مکتوب میں اس طرح ادا ہوا ہے کہ عرضداشت کمترین راسخ العقیدت قمرالدین باداے آداب بندگی الخ) تو پایۂ ثبوت اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ غرض یہ مجموعہ ضرور اس قابل ہے کہ اس سے اس زمانہ کی جب کہ ہندوستان میں مرہٹوں کے دور دورہ کا کیا کچھ آغاز ہو چکا تھا دکن کی تاریخ پر روشنی ڈالی جا سکے۔ پس اسی خیال سے اور نیز اس لیے کہ اس میں سے کے چند مکاتب انشا پردازی کا عمدہ نمونہ خیال کیے جا سکتے ہیں اور کیوں نہ ہو آصف جاہ اول نہ صرف اول درجہ کا مدبر بلکہ سعداللہ خاں وزیر شاہ جہاں کے بعد سب سے بڑھا ہوا عالم اور علمی قدرشناس تھا۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ جب کبھی فرصت نصیب ہو اور ساتھ ہی میرا ہاتھ ان تمام کتب تک پہونچ سکے جن سے اس پر حاشیہ چڑھانے میں مدد مل سکے تو ان تمام مکاتیب کو ایک کتاب کی صورت میں چھپوا دوں۔ لیکن۔ اس خوش وقت کے آنے تک گوارا نہ ہو سکا کہ کم سے کم پہلی عرضداشت بطور نمونہ ایسے حضرات کے روبرو پیش نہ کی جائے۔ جن کو اس قسم کی تصنیف سے کچھ بھی مذاق حاصل ہے۔

کمترین فدویان عقیدت شعار بعد ادائے آداب بندگی بذروہ عرض

بار یابان حضور موفور السرور بادشاه سلیمان منزلت فلک جاه خدیو سکندر
منقبت عالم پناه قبلهٔ مقصود و کعبهٔ معبود فدویان صادق آبرو بخش بندهای
واثق میرساند که کفار فجار تیره روزگار باراده فاسده سر از سوراخ شرهای
خود بر آورده بطریق مستمره بعد و سپهره هر طرف دویدند و جمعیتی از آنها برهانپور
را محاصره نمودند- فدوی درگاه بعزم تنبیه آنها از مقام چهاونی روانه شد عضد الدوله
را در حوالی حالنه با باجی راو که از اشد اشقیاست مقابله و محاربه اتفاق افتاد
و جنگ شد- الحمد لله و المنة باقبال بادشاهی تنبیه رسا یافت و جمعیتی کثیر از آن
گروه گمراه کشته شدند و زخمی گشتند- از نیطرف هم چندی بشهادت رسیدند
و زخمی شدند- راو رنبهاجی ترددات شایسته نمود- پسر رشیدش بکار آمد و
مردم دیگر نیز ترددنمایان نمودند- باجی راو از پیش عضد الدوله گریخته بجانب
برهانپور رسیده ملحق گشت- فدوی هم بجلدی به برهانپور رسیده- آن اشقیا
خواستند که از نربدا بگذرانند- از برهانپور بسرعت روانه شد آنها را فرصت
گذشتن از دریا نداد خایب و خاسر برگشته رو بکهات کساری نهادند- بعد
برآمدن کهات و بهاربه بجانب سنگمیسر رفت و باجی راو بطرف مونگی پتن
عضد الدوله را بتعاقب او مرخص نمود- درین صحن سید لشکر خان و همت
یا خان و راو رنبهاجی وغیره را بر سر پسر و بهاربه دوانیدند و تنبیه خوب
نمودند چندانکه سرداران از اشقیا بجهنم شتافت اسپان با ساز
بدست آمدند غیرت کلی عاید کفار گشت- فدوی الحال اراده دارد که انشاء الله
تعالی بتخریب اماکن و مساکن کفار پردازد و افواج را بتعاقب مقهوران
مقرر دارد بحول قوة الهی و مدد اقبال بادشاهی سید جمال خان بهادر
پسر عضد الدوله کانهو شنقی را در برابر اثر بارها تنبیه نمود لیکن درینوالا

بست وپنجم شہر ربیع الثانی جنگ عظمی واقع شد بفضل الہی فتح عظیم نصیب شد تا آنکہ گروہ کفار راہ گریز پیش انداختند کہ غیر از گریز کار دیگر درمیان نبود - بسیاری تہ تیغ گشتند و بسیاری مجروح گشتند درچنیں وقت کہ ہنگامہ زد و خورد گرم بود شام شد ناچار غازیاں عنان باز داشتند - الحال خبر رسید کہ کانہو بایں حال تباہ بباجی راؤ ملحق شد - اغلب کہ سید جمال خاں بہادر ہم با عضد الدولہ یکجا شدہ باشند و ہر دو بحولہٖ و قوۃٖ الہی و اقبال بادشاہی باتفاق بہ تنبیہ و تادیب باجی راؤ کانہو خواہند پرداخت - برراے اقدس اعلیٰ ظاہر است مہم دکھن و تنبیہ مرہٹہ در عہد حضرت خلد مکان بچہ طول کشیدہ بود سالہا بریں گذشت و افواج و خزاین چہ قدر بر ایں کار صرف شد - الحال فدوی محض بپاس مرضی مقدس چنیں مہم صعب را بایں مصالح قلیل اختیار کرد تا معاندان روسیاہ شوند ہر روز نغمہ سرائیدند کہ فلانی چنین ارادہ دارد - الحال فدوی بایں قسم مہم صعب بموجب حکم مقدس پرداختہ معلوم نیست کہ چہ مے گفتہ باشند فدوی باعتماد فضل الٰہی و احکام و ارشاد اقدس بمحض صادق فدویت بایں کار عمدہ مشغول است آبروے فدوی وابستہ تفضل حضرت است در ہر باب امیدوار تفضل و دستگیری و حمایت بندہ نوازیست زیادہ چہ عرض نماید آفتاب سلطنت و خلافت بر سر فدویان تاباں و درخشاں باد برب العباد -

نور جہاں کا مزار

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے کہتے ہیں یہ آرام گہہ نور جہاں ہے
مدت ہوئی وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے اٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے

جلووں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے اُن کی شبِ دیجور کا عالم

اے حسنِ جہاں سوز! کہاں ہیں وہ شرارے کس باغ کے گل ہو گئے؟ کس عرش کے تارے
کیا بن گئے اب کہکشاں شب تاب وہ سارے؟ ہر شام جھلکتے ہیں جو راوی کے کنارے!

یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے؟
قابل ہی تو تھے عاشقِ دلگیر کے دل کے!

تجھ سی مَلکہ کے لیے یہ بارہ دری ہے غالیچہ سرِ فرش ہے کوئی۔ نہ دری ہے
کیا عالمِ بیچارگی اے تاجوری ہے! دن کو یہیں آرام یہیں شب بسری ہے

ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو۔ مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

تعویذ لحد ہے۔ زبر و زیر۔ یہ اندھیر! یہ دورِ زمانہ کے اُلٹ پھیر! یہ اندھیر!
آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر۔ یہ اندھیر اے گردشِ ایام۔ یہ اندھیر! یہ اندھیر!

ماہِ فلکِ حُسن کو یہ برج ملا ہے
اے چرخ تری بندہ نوازی کا گلا ہے

حسرت ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا اُٹھتے ہیں شرر آہِ شرربار سے کیا کیا

یہ عالم تنہائی - یہ دریا کا کنارا
ہے تجھ کو کسی حسینہ کے لیئے ہو کا نظارا

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر　　آرام لیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپّر　　اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکر
معمور ہے یوں محفل جانانہ کسی کی
آباد رہے گور غریبانہ کسی کی

آراستہ جس کے لیے گلزار و چمن تھے　　جو نازکی میں داغ دہ برگ سمن تھے
جو گل رُخ و گل پیرہن و غنچہ دہن تھے　　شاداب گل تر سے کہیں جن کے بدن تھے
پژمردہ وہ گل دبے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار و خس و خاشاک کے نیچے

رہنے کے لیے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے　　جو پیکر ہستی کے لیے روح رواں تھے
محبوب دل خلق تھے - جاں بخش جہاں تھے　　تھے یوسف ثانی کہ مسیحائے زماں تھے
جو کچھ تھے کبھی تھے مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجر سے پڑے زیر زمیں ہیں

دنیا کا یہ انجام ہے دیکھ اے دل نادان　　ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفن ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ - نہ وہ قصر نہ ایواں　　آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں
ٹوٹا ہوا اک ساحل راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

[illegible]

بھائی کا خط ایک دوسرے بھائی کے نام

عزیز از جان! تمھارا خط جو تم نے اپنی آپا جان کو لکھا تھا، اگست کے "تمدن" میں میری نظر سے گذرا! مجھے تمھارے طرز بیان پر حیرت ہے! "جوش" جیسے مضمون آفریں شخص سے ٹکر کھانا کوئی آسان بات نہیں "بھائی کا خط بہن کے نام" پر ہم سب نے ہی غور کیا، زور ڈالا۔ لکھنا چاہا! لیکن سچ پوچھو تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا! سب سے پہلے زاہدی صاحب نے اظہار خیالات کیا۔ اور جو کچھ لکھا خوب لکھا، بہت خوب لکھا! اب تم بھی پبلک میں آتے ہو، آؤ، مگر دعا ہے کہ خدا تمہیں مخالفت اور اعتراضوں سے بچائے اور اگر ایسا نہیں ہوا تو تمہارے معترض کا جواب دہ میں بنجاؤنگا، اور خود سلٹ لونگا تم کچھ فکر نہ کرو! مگر ہاں ایک بات لحاظ رکھنے کے قابل ہے، وہ یہ کہ آیندہ سے اپنے مضامین پھول وغیرہ میں لکھو کہ نہ عیب جو نظر کا ڈر اور نہ ناکامی کا خطرہ، ہلدی لگی نہ پھٹکری رنگ چوکھا آیا "عصمت" اور "تہذیب نسواں" میں لکھو۔ کیونکہ بے رنگی کے خیالات جب تک طبقۂ نسواں میں نہ پھیلائے جائیں گے اور جب تک وہ قید خانہ سے باہر پردے کی حمایت کرنیوالوں کا ٹیٹوا انہیں پکڑ لیں گی اُس وقت تک ہمارا تمھارا چیخنا فضول، مدعی سست گواہ چست!!

ایک اور بات سن لو، اور سنو ہی نہیں بلکہ سمجھ لو! کیونکہ کوئی غیر اگر اس بات کو پکڑ کر کچھ لکھے گا تو سب سے پہلے تو میں ہی آستینیں چڑھا کر مرنے مارنے کو تیار ہو جاؤنگا! اول تو یہ کہ تم نے "جوش" کا مضمون "بھائی کا خط بہن کے نام" غور سے پڑھا ہی نہیں! کیونکہ جو دلائل اور براہین اس ظالم نے لکھے ہیں اُن پر تم نے کچھ نہ لکھا! یہ بھی جانے دو الو! زاہدی صاحب بھی ان دلائل پر کچھ بحث نہ کر سکے؛ تو پھر تم نے بھی نظر

اندازکیا تو کیا بیجا کیا! افسوس تو یہ ہے کہ تم اور پروفیسر زاہدی - دونوں اس مضمون کا مفہوم نہ سمجھ سکے۔ جو کچھ لکھا ہے نقید، اور جہنم کی تصویر پردہ کو تسلیم کرکے لکھا ہے یعنی انتہائی درجہ کے پردہ کی مخالفت کی ہے۔ حالانکہ جوش صاحب نہ اس کے حامی تھے اور نہ انہوں نے کہیں ظاہر کیا وہ کس معتدل پردہ کی حمایت کرتے ہیں اسپر بحث ہوتی۔

تم نے اپنے مضمون میں یہ ثابت کیا ہے کہ جس پردہ کی حمایت جوش نے کی ہے اسکی نسبت کہنا کہ "اچھا ہوا کہ مذہب کو مسئلہ بحث میں نہیں لئے" اور "نہ وہ منجانب اللہ ہے" وغیرہ وغیرہ منع کرنا ہم کو نہ علم القرآن سے آگاہی، نہ علم حدیث سے واقفیت (اور ہمکو کیا ہم میں سے ایک کو بھی نہیں!) جو کچھ ادہر اُدہر سے سن لیا سنے ہوئے اور گرہ باندہ لیا! پھر اس جلدی کی گرہ پر نسیاری بیٹھنا درست نہیں! اے عزیزم بس لو اور سمجھ لو کہ ایسے بے سوچے سمجھے دعوے کردینا اچھا نہیں اور خصوصاً مذہب کے کسی مسئلہ میں! جو پردہ کہ ہندوستان میں رائج ہے یعنی قید اور جہنم کی تصویر۔ البتہ اس کا ثبوت کلام پاک میں نہیں ملیگا اور نہ وہ حکم خدا ہے - مگر سچ پوچھو تو جوش نے اس پردہ کی حمایت ہی نہیں کی، جس معتدل پردہ کی وہ حمایت کرتے ہیں، اور جن لفظوں سے کرتے ہیں اس کا مطلب مختصراً یہ ہوسکتا ہے کہ شریف عورتیں بزرگوں اور شوہروں کی اجازت سے جایا کریں، اور جہانتک ہوسکے اپنا منہ وغیرہ لوگوں سے چھپایا کریں!

اس کا پہلا حصہ یعنی اجازت لینا تو ادب اور تہذیب کا مقتضا ہے اسکو پردہ سے زیادہ تر تعلق نہیں، رہا آخری حصہ یعنی منہ چھپانا اسکی نسبت خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ "اے پیغمبر! مسلمان عورتوں سے کہدو کہ ..... اپنی زینت کے مقامات کو ظاہر نہ کریں ..... اور اپنے سینوں پر دوپٹے کے بکل مارے رہا کریں" دیکھو پارہ ۱۸ - سورۃ نور رکوع ۴) اس کے علاوہ ایک اور جگہ آنحضرت کی ازدواج مطہرات سے علیحدہ رہنے کا حکم دیتے ہوئے سب لوگوں سے فرماتا ہے کہ "اور جب ان سے کوئی چیز تمہیں مانگنی ہو تو پردہ کے باہر ان سے مانگو - اس سے تمہارے دل ان کی طرف سے خوب پاک صاف رہیں گے اور اسیطرح ان کے دل بھی" (دیکھو پارہ ۲۲

سورۂ احزاب رکوع ۷) پھر آگے چلکر خدائے پاک نے بالکل صاف لفظوں میں حکم دیدیا کہ اے پیغمبر! اپنی بیویوں اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی چادروں کے گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ اس سے غالباً یہ الگ پہچانی جائینگی اور کوئی چھیڑ نگیا نہیں" (پارہ ۲۲ سورۂ احزاب رکوع ۸)

ان آیتوں سے منہ چھپانا تو الگ رہا ایک صاف نکتہ بھی معلوم ہو گیا کہ بالکل آزادی سے بھی میں اشتعال طبع کا خوف ہے جسکو پروردگار عالم نے کیسے معنی خیز اور عمدہ الفاظ میں صاف صاف ادا فرمایا!

اب میرا تمھارا منہ نہیں کہ ایسے ناطق احکام کی موجودگی میں بھی دعوی کریں کہ مرد نیک طبع ہو جائیں تو کچھ بھی نہ ہو گا! گویا ہم اور تم خدا سے زیادہ واقف ہیں! خیر اس کو چھوڑو دو میرا اس سے مطلب یہ ہے کہ مذہب کو کبھی بھولکر بھی معرض بحث میں لانے کی جرأت نہ کرو اور نہ ایسا دعوی ہی کیا کرو! میں تو اس کا لحاظ ہمیشہ رکھتا ہوں!

تم جانتے ہو کہ میں (اور میں ہی نہیں بلکہ ہماری پارٹی کا ہر شخص) پردے کا جانی دشمن ہوں مگر تمھاری "آپا جان" پردہ کی جسم و جان ہیں آئے دن مجھ سے اور اُن سے بحث ہوتی رہتی ہے اور مذکورہ بالا آیتیں بھی اکثر انہوں نے ہی میری تردید میں پڑھی ہیں اور اسی وجہ سے مجھے یاد ہو گئی ہیں ایک دن اثنائے بحث میں ہم لوگوں کی حالت پر بعض طعن کی بوچھاڑ کرتے کرتے تمھاری "آپا جان" نے ایک رباعی پڑھی تھی! چونکہ تھی نہایت اچھی مجھے یاد ہو گئی! تم بھی سن لو:۔

جنکو اس وقت میں اسلام کا دعوی ہے کمال — غور سے دیکھا تو اے ذوق ہے انکا یہ حال
جیسے محفل میں ہنسانے کو مسلمانوں پر — نقل کرتا ہو مسلمان کی کافر نقال

کیا کہوں کہ تمھارے اس خط نے جس کا میں جواب لکھ رہا ہوں تمھاری "آپا جان" کے ساتھ کیا کام کیا! وہ ایسی بگڑیں ایسی بگڑیں کہ الحذر اور بندہ سے! میری جو شامت آئے تو میں بھی کمبخت کا مارا اس وقت گھر میں جا نکلا پھر کیا تھا، جھاڑ کا کانٹا بن کر لپٹ گئیں اور تمھاری تحریر سے کروڑوں اعتراض کر ڈالے کتنے ہی اعتراضوں کا جواب میں نے اچھی طرح دیدیا اور

اور کسی ایک کا مطلب اخبط کر دیا کہ بات کہیں کی کہیں چلی گئی! انکی تقریر تو بڑی طویل تھی مگر میں ان کے بعض بعض اعتراضات تمہیں سنانے کے لیے لکھتا ہوں:-

(۱) اسوقت تک کہ وہ مفید ہو اسکو بھائی جان مانتے ہیں، مگر یہ عجیب بات ہے اگر ایک شخص ایک ایسی چیز کی تعریف کرے جس کا مفید ہونا تسلیم کیا جاچکا ہو، اور پھر اسکی تعریف دوسرا شخص بھی کردے؛ تو کہدیا جائے کہ جسپر تجھے فخر ہے وہ مری تنگ ہے!!

ہاں بھائی جان وہ ننگ ہست سہی، مگر کیوں؟ اس لیے کہ مری سہیلی کا بھائی اسکی تعریف کرتا ہے اسلئے کہ وہ اسپر فخر کرتا ہے یا اس لیے کہ پردہ نہ کرنے والی بقول آپکے ثابت ہو؟

(۲) پردہ دراصل پیوند ہی جائیکہ کہنہ کا، آج اسے اٹھادیں تو فوراً عیب کھل جائیں اس لیے کہ حسن لوازمات کی ضرورت ہے۔ وہ نہدار دہیں "نتیجہ نکلا کہ پردہ کرنا چاہیے" یہ تو فرمائیے کہ لوازمات ضروری بھی تو مہیا کرلیے جاویں یا پہلے ہی سے آب نہ دیدہ موزہ کشیدہ پر عمل کرکے، پردہ اٹھادیا جائیگا جو عیب اسکے اٹھادینے سے کھل جائیں گے وہی تو مانع ہیں! اس لیے تو ہم لوگ پردہ کرتے ہیں۔ خود اس دلیل کے قائل ہوئے یا نہیں؟ ذرا اس بات کا جواب تمھاری آپا جان کو میں کچھ نہ دے سکا!!

(۳) جبتک تعلیم نہو، ہر زن و مرد کو اپنی ذمہ داری کا احساس نہو نہ اخلاق و آداب ٹھیک ہوسکتے ہیں لعزنہ چال چلن درست ہوسکتی ہیں عورتیں گہر سے نکل کر دنیا کو نہیں سمجھ سکتیں" وغیرہ وغیرہ کیا اس لیے پردہ نکرنا چاہیئے۔؟ سبحان اللہ! کیا اچھی کہے ہی! کیا اچھا ثبوت ہے! جب ہی تو کہتے ہیں کہ اندہی تقلید اندھا کردیتی ہے۔

(۴) "پردہ دہوکے کی ٹٹی ہے اور دیکھنے والوں کی آنکھ پر پٹی ہے"، آپکا شاید یہ مطلب ہے کہ دہوکے کی ٹٹی کو توڑ دیں اور مردوں کی آنکھ پر کی پٹی کہولدیں کیوں یہی مطلب ہے نا؟

(۵) "پستی و نکبت کی حد تک ہی" بیشک اسکو شبہ نہیں! مگر سوال یہ ہی: حد ختم ہوگئی یا ختم ہو رہی ہی؟ ہاں شاید جب عورتیں باہر نکلنے لگیں گی تو حد ختم ہوجائیگی۔

(۶) "گہر مرغی کے ڈربے یا کباڑی کی دکان وغیرہ وغیرہ۔ خوب! خوب!! یہاں تو علمیت"

قابلیت، تجربہ سب فیشن کی تقلید پر نثار ہو گئے!! ہمارے گھر اب مرغی کے ڈربے کہے جائیں یا کباڑی کی دکان۔ غرض جو کچھ کہا جائے بجا اور درست! زمانہ سے جو ایسی پوچ اور بیجا باتیں سنوا رہا ہے! کیا نہیں ہیں یہ وہی گھر جنکا نقشہ کھینچتے ہوئے "تمدن عرب" کا مصنف عش عش کرتا ہے! کیا نہیں ہیں یہ وہی گھر جن کی نقل اتارنے کے لیے یورپ والے برسوں قرطبہ اور بغداد کی خاک چھانتے رہے ہیں! مگر اسوقت حکومت تھی، تمول تھا، بے فکری تھی: جو کچھ بناتے تھے دل کھولکر بناتے تھے: سونا۔ اٹھنا بیٹھنا۔ ٹہلنا پھرنا۔ کھانا۔ وغیرہ وغیرہ ہر ایک چیز کے لیے علیحدہ علیحدہ حصے اور پھر ساتھ ہی باغیچہ۔ نہر کنواں باؤلی۔ حوض فوارہ وغیرہ وغیرہ سب کچھ موجود! لیکن اب اگر عزت اور شرافت رکھنی ہے تو خیر اسی میں ہے کہ قلعی چادر ہو آتی بالوں پھیلائی جائیں! باتیں بنانے والے باتیں بنانے میں گریبان اور سچائی سے کوسوں دور ہو جاتے ہیں! اسپر لاقات جانوروں سے بدتر! ابتک تو تفضلا نہیں ہے البتہ اگر یہی کورانہ تقلید ہے تو میرے منہ میں خاک آگے چلکر ضرور ہو جائے گی! رہیں جھونپڑوں میں اور خواب دیکھیں محلوں کا

لباس ہمارے ہاں زیادہ تر پردہ پوشی اور حیا و شرم کا لحاظ رکھکر ایجاد کیا گیا ہے اور جو کچھ اسمیں تھوڑی بہت چٹک مٹک آ گئی ہے وہ ہندوستان جنت نشان کا اثر ہے، ایسا لباس بھلا کیوں سمجھ میں آنے لگا! تو ایسا لباس اچھا ہے جسمیں سے بدن کی جلد جھلک مارتی ہو نرم نرم ہاتھ مونڈھوں تک کھلے رہکر اپنا بھرا بھرا اور گدرا جسم پیش کرتے ہوئے آنکھوں کو سرور دیتے رہیں اب تو ایسے ہی لباس کی ضرورت ہے اور وہی بہترین لباس ہے جس سے ہر وقت آنکھوں کو نور اور دلکو سرور حاصل ہوتا ہے! پہلے زمانہ کے لوگ تو ایسے نظارہ سے اپنے خیالات پر قابو نہیں رہ سکتے تھے اسی وجہ سے ایسی ہوس انگیز اور فتنہ زا باتوں سے دور رہتے ہیں! لیکن اب سردی بڑھتی جاتی ہے، کمزوری عام وبا ہے، نوجوان بڈھوں سے بدتر یا انگریزی کپڑوں کا غلاف چڑھا ہوا ڈھانچ ہیں! ان کے لئے اس جیسے ہزار نظارے

بھی کچھ نہیں! کیا ممکن جو گل محمد اپنی جگہ سے چانول بھر بھی کھسک جائے! اللہ کی شان ہے کہ ہمارے ڈھیلے پائجاموں کے پائنچے اٹھانے پر آوازے کسے جاتے ہیں اور کتا کون ہے جو ایک چھوڑ دو دو گاؤن ـ بھاری بھاری اور زمین پر جھاڑو دینے والے لمبے گاؤن ـ کو اکٹھا کر کے ایک پوٹلی سی بنا کر کولوں کے قریب علانیہ اٹھا کر رستہ چلے! بھاننا کی آواز بری اور سخت بری لیکن اونچی ایڑی کیسی؟ بھدی جوتی یا گھیتلے پر لاکھوں باتیں بنائی جائیں لیکن اس کی وجہ نقصان بھی نہ بیان کر سکے کہ خواہ مخواہ ایڑی کو قطب صاحب کی لاٹھ کی چھوٹی ہمشیرہ کیوں بنا دیا گیا جس سے ہر وقت ڈر ہے کہ پاؤں مڑا اور موچ آئی؟ کندھوں سے کمر تک اور کمر سے گھٹنوں یا ٹخنوں تک دو دو سایوں کے نیچے بدن کو جکڑ لینا لوہے اور چمڑے سے مشکلیں کس دینی سیالس تک آزادی کیا تھی لینے کے قابل نہ رہنا ـ بجا اور بالکل جائز! آزادی کی موجودگی میں سرکس کے شیر دیکھ کر خواہ مخواہ سر سے پاؤں تک کانپ جانا، ڈر جانا سب قابل فخر! لیکن اپنے آبا و اجداد کی جائز رسوم پیر پر رہنے کے قابل! اسی کا نام قومیت ہے؟ ہمارا منہ نہیں کہ ایسی باتیں سمجھتے ساتھ ہی اپنے لباس پر حرف گیری کریں ـ کانسٹی پہلے اپنا ٹوئنٹ نکال لے پھر کسی کی ہتھیلی نکالنے پر آمادہ ہوا ہو

دل عبادت سے چرانا اور جنت کی طلب   کام چور اس کام پر کس منہ سے اجرت کی طلب

(عزیزم سچ کہتا ہوں اس بات پر ہی تمہاری آپا جان نے تتے ہی لے ڈالے تم نے بھی لکھنے میں اپنے اوپر بہت کم نظر رکھی ہے!)

(۷) واہ بھائی جان واہ کتنے اچھے طریقے سے پردہ کی حقیقت سمجھائی ہے مضمون پردہ کے موافق لکھا ہے نتیجہ نکالا و نکالا ہی نہیں بلکہ لکھ دیا کہ "پردہ کرنا چاہیے" "دوسرے نمائندہ اس طرح کی اپنا گھٹنہ کھو لیے اور آپ ہی لاحول مریئے"

(۸) جی ہاں وہ ایسے مذہبی پردہ پر ناز کرتے ہیں، اور کرینگے " نہ وہ گھٹنے کھولیں

اور نہ وہ لاجونتی مریں کیا آپکی اتنی جلد رائے بدل گئی؟ کیا آپ گھونگھٹ کھولکر لاجونتی مرنے پر (خدا نہ کرے) طیار ہیں؟ (یہاں بھی میں مُسَمّم بکم عمی کی تصویر بن گیا)

(۹) خود تو کہہ رہے ہیں کہ "جب قومی کیریکٹر نہیں تو فخر کی جگہ شرم کا مقام ہے" اور اب خود ہی کہہ رہے ہیں کہ "باوجود تعلیم و احساس و قومی کریکٹر ہونے کے گھر سے نکلنا چاہیئے۔ ٹھیک تو ہے ان سب کے ہونے کی شرم مار ہی ڈالے گی آج نہ سہی تو کل سہی اس لیے یہ بہتر ہے کہ آج گھر سے نکلیں اور دوسروں کی نظر ہم پر پڑے اور آج ہی مر جائیں

(۱۰) عورت کو "غنچہ و لاویز" سے مثال دیتے ہیں اور "آبدار موتی" سے تشبیہ دیتے ہیں مگر پھر بھی ضد ہے کہ عورتیں پردہ نہ کریں۔ سوچو تو وہ پردہ کیوں نہ کریں، اگر وہ غنچہ دلاویز ہیں تو تیری میری ہاتھوں میں جا کر مرجھا جائیں گے اور اگر وہ آبدار موتی ہیں تو بھی ناجائز استعمال سے بے آب ہو جائیں گے آپ ہی بتایئے کہ موتی بے آب ہو جائیگا؟ اور کیا پھول نہ مرجھا جائے گا؟

(۱۱) نیچر بتاتی ہے کہ جتنی خوشنما نازک، اور قابل حفاظت و احتیاط چیزیں ہیں وہ سب پردہ میں پیدا ہوتی ہیں، پردہ میں رہتی ہیں، اور اسیوقت تک وہ قابل قدر و قیمت ہیں۔ جہاں پردہ سے باہر نکلیں اور برباد و تباہ ہوئیں مثلاً دماغ انسانی کیسی حفاظت کے ساتھ قید کیا گیا ہے؟ قوت بینائی کس طرح چھپائی گئی کان کے پردے کس پردے میں پوشیدہ ہیں؟ دل کو دیکھئے کتنی محفوظ جگہ ہے؟ اور پھر سب کے آخر میں خدا خود کس قدر ہر جگہ موجود ہو کر اور حاضر رہ کر غائب اور پوشیدہ ہے؟ اب فرمایئے پردہ فطری شے ہے یا نہیں؟ اور اگر نہیں ہے تو کوئی بات خلاف قانون قدرت تو رائج ہو نہیں سکتی، اس لیے دو نتائج نکلے۔ یا تو پردہ فطری شے نہیں ہے یا خلاف قانون قدرت چیزیں رائج ہو سکتی ہیں۔ جواب دیجئے کونسی بات ٹھیک ہے؟ (اس کا جواب میں نے الٹ پلٹ کر دیا تو سہی مگر

ایمان لگتی تو یہ ہے کہ خود میرے دل کو نہیں لگتا تھا۔

(۱۲) بقول ہزہائنس آغا خان کے (حالانکہ انہوں نے اور موقع پر استعمال کیا تھا) "آدھی قوم مردہ ہے" اس لیئے پردہ نکرنا چاہیئے، پردہ نکرنا قوم کی زندگی ہے اور پردہ کرنا قوم کی موت۔ کیوں ہے ٹھیک؟

(۱۳) باہر مردانے میں ایک چھوڑ دو دو خط نقلے اتر سے ہوئے ہیں۔ اندر کوئی بی صاحبہ کسی دوست کی بیوی کے نام سے گھر میں مہمان ہیں، اس سے کیا مطلب؟ آپ چاہتے ہیں کہ عورتیں بھی اسطرح سے کریں؟ کیا اسی کے معنے "حقوق طلبی" میں؟ ہاں یقیناً! کوئی وجہ عورتوں کے پابند رہنے کی نہیں ہے۔ وہ بھی کھلم کھلا اسی طرح سے جس سے، اور جس طرح چاہیں ملیں دونوں کے حق برابر ہیں، اور "حقوق" کا صحیح استعمال یہی ہے! شاباش، مرحبا! انصاف اسی کو کہتے ہیں! البتہ بات صرف یہ پیدا ہوگئی کہ عزت و حیا، انصاف پر سے قربان کرنی پڑی!!

(۱۴) بھائی جان کا تجربہ بالکل ٹھیک ہے بیشک "ان کے (لڑکیوں کے) قویٰ میں عقل میں، توانائی میں۔ ذرا سا فرق نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض بعض بچیاں بچوں سے زیادہ قوی اور فرزانہ ہوتی ہیں بلکہ لڑکیوں کا اٹھان اول اول عام طور پر بڑا ہوتا ہے اور مردوں کی نسبت سن بلوغ کو بھی جلدی پہنچ جاتی ہیں۔"

"مٹھو" جس کا ذکر کرتے ہوئے "ہمیں اب قوت پرواز کیسی طاقت رفتار بھی نہیں ہے" اس لیئے آپکا منشا ہے کہ اسکو چھوڑ دیا جائے اور خالد بلی ہڑپ کر جائیں۔ رائے تو صائب ہے کہ ہمیشہ کی دانتا کل کل سے تو نجات مل جائیگی (دیباں میں یہ غائب تھا!!)

"معیار تہذیب اخلاق کا بڑھانا ہے" یہ سب سے بڑی بات ہے اور بیحد اچھا خیال ہے، مگر تم نے "اگر مگر" میں لاکر اسکی ریڑھ لگادی۔ افسوس تو یہ ہے کہ وہ "اگر" ہی تو نہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر نہ یہ نہ وہ قصہ ختم۔ ۰۰۰

بتقریب تاج پوشی قیصر ہند۔ ہر دو حصہ بجائے (عہ) کے ایک روپیہ کو ملینگے۔

وصل حبیب

ناول نہیں حبیب اداؤں کی ہے تصویر — رنگ اس میں کتنی شوخ طبیعت کا بھر آئے

بس تو ہی جہاں میں میرا فسانہ کیا
کہتی ہے مجھکو خلق خدا غائبانہ کیا

(۱) مولوی سید احمد صاحب ارشد تھانوی ساز بھوپال۔ امید سے کہیں زیادہ اچھا لکھا گیا ہے۔

(۲) پیرجی شبیر علی صاحب از بجنور۔ الحمد للہ کہ وصل حبیب کا حصہ اول حسب مراد زیور طبع سے آراستہ ہو کر نور افزائے چشم مشتاقین ہوا۔ داد کی ضرورت نہیں۔ کہ آپ میں قابلیت خداداد ہے حصہ دوم ابھی تک کیوں مستور ہے اوس کا اشتیاق موفور ہے۔

(۳) مسٹر فدا حسین صاحب سوداگر از ملتان۔ آپکا ناول وصل حبیب نہایت پسند آیا۔

(۴) قاضی عبدالشکور صاحب از دہائی ضلع بلند شہر۔ وصل حبیب کو دیکھکر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔ درحقیقت آپنے اسکو نہایت خوبی کے ساتھ تکمیل کو پہنچایا ہے۔

(۵) مولوی فصیح الدین صاحب از سنبھل مراد آباد۔ وصل حبیب دیکھا۔ ماشاء اللہ آپنے اپنا عزیز وقت صرف کرکے دماغ سے خوب کام لیا ہے جس کی میں داد دیتا ہوں۔

(۶) بابو سرشن لال صاحب سنسند دہلی۔ آپکا وصل حبیب حصہ دوم بھی پہونچا۔ بیشک ناول بہت عمدہ ہے۔

(۷) بابو نبی گوپال صاحب لکشن از حیدرآباد دکن۔ آپکے مرسلہ ناول وصل حبیب کے ہر حصہ کو واقعی نہایت عمدہ طرز پر لکھا گیا ہے۔

(۸) مولوی محمد شعیب صاحب مترجم ترکو توسیا آرہ۔ کتاب (وصل حبیب) کو ترکیہ امید سے زیادہ لطف اوٹھایا عبارت کی سادگی قصہ کی صداقت کا پتہ دے رہی ہے چھوٹے چھوٹے مگر چست و برمحل جملے مصنف کو پوری قابلیت کی شہادت دے رہے ہیں عبارت کا زور اشعار کی ترتیب۔ جملوں کی ترکیب الفاظ کی بندش صاف بتلا رہی ہے کہ مصنف کو مشرقی علوم پر کمال عبور ہے۔ مذکورہ بالا صفات سے اس ناول میں ایک نئی روح پھونک دی ہے ہر ناول کو ایک بار دیکھکر انسان آسودہ ہو جاتا ہے لیکن اس کے پڑھنے والے کو ایک بار میں کیا دس بار میں بھی سیری نہیں ہو سکتی۔ یہ تو مونس تنہائی بن جانے کے قابل ہے

(۹) رسالہ اتحاد اسلام مراد آباد بابت ۔۔۔ ناظرین واقف ہیں کہ ہم مخرب اخلاق ناولوں کے کس حد مخالف ہیں وصل حبیب کو ہم نے نکتہ چین نگاہوں سے جو دیکھا ہمارا خیال تھا کہ موجودہ لغو فسانوں کی طرح یہ بھی ہوگا۔ مگر کس قدر خوشی ہوئی کہ مصنف نے بالکل ہمارے خیال کا جواب اپنی تصنیف میں دیدیا ہے زبان کی سلاست نے تو معدوں میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ غرض ناول بہ حیثیت مجموعی اچھا اور قابل قدر ہے اور ایسے ہی کتابوں کی اشاعت کے ہم مؤید ہیں

(۱۰) حضرت آزادی صاحب مدیر صاحب ۔۔۔ ریاست کشمیر سری نگر۔ وصل حبیب نے ہم کو مشتاق صحیفہ کا گرویدہ و مشتاق بنا دیا ہے اور کوئی حد بیجا

مہتمم کتب خانہ حبیبیہ ڈاک خانہ گوہر گنج ریاست بھوپال

([illegible])

دوم
جلد فروری سنہ ۱۹۱۲ء نمبر

تمدن

معاشرتی - تمدنی - ادبی - فلسفی - اخلاقی - تاریخی - اور علمی مضامین کا
مخزن

ایڈیٹر - شیخ محمد اکرام - محمد عبد الراشد - الخیری

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری
قیمت فی پرچہ ۱۰/ - تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا ۱۳۳۰ھ - قیمت سالانہ قسم اول ۴ روپیہ قسم دوم ۲ روپیہ - کتب خانہ حضرت ابو الظفر حامد میرزا دہلوی

عِصمت

(دہلی)

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کے واسطے عصمت ایک نعمت ہے جس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی صلاح و بہبودی ملحوظ ہے کنواری لڑکیوں کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق ہمنشین عصمت سے بہتر ناصح مصلح کا ملنا ناممکن ہے عصمت ان کو بتلائے گا کہ کنوارپنے کی زندگی ان کو کس طرح گزارنی ہے ماں باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت [illegible] بھی ہے جس نئی دنیا میں ان کو شامل ہونا ہے اس کے لئے انہیں کیا تیاری کرنی ہے۔ جو جو فرض ان پر آئینگے ان کو کس طرح پورا کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔ غرض ان کی آئندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پر لطف با اطمینان بسر کرنے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں بیاہی لڑکیوں کو خانہ داری گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے۔ وہ عصمت ہے عصمت ان کو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے عقلی سے خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے ان کے سپرد کئے ہیں ان کی ذمہ داریاں کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے پل پلا کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے عصمت بتلائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائیگا +

نمائشی تیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانے والا غربت میں کہانیاں سنانے والا مذہب کی وقعت بتانے والا عصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا۔ عصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے ہر رنگ ۶۴ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول موتی ہیں قیمت سالانہ ([illegible])

منیجر عصمت و تمدن

(دہلی)



تمدّن

بنائے ابراہیمؑ

از شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی دہلوی

ہمارے محترم لندن ٹائمز لکھتے ہیں کہ اگر اب بھی ترکوں نے اٹلی سے صلح نہ کی تو (خاکم بدہن وخاکش) اٹلی کے ہوائی جہاز کعبۃ اللہ اور روضۂ اطہر کو مسمار کر دیں گے کعبۃ اللہ کا مختصر جواب تو اس مضمون کے آخر میں ہے اور روضۂ اطہر کے متعلق افسوس کہ ہم اس کے سوا کچھ نہیں لکھ سکتے کہ تاج برطانیہ کو ایسے دلخراش الفاظ پر توجہ کرنی

چار ہزار برس کے لگ بھگ ہونے آئے کہ ابراہیمؑ نے جن کو یہود اور نصارے اور مسلمان کل اہل کتاب یکساں طور پر پیغمبر برحق مانتے ہیں اپنی بیوی ہاجرہ اور فرزند اکبر اسمٰعیلؑ کو جو ہاجرہ کے بطن سے تھے سرزمین مکے میں لا کر بسایا اس وقت شہر مکے کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا سنگلاخ پہاڑی زمین اجاڑ پڑی تھی وہیں باپ بیٹوں نے عبادت کے لیے چار دیواری سے کوٹھے کی طرح لمبوتری جگہ گھیر دی جو کعبہ کہلائی۔ کچھ کم چار ہزار برس کی بات ہے

اس سے سمجھ لو کہ ابراہیمؑ نے کس طرح کعبہ بنایا ہوگا چھت تک نہیں پاٹی۔ مگر خیال کیا کہ ابراہیمؑ جبکہ ہر طرف بت پرستی پھیلی ہوئی تھی۔ بڑی شد و مد کے ساتھ عقیدۂ توحید کے پہلے رواج دینے والے تھے۔ تو کعبہ پہلی اور اکیلی مسجد تھی جو خدا واحد کی عبادت کے لئے بنائی گئی۔ کوئی عمارت اس ترقی کے زمانے میں بھی کیسی ہی مستحکم بنائی جائے آخر کار کبھی نہ کبھی بوسیدہ ہو کر ضرور تجدید یا مرمت کی محتاج ہوگی اور ایسا ہی دیکھا گیا ہے۔ ؎

لہا ملکٌ ینادی کل یوم   لِدوا للموت وابنوا للخراب

یہی حال ابراہیمؑ کے بنائے ہوئے کعبہ کا ہوا کہ جب سے بنا چھ بار اس کی تجدید ہو چکی ہے مرمت اور تحسین تزئین کا تو کچھ شمار نہیں ثبات و قیام عمارت کے لحاظ سے غنیمت ہے کہ حجاز کے علاقے میں جہاں کعبہ ہے برسات نہیں ہوتی۔ یا ہوتی ہے تو بہت کم ورنہ خدا جانے اس عرصہ میں کتنی بار تجدید کرنی پڑتی برسات تو معمول سے نہیں ہوتی مگر پہاڑی نالوں کا سیلاب کبھی کبھی آجاتا تھا تین مرتبہ تو سیلابوں کی وجہ سے کعبے کی تجدید کرنی پڑی ہے دو بار آگ کے لگنے سے مسمار ہو گیا تھا از سر نو بنایا گیا۔ ذیل کے نقشے سے ظاہر ہو جائے گا کہ کب کب کس کس ضرورت سے خانہ کعبہ کی تجدید ہوئی اور کس نے کی۔ بیشک ہر تجدید کے وقت اصل عمارت کی وضع میں بسبب تقاضائے وقت تھوڑی بہت تبدیلی بھی ضرور ہوئی ہے۔ بنائے ابراہیمؑ کی چھت نہ تھی بعد کو چھت پاٹی گئی دیواریں اونچی کی گئیں۔ اندر آنے جانے کا ایک دروازہ تھا ایک کی جگہ دو بنائے گئے ایک آنے ایک جانے کا پھر بعد کی تجدید میں نیا دروازہ مصلحت سمجھ کر بند کر دیا گیا داخلی کا دروازہ سہولت کے لیے زمین دوز تھا بنظر مزید احتیاط چھ فٹ

اونچی کی گئی کہ اب تک پہنچنے کے لیے زینہ لگانا پڑتا ہے رقم کے تھڑ جانے سے
تعمیر ی حطیم کی قدر سے جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ پھر ملا لی گئی یا نکال گئی۔

یہ سب کچھ ہوا بہرحال یہ وہی جگہ ہے جو ابراہیمؑ نے اختیار کی تھی چونکہ کعبہ ابراہیم
کا بنایا ہوا تھا وہی اس کی رفعت و روب بھی کرتے تھے اور وہی کعبے کے حقدار متولی
تھے اور ان کے زمانے میں رفعت و روب کے سوائے کعبہ کا اور کام ہی کیا تھا،
خدا نے ابراہیمؑ کو اور ابراہیمؑ کے بنائے خانۂ خدا کو برکت دی تھی ابراہیم کے
فرزند اسمٰعیل نے قبیلہ بنی جرہم اور اسمٰعیل کے بیٹے ثابت نے بنی خزاعہ میں شادیاں
کیں اور یوں ابراہیمؑ کی نسل بڑھتے بڑھتے بجائے خود ایک بڑا قبیلہ بن گئی
ادھر خانۂ خدا کی برکت سے نسل اسمٰعیل کے علاوہ عرب کے دوسرے قبائل نے دین
ابراہیمؑ کی پیروی اختیار کی اور خانہ کعبہ ایک حساب سے تمام عرب کا معبد قرار پایا
لوگ گروہ گروہ سال کے سال حج اور وقتاً فوقتاً عمرہ کرنے زیارت کعبہ کو آتے
اور ابراہیمؑ کے بتائے ہوئے قاعدے کے مطابق خدائے واحد کی عبادت کر کے لوٹ
جاتے عام مقبولیت کے ساتھ کعبہ کی حرمت یعنی متولیوں کی ذمہ داریاں بڑھتی
گئیں اور ذمہ داریوں کے ساتھ ان کے اقتدارات و اختیارات ذمہ داریوں
میں ذمہ داری زوار کعبہ اور وہ ہزاروں ہی ہوتے تھے اور برس کے بارہ مہینے
انکا تانتا لگا رہتا تھا۔ پانی پلانا (سقایت) اور کھانا کھلانا (رفادت)
مکہ ہمارے ہندوستان کے بڑے شہروں جیسا ہوتا تو چٹکی بجاتے میں
آسانی سے سقایت اور رفادت دونوں کا انتظام ہو سکتا تھا مگر مکہ کا حال
یہ تھا کہ پانی کمیاب اور جو قدرے قلیل تھا بھی کھاری تو لوگ کیا کرتے کہ قسمت سے بارش
ہو گئی تو مینہ کا پانی پتھر کے حوضوں میں جمع کر رکھتے تھے، یا پہاڑی چشموں
سے ڈھو کر لاتے تھے اور چھوہارے یا کشمش اور منقی بھگو کر پینے کے قابل بنا لیتے

تعمیر کعبہ کا نقشہ

کعبہ کتنی دفعہ بنا	کس نے بنایا	کس سنہ میں بنایا	کیوں بنایا	پہلی تعمیر میں کیا تجدید کی
سات دفعہ اول مرتبہ	حضرت ابراہیم علیہ السلام نے	مسیح علیہ السلام سے تقریباً [illegible] برس پہلے	جبکہ پہلی مرتبہ شرک پرستی ہوئی تھی خدای واحد کی عبادت کے لیے مسجد بنائی	صرف چار دیواری بنائی تھی چھت نہ تھی زمین کی سطح سے برابر دروازہ تھا دیوار زمین سے نو ہاتھ اونچی ایک طرف سے تیس اور ایک طرف سے بائیس ہاتھ کا عرض اور طول ایک طرف سے [illegible] اور دوسری طرف سے ۳۲ ہاتھ کا
دوسری مرتبہ	بنی جرہم نے	[illegible]	پہاڑی نالہ کعبہ میں گھس آیا کعبہ ڈھے گیا	کچھ تجدید نہیں کی پہلی ہی بنیاد پر اسی صورت کا بنا دیا اور اتنی ہی بلندی رکھی
تیسری مرتبہ	قبیلہ عمالیق نے	سنہ عیسوی سے تخمیناً سو برس ساڑھے [illegible]	ایک عظیم الشان سیلاب کے صدمہ سے کعبہ جگہ جگہ سے پھٹ گیا۔	اس مرتبہ بھی کسی طرح کی تجدید نہیں ہوئی
چوتھی مرتبہ	قصی بن کلاب نے	سنہ عیسوی سے تخمیناً دو سو برس پہلے	متواتر سیلابوں سے جابجا کعبہ شکستہ ہو گیا	چھتوں کو پاٹ دیا اور حطیم کی طرف سے کچھ عرض کم کر دیا کیونکہ یہاں تک پہونچ کر اس کے پاس کا سرمایہ ختم ہو گیا تھا۔

کعبہ کتنی دفعہ بنا	کس نے بنایا	کس سنہ میں بنا	کیوں بنایا	پہلی تعمیر میں کیا تجدید کی
پانچویں مرتبہ	قریش نے	اس وقت ہمارے پیغمبر صاحب کی عمر ۱۲ برس کی تھی	ایک عورت غلاف کعبہ کو دہونی دے رہی تھی چنگاری اُڑ کر غلاف پر جا پڑی اور اس کے بھڑکنے سے کعبہ جل گیا دیواریں گر پڑیں	دیواریں [illegible] ہاتھ بلند کر دیں چار ہاتھ ایک بالشت کی کرسی دی اور اس کرسی پر دروازہ [illegible] کعبہ کے اندر چھ ستونوں [illegible] صفوں میں کھڑے کیے حطیم کی طرف چھ ہاتھ ایک بالشت زمین [illegible] اندر کے [illegible] سیڑھی لگایا۔
چھٹی مرتبہ	عبد اللہ بن الزبیر نے	سنہ ۶۴ھ میں	عبد اللہ بن الزبیر نے جو پیغمبر صاحب کی پھوپھی بن عبد المطلب و زبیر بن العوام کے بیٹے تھے یزید بن معاویہ کی بیعت انکار کیا اور مدینہ سے مکہ چلے آئے اُسپر یزید کے حکم سے مکہ پر فوج کشی ہوئی لوگوں کے پتھراؤ سے کعبہ میں آگ لگ گئی۔	حطیم کو کعبہ میں داخل کیا شرقی و غربی دروازے آمد و رفت کے لیے دروازے زمین سے ملا رکھے دیواریں ۲۷ ہاتھ اونچی لے گئے چھ ستونوں کی جگہ صرف تین رکھے
ساتویں مرتبہ	حجاج بن یوسف ثقفی نے	سنہ ۷۴ھ میں۔	عبد اللہ بن الزبیر نے حطیم کو کعبہ میں شامل کر لیا تھا حجاج نے اس کو ناپسند کیا اور عبد الملک سے اجازت لے کر حطیم کو پھر کعبہ سے خارج کر دیا	غربی دروازہ بند کیا حطیم کو کعبہ سے خارج کر دیا دروازہ اتنا ہی اونچا کیا جتنا پہلے تھا کعبہ کے اندر سیڑھی لگائی اور اسپر دو روشندان رکھے +

رفاقت سقابت سے بھی زیادہ مشکل تھی کہ اسکو چاہئے صرف [illegible] کہ یہ تو کچھ پیداوار ہوتی نہیں زمین بھی پیداوار کے قابل نہیں [illegible] اس سرزمین کو آباد کرنا چاہا تھا فرماتے ہیں [illegible] بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم [illegible] پڑتا اب بھی ہمارے ہندوستان کے مقابلہ میں وہاں [illegible] کے میں سات سیر کا آٹا سماں ہے اور ہمارے ہاں [illegible] یہاں بھی متواتر کال ہی پڑنے لگے ہیں برسات نہ ہونے [illegible] اور کنوؤں سے بقدر کافی غلہ پیدا ہوتا ہے تو لوگ [illegible] جاتا ہے۔

جس سال عبد اللہ (پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد) کی شادی ہوئی [illegible] ملک عرب پر چاروں طرف آفت کی گھٹا چھائی ہوئی تھی [illegible] لوگوں پر ٹوٹ رہے تھے اگرچہ [illegible] واقعات [illegible] کا دنگل بنا ہوا تھا لیکن ایک واقعہ جس نے عرب کی بنیادوں تک کو ہلا ڈالا اور تمام ملک میں عام طور پر ہل چل ڈالدی یعنی یمن کے حاکم کا [illegible] حملہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

یمن کا حاکم ابرہۃ الاشرم ایک نہایت سخت متعصب عیسائی تھا جس نے مذہبی تعصب کی وجہ سے خانہ کعبہ کی تخریب کا ارادہ کیا اس نے جب دیکھا کہ لوگ موسم حج میں نہایت ذوق شوق سے دور دراز کا سفر طے کرکے جوق جوق خانہ کعبہ میں آتے اور طواف و زیارت سے آتش شوق کو بجھاتے ہیں تو اس کے مذہبی تعصب کی آگ اور بھڑک اٹھی اور خانہ کعبہ کی تعظیم اور اسکے زیادہ جاہ و جلال دیکھ کر آتش حسد پر لوٹنے لگا۔ شہر صنعا میں ایک عظیم الشان گرجا بنایا اور [illegible] کعبہ کو

اسکی زیارت کی تکلیف دی لیکن جب لوگ اس گرجا کی زیارت کو نہ آئے تو ابرہہ غصہ
میں بھر اُٹھا اور ایک خونخوار لشکر کی سرکردگی میں خوفناک اور مہیب ہاتھیوں پر
سوار ہو کر مکہ کی طرف بڑھا مکے کے لگ بھگ پہونچا تو قریش اور کنانہ اور خزاعہ
اور ہذیل کے قبائل سب ملکر لڑنے کو تیار ہوئے لیکن جب انہوں نے ابرہہ
کی فوج سے لڑنے کی طاقت نہیں دیکھی تو اپنے اہل وعیال کو لے کے مکے کی اونچی
اونچی پہاڑیوں پر جا چڑھے۔ عرب بیشک بہادر تھے بڑے بڑے معرکوں میں
بے خوف کود پڑتے تھے خطرناک اور جان جوکھوں کے موقع میں اندھا دھند
گھس جاتے تھے اور جان دے دینا ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی لیکن تو بھی
انہوں نے گوارا نہیں کیا کہ ایسے زبردست اور ڈراؤنی شکل کے جانوروں کے مقابلہ میں
سینہ سپر اور کلہ بکلہ ہو کر لڑیں۔ ابرہہ نے رستے میں سے حمیر کو بطریق سفارت سرداران
قریش کی طرف روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ میں تم لوگوں سے لڑنے کے ارادے سے نہیں بلکہ کعبہ
کے ڈھانے کے لیے آیا ہوں اگر تم لوگ میری مزاحمت کرو گے اور جنگ کی طرف مائل
ہو گے تو میرے پاس بہت سامان جنگ موجود ہے۔ اس گفت وشنید میں دو روز گذر گئے
اور قبائل قریش میں سے کسی کو ابرہہ سے مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی ابرہہ
نے رستہ صاف دیکھا تو جھٹ شہر مکہ میں آ دھمکا قبائل قریش پہلے ہی مکہ کی پہاڑیوں
میں جا چھپے تھے تاہم کعبہ مقدس کی عمارت میں کچھ لوگ اس غرض سے جمع بھی
تھے کہ اگر لشکر یمن کعبہ پر حملہ آور ہوگا تو ہم ایک خونریز جنگ کرکے اپنی جانیں کعبہ پر
قربان کر دیں گے ابرہہ کو معلوم ہوا تو اُس نے اُس روز کعبہ پر دھاوا کرنا مناسب
نہ سمجھا اور آج کے حملہ کو کل کے لیے اٹھا رکھا دوسرے دن کی صبح کو اپنی خونخوار فوج
کو لیکر آگے بڑھا مگر قبل اسکے کہ دھاوے کا حکم دے اسے خیال آیا کہ جو لوگ کعبہ میں موجود ہیں انہیں پیغام
تو پہونچا دیا جائے تاکہ غفلت میں مرکر نہ رہ جائیں۔ چنانچہ اس نے لوگوں سے

دریافت کیا کہ کعبہ کے مجاوروں کا سردار کون ہے سب نے کہا عبد المطلب ابرہہ نے عبد المطلب کو بلایا اور تخلیہ میں گفتگو کی عبد المطلب یہ کہتے ہوئے ابرہہ کی مجلس سے باہر چلے آئے کہ جو اس گھر کا مالک ہے وہی اس گھر کا محافظ بھی ہے مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے گھر کو مخالفوں کی زد سے بچا لیگا اور اپنے گھر کے خادموں کو ذلیل ہونے نہیں دیگا
الغرض ابرہہ لشکر کو لیکر آگے بڑھا اور جب کعبہ کی دیواریں نظر آنے لگیں تو کہا کہ ڈھا دو اور اسکا حکم دیا خدا کا کرنا جوں ہی اسکے لشکر نے خانۂ خدا کی جانب قدم اٹھانے کی نیت کی قدرت الٰہی نمودار ہوئی۔ یعنی بہت سے پرند چھوٹی چھوٹی کنکریاں پنجوں اور چونچوں میں لیے نمودار ہوئے اور لشکر پر کنکریاں برسانے لگے۔ جس پر کنکری پڑتی گولی کا اثر کرتی۔ تھوڑی دیر میں سارا لشکر خدا کے قہر و غضب میں مبتلا ہو کر غارت ہو گیا ظالم اور سنگدل ابرہہ اگرچہ یہاں سے زخمی ہو کر یمن کی طرف بھاگا لیکن اس کا مریض زخم عقوبت کے چنگل سے بچ نہ سکا اور رستہ ہی میں مر گیا۔

ہم نہایت خوشی کا اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے شہر کے مشہور فوٹو گرافر ایچ۔ ای۔ میرزا صاحب نے اپنی متبرک البمینس (اریبین ویوز) طرابلس فنڈ کے واسطے ایک خاص رعایت کی ہے۔
یہ البم دو قسم کی ہیں جنمیں بارہ بارہ فوٹو ۱۲×۱۰ سائز پر مکہ معظمہ۔ عرفات۔ مسجد خیف۔ جنت المعلیٰ خانہ کعبہ۔ دروازہ جسر کا خیمہ جات ترکی۔ مسجد قبا۔ مدینہ منورہ۔ جنت البقیع مقبرہ امیر حمزہؓ۔ روضۂ کے شامل ہیں۔ اور انگریزی خواں حضرات کے لیے ہر فوٹو کے نیچے انگریزی حروف میں عمارت کا نام اور اسکی تصریح ہے دوسری البم جو اردو داں حضرات کے واسطے ہے اسمیں ہر مقدس عمارت کی مفصل تاریخ حاشیہ اور لوح عمارت کے اشعار درج کیا ہر البم کی قیمت بارہ بارہ روپیہ ہے لیکن اب میرزا صاحب بجائے بارہ روپیہ کے نو روپیہ کو دیں گے۔
اور جس قدر اس البم کے ذریعہ سے بکری ہوگی اسمیں سے ۲ فی روپیہ کے حساب سے طرابلس فنڈ میں چندہ دیا جائیگا
امید ہے کہ ناظرین تمدن میرزا صاحب کی حوصلہ افزائی فرما کر طرابلس فنڈ کو تقویت دیں گے +

انقلابِ روزگار

نکلا اُفق پر صبحدم وہ تاجدارِ خاوری — جس کی شعاعوں میں ہم ہر بار ہی جنگِ زرگری
رنگِ شفق ہے جلوہ گر یا شعلۂ رخسارِ اک پری — پُر خوں ہے باوقتِ سحر مینائے چرخِ اخضری
نظروں سے غائب ہوگئے روشن ستارے رات کے
دم بھر میں آخر اُٹھ گئے سامان سارے رات کے

صبح

گلزار ہی اُجڑا ہوا بزمِ طرب برہم ہوئی — شمعِ سحر سرتا بہ پا تصویرِ رنج و غم ہوئی
گلشن سے سوئے آسماں گرمِ سفر شبنم ہوئی — سنبل لبِ آبِ رواں مثلِ صفِ ماتم ہوئی
نکہت چمن میں چار سُو کیسی پریشاں ہوگئی
ہر عندلیبِ خوش گلو گلشن میں نالاں ہوگئی
رخصت ہوا شب کا قمر نکلا ستمگر آفتاب — روشنگرِ دیوار و در ہے شعلہ پیکر آفتاب
بستر سے اُٹھی دھوپ کے آیا ہے سر پر آفتاب — منزل یونہی کرتا ہے طے دنیا میں دن بھر آفتاب
دن رات ہیں شمس و قمر پامالِ جورِ آسماں
گردش میں ہیں شام و سحر پابندِ دورِ آسماں

دوپہر

مغرب کی جانب ہے رواں کشتی مہرِ آتشیں — ساقی نے پھینکا ہے کہاں اپنا یہ چھوٹا سا نگیں
فصلِ خزاں میں زرد ہے یا ایک برگِ یاسمیں — مدفن ہے جس کے واسطے دم بھر میں مغرب کی زمیں
خورشیدِ تاباں کوئی دم میں سرنگوں ہونے کو ہے
اقصائے مغرب میں ہو چکا اس کا خوں ہونے کو ہے

شام

خورشید عالمتاب پر آیا ہے کیا وقت زوال   دھندلی سی آتی ہے نظر گرد و نیہ تصویر ہلال
میدان جل کہ شیر نر صحرا میں ہے آشفتہ حال   گرد اس کے لپٹے ہیں مگر گرگ و سگ و شغال
آنکھوں سے جاری اشک خوں اور دل سے اٹھتا ہے دھواں
آنے لگی کانوں میں آوازِ درائے کارواں

نیرنگیِ باغ جہاں ہر دم ہے تازہ انقلاب   بچپن کا عالم اب کہاں گذرا وہ ہنگام شباب
عہد جوانی ہو چکا پیری میں ہے رنگ خضاب   غفلت کی نیند میں تا کجا ہشیار ہو ای مست خواب
ٹوٹا ہوا ہے بادباں باد مخالف تیز ہے
کشتی ہے گویا نیم جاں اور بحر طوفاں خیز ہے

یارب جہاں میں آسماں جب تک ہے گردش پذیر   خورشید تاباں تا ہے باقی سر چرخ اثیر
روشن زمانے میں ہے تا طلعت ماہ منیر   آنکھوں کا اپنی قوم کی تارا ہو ہر برنا و پیر
چمکے ہمیشہ اوج پر اقبالمندی کا نشاں
روشن رہے علم و ہنر کے نور سے ہندوستاں

مضطرب

راحت زمانی ؎ مولوی سید احمد صاحب کی یہ بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک نہایت سودمند کتاب ہے مصنف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی گئی ہے بیگماتی زبان قلعہ معلی کے محاورے قصہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کئے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا قیمت ایک روپیہ (عہ)

مہر افروز بیگم ؎ یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈھے نہیں ملتی تھی اور اب عصمت ایجنسی نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہے قصہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے قابل مصنف مولوی سید احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے قیمت ۸/

منیجر عصمت تمدن دہلی سے طلب کیجئے۔

مدینہ کی ایک مغنیہ (غرۃ المیلا)

مدینۃ الرسول۔ جسے آستانۂ نبوت ہونے کا افتخار حاصل ہے اور جو جناب رسول اللہ صلعم کے روضۂ اطہر، اور مسجد نبویؐ کے قیام سے تا قیامت مسلمانوں کا کعبۂ آرزو رہے گا، اس کی مقدس آبادی ایک مستحکم شہر پناہ سے محصور ہے، جس کے نیچے نیچے ہر چہار جانب ایک عمیق خندق چلی گئی ہے۔ جیسے سرکار مدینہ خالق کون ومکان کے لاڈلے اور محبوب تھے، ویسے ہی مدینہ کے سواد کو کائنات (گرد و نواح کے عمدہ مناظر) اپنے جھرمٹ میں لیے ہوئے قدرت کا مقرر کردہ پہرہ دے رہے ہیں، اور بزبان حال ہر آئے وصادر کو آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ "ادب سے جاؤ کہ سرکار سو رہے ہیں"

مدینہ کی بستی میں بسنے والے قبائل ٹھیٹھ بدو یا اہل بادیہ نہیں، بلکہ ایسے شائستہ اور سنجیدہ لوگ ہیں جن کے سینہ ودل صدق وصفا سے معمور ہیں۔ روشن ضمیر بھی ہیں، اور صاحب سلیقہ، متمدن اور ہنرمند بھی، ان کی صاف ستھری منزلیں اگر ان کی نفاست پسندی پر داد خواہ ہیں۔ تو ان کی قدرتی سادگی ہزار آرائشی تکلفات، کو مات کرتی ہے،

سیدھی سادی طرز تعمیر کے مکانات، کشادہ صحن، اور خانہ باغ خانہ باغ، میں آذوقہ بہم پہونچانے والے درخت، ہم خرما وہم ثواب کے مصداق۔

یہ صدر اسلام کی بہار تھی، مگر اس زمانہ سے تقریباً نصف صدی ہم آگے نکل آئے ہیں، یزید ابن معاویہ صاحب تخت وتاج ہے، بلاد اسلامی پر

شورش اور طوائف الملوکی نے ہر طرف قدم جما دیے ہیں، گو بہتوں نے اس تازہ شورش سے مدینہ ہی کو خیرباد کہا ہے، مگر مدینہ کی مردم خیزی سو وہاں کی خاص و عام دلچسپیوں پر اس بھگدڑ کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا؟

ان دنوں مدینہ میں ایک مغنیہ عورت رہا کرتی تھی، عزۃ المیلا جس کا نام تھا، اور فن موسیقی میں مہارت نے جس کے نام اور صفت سے حوالی اور مضافات کے لوگوں کے کان بھی پورے طور پر آشنا کر دیے تھے، یہ انصاریوں کی منہ بولی بہن تھی۔ اور سرزمین حجاز کی عورتوں میں سب سے پہلی مغنیہ عورت تھی +

عرب میں افسانہ کہن کی یاد تازہ کرنے کی جو رسم قدیم الایام سے جاری تھی اس میں عزہ اپنی جادو بیانی اور طلاقت کے زور سے ایسے مجیدین میں شمار ہوتی تھی جس کا نام مثال اندیش ہوتا تھا،

اس کی شہرت میں مقبولیت کا جو عنصر شریک تھا اس کے ذمہ دار عزہ کے وہ اوصاف تھے جنھوں نے اسے ایک حد تک محسود خلائق بنا رکھا تھا۔

اس میں حسن اور خلق کی خوبی کے ساتھ ظرافت، خوش مزاجی اور کریم النفسی کا جوہر بھی تھا، اور ایسا کہ مدینہ سے کوئی وارد و صادر ایسا نہ گزرتا جسے عزہ سے ملنے، یا اسے دیکھنے، اور اس کا سامعہ نواز نغمہ سننے کی آرزو نہ ہو،

اگرچہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب فن موسیقی کا شمار عربوں کے یہاں فنون لطیفہ میں تھا، اور نہ اس فن کو عرب اس قابل سمجھتے تھے کہ انجب رد اشراف اسے سیکھیں، باوجود اس کے عزہ اس فن سے لگاؤ رکھتی ہے

اُسی حشم و وقار سے دیکھی جاتی تھی، جس کے مستحق اُس کے اوصاف اور اُس کی وجاہت اُسے ٹھہراتے تھے۔ بلکہ کچھ اُس سے زیادہ ہی، اُسکی مجلس میں لوگ اس ادب اور خاموشی سے آبیٹھتے کہ گویا اُن کے سروں پر طیور اپنے پروں کا سایہ کئے ہوتے ہیں،

شہر مدینہ میں عزہ کا مکان سمت شمال میں آبادی کے سرے پر اُس شاہی راستہ سے متصل واقع تھا، جو شام کو جاتا ہے۔ مکان کے ہر چہار جانب باغ تھا، جس میں انواع و اقسام کے میوہ دار اشجار تھے۔ باغ کے گرد قد آدم احاطہ کی دیوار تھی، اور ایک جانب اندر آمد و رفت کا دروازہ تھا، باغ کے بعض گوشوں میں دو رویہ سایہ دار درختوں کے جھک کر ملنے سے ایک قبہ نما چھت (عریش) سی بن گئی تھی جہاں اونٹوں کا مخزن تھا،

مکانیت یہ تھی، کہ بیچ میں ایک بڑا صوفہ (ہال) جس کے دو طرف غلام گردش اور اس کے بعد تھوڑا صحن چھوٹ کر پردہ کی بلند دیوار جس میں ہر سمت دو دو کھڑکیاں اس کے نیچے تہ خانہ،

بڑا صوفہ عزہ کی نشست گاہ تھا، جس میں چاروں کھونٹ فرش تنا ہوا، اور صدر میں رومی مسند جس پر بڑا تکیہ لگا رہتا تھا،

صحن میں سایہ دار درختوں کے پاس پاس ہونے سے ایک عمدہ فسرتری کا لطف آتا تھا

ربیع الثانی سنہ [illegible] کی آخری تاریخیں ہیں، جو اگست سنہ [illegible] سے مطابق ہیں، اس زمانہ میں دن کو یہاں اس شدت کی گرمی پڑتی سے

کہ "الامان والحفیظ"- ایک روز کا مذکور ہے جب آفتاب قریب بہ غروب آیا، دھوپ ڈھلنے سے گرمی کی شدت و تمازت گئی- تو عزہ بھی نہا دھو اور جوڑا بدل کر تہ خانہ سے برآمد ہوئی، عطر دان منگایا، اور بافراط سے عطر کپڑوں میں ملا، کہ ملبوس اور بدن عطر میں بس گیا،

اس وقت اس کے بدن پر زرد رنگ کی مہین چادر تھی، اور چہرہ پر کالی نقاب، جو کچھ تو گرمی کے خیال، نیز مکان میں کسی مرد ذات کے نہ ہونے سے چہرہ سے ہٹا دی گئی تھی،

عزہ مختلف شغلوں میں رہی کہ اتنے میں عشاء (رات کا کھانا) کا وقت آگیا، تب اس نے پیش خدمت جاریہ کو حکم دیا، کہ مائدہ (دستر خوان) صوفہ کی چاندنی (چھت) پر زیر سما لیجا کر چنے، جس کی تعمیل منہ سے نکلنے کی دیر تھی کہ ہونے لگی،

اس موقعہ پر یہ بتانا غالباً بے موقعہ نہ ہوگا کہ عزہ کا رکھ رکھاؤ بہ طور جیسے امیرانہ تھا، ویسا ہی اس کا دستر خوان بھی وسیع اور پر تکلف ہوتا تھا، اس کے مطبخ کی مثال سخی کی ہانڈی سے ملائی جاتی تھی، جس کے واقعی اور بلا مبالغہ ہونے میں جاننے والوں کا اصرار تھا، امراؤں کے لوازم طبعی سے کے طور پر اسکی طبیعت ہمیشہ کی حد درجہ خوگر ہو گئی تھی، اس لئے ان کی روز بروز اس کی فربہی کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے کر اس کے اپنے بوجھ کو جان کا دوبھر کر رکھا تھا، بہر حال کچھ اپنی خودداری کے نباہ، اور زیادہ ان مجبوریوں (اور ہمارے نزدیک تو ہماری موٹاپے کی وجہ سے) عزہ کہیں آتی جاتی نہ تھی، بلکہ اس کے کمال [illegible] خود اس کے گھر [illegible] دوست آ سکتے تھے، اور اقسام [illegible]

اُس کے لیے، ایک از قسم مال و زر، اور کیا بیش قیمت اشیاء مثل لباس و زیورات کے اسے نذرانہ کے طور بھیجتے تھے، اس بنا پر عزہ امیر نہیں امیروں کی امیر تھی، جو چاندی سی سفید سونے سے زرد، جس کا جوڑ جوڑ جواہرات سے مرصع، اور جس کے بال بال گج موتی تھے

گھر میں ساز و سامان اور اثاثہ کا شمار کیا جائے تو اچھا خاصہ قیمتی اشیاء کا اسٹور (توشہ خانہ) ترتیب دیا سکتا تھا، ایسا نہیں کہ جس میں اشیائی لفاظی اور تراش کی رونق ہوتی ہے، ہوتا ہوتا کچھ بھی نہیں، بلکہ نادر اور نفیس اشیاء کا ایسا مجموعہ کہ الفاظ میں جس سے جان پڑے، اور تراشیدہ دیکھ پائے تو روح تازہ ہو جائے ،،

مگر بایںہمہ عزہ کی مزاجی سادگی، لباس اور آرائش کے ہر طریق سے ظاہر ہوتی تھی اس کی قدرتی زنانہ شان جیسے اس کے جسم کو لباس کے تکلفات سے بری رکھتے ہیں اس کے مذاق کی پختگی کا ثبوت پیش کرتی، ویسی ہی اس کے لعل و جواہر سے معرّے گردن و بازو شوق آرائش سے اس کے استغنا پر گواہ تھے۔ اور ان جملہ شہادتوں کو اس کے ان ثقہ اور صوفیانہ رنگ کے گوشواروں سے قوت پہونچتی تھی، جو اس کی کان کی لوؤں کے نیچے چراغ کی لو کی طرح اجالا پھیلا کر زبان حال کہتے تھے، کہ دعویٰ حسن و برآت کی تصدیق جس کا جی چاہے آئے اور کر جائے ،،

عزہ کے حسن اخلاق، مروت اور سب سے بڑھکر اس کی اصابت رائے نے اس درجہ اشراف مدینہ کے حسن اعتماد کو اس کے ساتھ بڑھا دیا تھا کہ اکثر اُن کے خانگی قضایا ریں وہ شخص ثالث، اور معاملات عروسی

وغیرہ میں تمام قابل دریافت باتوں کیلئے وہ معتمد و اسطہ ٹھہرائی جاتی تھی،

خلاصہ یہ کہ آن کی آن میں جہت پر فرش کر کے کھانا چن دیا گیا، اور باندی نے آکر اس کی اطلاع کی۔ عزہ اوپر جانے کے لیے اُٹھی کہ کسی نووارد کی آواز قدم نے اُس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیا، اور اس نووارد کے سامنے ہوتے ہی عزہ نے (اہلاً وسہلاً ومرحباً) خوش آمدید کہہ کر اوسے لیا،

نئی آنے والی ایک کواری نوعمر خاتون تھی۔ جس کے نازک جسم کو حریر کی سرخ چادر چھپائے ہوئے تھی، اس نازنین کا نام سمیّہ ہے اور یہ مدینہ کے ایک مقتدر شخص کی لڑکی ہے،

تجربہ کار مگر پاک طینت عزہ کو ناتجربہ کار مگر بھولی لڑکی سمیّہ سے قلبی موانست اور دلی رابطہ ہے، اگرچہ اس کی ہر ہر ادا میں شرم اور عفیفانہ غیرت جھلکتی ہے مگر وہ کھل کے جو کچھ بولتی ہے، وہ عزہ سے، اور جن گھڑیوں میں وہ خوش رہتی ہے، وہ وہی گھڑیاں ہیں جو اس کی عزہ کے یہاں گذرتی ہیں،

اس دستور کے مطابق اس وقت بھی اسے شگفتہ ہونا تھا مگر نہیں! اُس کے پھول سے مکھڑے میں دلربائی کی تازہ کشش اس وقت موجود نہیں، جس سے اُس کے آئینۂ ضمیر پر دلی کاوشوں کا غبار پایا جاتا ہے، سمیّہ اور وہی سمیّہ جو اس وقت ہماری میہماں نواز عزہ کے بازو آکر بیٹھ گئی ہے۔ اس کے حسن خداداد میں کوئی ایسی انیلی آن ہم نہیں پاتے ہیں جسے خواہ مخواہ کو بھی فتنہ بپا ٹھہرادیں، اور قیامت کے ہوپچال سے بڑھانے میں بڑھ جائیں۔ مگر ہاں اس نہونے پر

جو کچھ ہے، وہ اُس کی نرگسی آنکھ، اور اُس میں محبت کا رس، عشق کی تڑپ
اُس کی خوشنما بتیسی جس سے آب میں موتیوں کی لڑی شرمائے اور تبسم ناز
کرتے ہوئے جو ہر عقل کے ساتھ برق بلا کا کام کرے، اُس کا قدِ دلجو
رعنائی و دلبری کے نخل کی باثمر شاخ،

غرض اُس غیر معمولی تپاک اور خلوص کے اظہار کے بعد جس سے ہر آنے
والے کی مدارات نہیں کیجاتی) دل کا بھید لانے والی عزہ کی متجسس نظریں
سمیّہ کی پُرشکن پیشانی سے اُس کے دل میں اُتریں، اور نکھری سے نازک
دل پر غبار غم چھایا ہوا دیکھ کر عزہ محبت کے لب و لہجہ میں بولی،

عزہ "سمیّہ! تمھارا آنا میرے سر اور آنکھوں پر، مگر اس آنے پر ہرگز یہ حکم
نہیں لگایا جا سکتا کہ تم غریب عزہ کے لیے سُرورِ قلب اور قرۃ
العین بنکر آئیں، بلکہ تم خود غمگین آئیں، اور اپنے ساتھ تم نے
اپنے دل سے چاہنے والی عزہ کو بھی غمزدہ کردیا، خدا کے لیے
کچھ کہو تو سہی! دشمنوں کو کیا فکر لاحق ہے، اور خلاف معمولی چہرہ
کیوں اُترا ہوا ہے"

اچھا اوپر آؤ، میں خیال کرتی ہوں کہ یثرب کے سرسبز و شاداب مناظر
کی قدرتی دلفریبیاں تمھارے مغموم دل، اور فکرمند دماغ کو بہت جلد اپنی
طرف مائل کرکے انہیں مسرور اور تازہ کردیں گے"

یہ کہتے ہوئے اُس نے سمیّہ کا نازک حنائی ہاتھ پکڑا، اور کوٹھے پر
لےچلی، سیڑھی سے آگے آگے عزہ اور اُس کے پیچھے سمیّہ کوٹھے پر پہونچیں
جہاں پُرتکلف دسترخوان چنا ہوا طیار تھا۔ دونوں جاکر فرش پر بیٹھ گئیں،
مگر عزہ کو اب یہ فکر لگ گیا تھا کہ سمیّہ کے خیالات کدھر پھیرے جائیں

کہ اس کی پریشانی رفع ہو، چنانچہ اُس نے سلسلۂ سخن کا آغاز یوں کیا،

عزہ "پیاری سمیّہ! تم نے کبھی اِدھر بھی غور کیا، دیکھو! فصیل مدینہ کے اطراف بانمت حشیمہ، حوض اور جھاڑیوں کا، دور تک کیا شاداب تختہ نظر آرہا ہے جس کے اختتام پر ایک ٹیلہ اور اُس سے پرے ایک پہاڑ دکھائی دے رہا ہے، یہی کوہ اُحد ہے، جہاں غزوہ اُحد ابتدائے اسلام کا ایک مشہور و درد انگیز معرکہ نبی آخر الزماں صلعم اور سرداران قریش کے درمیان پیش آچکا ہے اور جس میں تقریباً ستر جلیل القدر صحابہ رسول اللہ کام آئے خود حضور رسالت مآب صلعم کے دندان مبارک شہید ہوئے، اور آپ کے عم حضرت حمزہ رضی نے بھی اسی کے میں شہادت پائی۔ یہ واقعہ اس لحاظ سے کہ مسلمانوں کی اُس وقت تک کوئی بڑی جماعت نہیں پیدا ہوئی تھی، اور نہ اُنہیں کوئی قوت حاصل تھی تاکہ اتنے بڑے امتحان میں کسے گئے، مسلمانوں کے لیے بڑا کٹھن مرحلہ تھا، جس کے واقعات سنکر اب بھی جگر دو نیم ہوتا ہے۔

سمیّہ (جو ان واقعات کو بغور سن رہی تھی) اور کیا آپ اس واقعہ کے وقت موجود تھیں؟

عزہ "اس واقعہ کو تقریباً ستر (۷۰) سال ہوئے، میں بھلا اُس وقت کہاں! مری پیدائش اُس سے بہت بعد کی ہے،

عزہ۔ (قریب کے مناظر کی طرف متوجہ ہوکر) دیکھو! جس رُخ پر آفتاب غروب ہوا ہے، اُس کا منظر کیا عجیب و غریب ہے، سامنے والے تالاب کی ساکن سطح آب گویا چاندی کی ایک چمکیلی چادر ہے جو اِدھر سے اُدھر تک پھیلی ہوئی ہے، جس پر تاروں کے عکس سے زرکار بوٹیاں

کڑہی ہوئی معلوم ہوتی ہیں گویا زمین اپنے فیاضی کا ایک سرا کھول کر (تاروں بھری رات میں) آسمان کے گنبد نشان کے مقابلہ میں رکھ کر صاحب نظروں کو دکھا رہی ہے، ادھر پانی میں درختوں کے سایہ گویا جنوں کے پیکر ہیں، جو اپنی ڈراونی شکلیں بنا بنا کر دکھا کر دریا کے کنارے رہنے والوں کو مرعوب کر رہے ہیں۔

شفق اور اس کے انعکاس سے لحظہ بہ لحظہ بدلتا ہوا نقشہ دیکھنے میں سمیہ کچھ ایسی مجبور ہوئی کہ اندھیری چھا گئی اور یہ سارا رنگ بگڑ بگڑ کر کالے پانی میں محض تاروں کی کچھ جھلملاہٹ اور درختوں کے کوہ پیکر عکس کے بجائے اب وہاں کالے خطوط رہ گئے اور وہ بھی بغور دیکھنے سے نظر آتے تھے۔

اتنے میں عزہ دسترخوان کیطرف بیٹھی، اور سمیہ سے شرکت طعام کو کہا۔ جس پر سمیہ بھی بیٹھی، اور دونوں نے کھانا شروع کیا،

خانعالی

راحت زمانی مولوی سید احمد صاحب کی بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک نہایت سود مند کتاب ہے مصنف سے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی گئی ہے بیگماتی زبان قلعہ معلّٰی کے محاورے۔ قصّہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کئے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا قیمت۔ ایک روپیہ (عہ)

لڑکیوں کی انشا، حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبد الراشد صاحب الخیری کی قلم سے نکلے لطف زبان کے واسطے کچھ لکھنا بے سود ہے ہر خط ایسا مؤثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گرتا ہے قیمت ایک روپیہ (عہ) ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھ آنے (۸ر) منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجیے۔

تشنہ لب بچے

آہ پھر یاد آئے پھر دریا ہے آنکھوں سے رواں
وہ زمین کربلا کے چھوٹے چھوٹے میہماں
تین دن تک جو رہے وقف بلائے آسماں

تشنگی میں پھول سے رخسار کملائے ہوئے
جستجوئے آب میں پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے
خشک لب ہیں چہرے پژمردہ ہیں سوکھی ہے زباں

ڈبڈبائے آنکھوں میں آنسو لبوں پر سرد آہ
ہر کسی جانب مگر حسرت بھری ہے اک نگاہ
اشک عارض پر ادھر جاری ادھر پانی رواں

لے رہی ہے نہر موجیں اور یہ ہیں تشنہ کام
ننھے ننھے ہاتھوں میں خالی لئے پھرتے ہیں جام
آنکھوں میں حلقے پڑے ہیں دل میں ہے سوز نہاں

کچھ نفس باقی ہیں خیمہ میں بپا کہرام ہے
معجزہ ہے زندگانی تو برائے نام ہے
تین دن کی پیاس میں جیتے ہیں ایسے بے زباں!!!

مائیں بہلاتی ہیں انکو اور وہ ہیں بیقرار
لاکے دیں پانی کہاں سے کچھ نہیں ہے اختیار
تک رہی ہیں یاس سے بچوں کو اپنے بیبیاں

تپ رہی ہے دھوپ کی شدت سے جنگل کی زمیں
اور اسی جنگل میں ہیں وہ تشنہ لب بچے مکیں
ایک خیمہ ہے فقط اور وہ بھی سورج سے طپاں

گو کہ بچے ہیں مگر دل زندگانی سے ہیں سیر
سامنے میدان اور میدان میں لاشوں کے ڈھیر
جن پہ کوئی رونے والا ہے نہ کوئی نوحہ خواں

جب نظر اٹھی نئی لاش ایک آئی ہے نظر
جب سنی آواز کوئی قتل کی پائی خبر
ہر طرف سامان غم کا ہر طرف غم کا سماں

کوئی بھی باقی نہیں ہے اب عدا کی فوج میں
خون تازہ جوش زن ہے ہر ہوا کی موج میں
جس کی خوشبو سے مہکتا ہے چمن زار جناں

آہ اے بحر اگذار کس طرح یہ تین دن
یہ مصائب یہ بلائیں یہ تحمل اور یہ سن
کون یوں ثابت قدم رہتا ہے وقت امتحاں

کیوں نہ ہو کس نسل سے ہو اے اسیران محن
خون ہی کس کا رگ و پے میں تمہارے جوش زن
نور کس کا ہے تمہارے پاک چہروں سے عیاں

حق ادا ایسا کیا عالم میں کس نے صبر کا
سنگ بنیادی رکھا دنیا میں جس نے صبر کا
کون بجز سبط نبی کشتہ غربت امام انس و جاں

تو نے دیکھا ای زمین کربلا کیونکر یہ حال
میں تو مر جاتا وہیں گر دیکھتا دم بھر یہ حال
شامیوں کے وہ مظالم الحفیظ و الاماں

میرزا احمد ہادی - عزیز - لکھنوی

یاسمین - پروفیسر میرزا احمد سعید صاحب ایم اے مصنف خواب ہستی کا یہ لاجواب دلچسپ نتیجہ خیز ناول اور تمدن ایجنسی کی پہلی کتاب جس کا عرصہ سے ملک کو انتظار تھا تیار ہو گئی ہے یہ کتاب جو درحقیقت حسن و محبت کی زندہ تصویر ہے قابل مصنف نے خصوصیت سے نوجوان طلبا کے واسطے لکھی ہے اور مختلف مضامین پر اس قابلیت سے بحث کی ہے کہ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ یاسمین جو اس تمام قصہ کی جان اور بنگالہ کی ایک مشہور نازنین ہے اسکی زندگی کا ہر ورق فلسفہ حیات کے پیچیدہ مسئلہ کو نہایت خوبی سے حل کر رہا ہے قابل مصنف کا اسم گرامی کتاب کے لاجواب ہونیکی کافی ضمانت ہے قیمت عمر

منیجر عصمت و تمدن - دہلی

کائنات پر ایک نظر

انسانی زندگی بھی ایک عجیب وغریب معمّہ ہے جو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ نیچر کس وضع خاص پر اُس کے چلانے کا ارادہ رکھتا ہے اگر غور کیا جائے تو تنوع طبائع کے تماشے اور گوناگوں امزاج بشری کے نتیجے اسباب کا یقین دلاتے ہیں کہ نیچر خود بے انتہا شوخ طبع ہے جس طرح ایک کی دوسرے سے صورت شکل نہیں ملتی اور حسب اصول علماے سمدرک ہاتھ کی لکیروں تک میں اختلاف ہے اسی طرح فطرت انسانی میں بے انتہا تفاوت ہے اور اوس پر تماشہ یہ کہ نیچر سب طبیعتوں سے کام ایک کرانا چاہتا ہے۔ عالم ایجاد بہ اعتبار تمدن ایک چیز ہے جس میں تغیر طبائع کو کم دخل ہے۔ ہمدردی، محبت، الفت، صلۂ رحم، سچائی، دیانت یہ وہ سب باتیں ہیں جو تمدن کی جان ہیں اور تا وقتیکہ ہمارا مقصد ترقی یہ نہ قرار پائے، ہم عالم ایجاد میں گویا ایک عضو بیکار ہیں۔ مذہب اور تمدن ایک چیز ہیں اس لیے مذہب وہی تعلیم دیتا ہے جو مقتضائے تمدن ہے۔ مذہب ہم کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو اصول فطرت کے مطابق ہیں قطع نظر اس امر سے کہ طبائع مختلف ہیں یا نہیں۔ ایک تنگ سینہ سے یہ امید رکھنا کہ وہ حوصلہ مند، وسیع خیال، اور جرأت آزما ثابت ہو یا ایک لاابالی سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عاقل اور سمجھدار ہو یا ایک چھوٹی آنکھ سے فراخ دلی سخاوت عالی ظرفی چاہنا بہت وقت طلب بات معلوم ہوتی ہے مگر پھر مذہب کیوں سب کو ایک سبق دے رہا ہے اور سب سے

ایک بات کا امیدوار ہے؟ - پھر اگر کوئی پابند مذہب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو ایک واعظ اُسکو یوں تسکین دیتا ہے کہ دنیا دار الجزا نہیں، یہاں تو ہمیشہ نیک کام کرنے والوں کو ایذا رہتی ہے اور بُرے اعمال والے خوش رہتے ہیں - کیا اس کی علت یہ نہیں ہے کہ آدمی حسن فطرت پر مجبور ہوا ہے اُس کے خلاف چلایا جاتا ہے اور اِسی سبب سے وہ کسی طرف کا نہیں رہتا؟ اگر دنیا دار یا بالفاظ دیگر گناہگار اس اصول کے مطابق آخرت میں مستوجب سزا ہوں گے اور ہم اپنے اعمال نیک کی وجہ سے یہاں کے مصائب اور تکالیف کا عوض وُہاں حور و قصور شراب و کباب کی شکل میں پاویں گے تو فرق کیا ہوا یہی نا کہ جو باتیں اُن لوگوں نے یہاں کی ہیں ہم وہاں کریں گے اُنہوں نے یہاں گناہ کیا ہم وہاں کریں گے؟ - یہ خیال اور یقین کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ جو لوگ بد ہیں وہ دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں اور یہ کہ انصاف اِس دنیا میں نہیں ہوسکتا دینیات جس کو ہم نے مذہب قرار دیا ہے اگر یہ سبق دیتی ہے تو بالکل ناکمل ہے اور صرف ظاہری نمود میں ترقی کی سبب ہے — اِس قسم کے شبہات اکثر پیدا ہوتے ہیں لیکن قانون مکافات پر غور کرنے سے جس سے اکثر فلاسفرز اس مسئلہ کو حل کرنا چاہتے ہیں، معلوم ہو جاوے گا کہ اُس کے اصول اس کے ساتھ منطبق نہیں ہوسکتے - امرسن لکھتا ہے کہ قدرت کے ہر حصّہ میں اضداد جمع ہیں تاریکی و ظلمت میں حرارت و برودت میں، مد و جزر میں، نباتات و حیوانات کے تنفس میں کہ ہوا کو اندر یا باہر کھینچتے ہیں، جسم حیوانی میں، خون کی مقدار و کمیت میں، دل کے قبض و بسط میں، مایعات کے گھٹاؤ بڑھاؤ میں، حرکت دوری کے مائل المرکز اور رافع المرکز کششوں میں، قوت کہربائی اور ربط کیمیائی میں، ایک جگہہ کو

خالی کرنا دوسری جگہ کو بھرنا ہے۔ غرضکہ اس دوئی نے کارخانہ عالم کی تنصیف
کر رکھی ہے اس طرح پر کہ ہر شے نصف ہے اور اپنے دوسرے نصف
کے طرف ذہن کو منتقل کرتی ہے۔ تاکہ ملکر ایک ہوجائے جیسے روح و مادّہ،
ذہنی و خارجی، طاق و جفت، اوپر نیچے، حرکت و سکون، ہاں اور نہیں
جب کہ کل عالم میں دُوئی ہے تو یہ دوئی اُس کے ہر جز و میں ہے کل
نظام اشیائے ہر ذرہ میں پیدا ہے عورت مرد میں، پانی کے اتار چڑھاؤ
میں، شب و روز کے تغیر و تبدل میں، عناصر عالم میں جو رد و عمل ہوتا رہتا
ہے وہ تمام خفیف سی خفیف مخلوق کے مختصر حدود میں بھی پیدا ہوتا ہے۔
قوائے جسم تعقیل کے اصول میں دیکھئے جو کچھ قوت ہم حاصل کرتے ہیں۔
اُسیقدر وقت ضائع کرتے ہیں، زمین جہاں غلہ نہیں پیدا ہوتا بخاروں
اور مُہلک جانوروں سے پاک ہوتی ہے۔ سرد ملک میں جہاں اور عیب
ہیں یہ ایک وصف بھی ہے کہ جسم کو قوی کرتا ہے — غرضکہ دوئی انسان
کی فطرت میں بھی اُسیطرح پنہاں ہے۔ ہر لذت کے ساتھ کلفت، ہر مصیبت
کے ساتھ راحت لازمی نتیجہ اصول مکافات کا ہے اور اس لیئے اگر ہم
بنا بر علیہ یہاں کے عیش و تنعم سے لطف اُٹھانے والوں کے لیئے
تکلیف آخرت اور یہاں کے غربا اور مصائب اُٹھانے والوں کے
لیے راحت عقبےٰ عوض قرار دیں تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ مگر اس صورت پر
بہت سے اعتراض پیدا ہوتے ہیں جس سے اصول مکافات میں بہت بڑا
رخنہ پڑجائے گا۔ اس لیئے معاد کو چھوڑ کر اور اُس عالم کو حیطہ اصول
مکافات سے خارج کر کے دیکھتے ہیں تو بیشک ہم کو اصول مکافات
کا قانون بہت زبردست قانون ماننا پڑے گا اور ہر قدم میں اُس کا

جلوہ نظر آئے گا۔ ہر وہ امیر جو اپنے محلول میں تمام اسباب آرایش ولذت کے ساتھ بیفکری سے زندگی بسر کر رہا ہے ایک جھونپڑے میں رہنے والے آدمی کے لیے بیشک قابل رشک ہے لیکن اُسی کے ساتھ اصول مکافات کی حقیقت پر نگاہ کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اوس دولت مند کو ان تمام اسباب معیشت کے عوض میں کیا کیا چیزیں اور کس قدر دینی پڑی ہیں اور طمانیت قلب اور اوصاف حمیدہ جو باعتبار تمدن ہر شخص میں ہونا چاہیے اُس کے پاس سے کم ہیں کیسی نوبت ہے اگر ظاہری اسباب معیشت کو کھویا ہے تو اُس کے پاس اس کے عوض میں سلامتی ضمیر طمانیت دل اور سیکڑوں سامان ملا ہے۔ اب ہم انہیں اصول کی رُو سے طبائع مختلفہ کو دیکھیں تو معلوم ہو جائیگا کہ فی المعنی ہر شخص معاون تمدن ہے۔ ایک متنفس اگر باعتبار اپنے جبلت کے جرأت آزما دلیر اور شجاع نہیں ہے اور اس صورت سے وہ تمدن عالم کے ایک حصہ میں عضو بیکار رہے تو اُسی کے ساتھ اب یہ بھی سمجھ لیں کہ اُس میں جبر و تعدی ظلم و زیادتی کی بھی قوت نہیں ہے اور اور اس لیے اگر ایک جری آدمی تمدن کے ایک حصہ کو قوت دیتا ہے تو دوسرا دوسری حیثیت سے معاون ہے۔ اگر ایک عقلمند آدمی دوسروں کے لیے نفع رساں ہو سکتا ہے تو اُسی کے ساتھ بیوقوف آدمی میں دوسرے کو نقصان پہونچانے کا مادہ نہیں ہے اگر ایک اپنی سخاوت اور عالی ظرفی سے عالم امکان میں ایک جزو ضروری بنا ہوا ہے تو دوسرا اپنی منتظمانہ اصول سے کچھ کم موید نہیں ہے۔ اس لیے کوئی شخص نظر بوضع فطرت و جبلت مسئول نہیں ہو سکتا کیونکہ جس سے جو کام ایسی اضطراری حالت میں ہوئے ہیں اُن پر وہ قادر نہ تھا اور ایسے کام سے باز پرس

Sacred Sorrows

ہونا صلاحیت عقل و انصاف ہے۔ مگر وہ چیز جس نے آدمی کو ذمہ دار بنایا ہے
بدل مکافات سے جدا ہے اور اُسی پر اعتبار کر کے صلے دیے ہوگی۔ آدمی
کے کسی فطرت خاص پر مجبول ہونے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ مجبور محض ہے
اور اس کے پاس ارادہ نفسی بھی نہیں ہے۔ انسان کی فطرت چاہے کچھ
ہو مگر اس کے ساتھ اس کو قوت ارادی یہ رہبری ضمیر عطا کی گئی ہے جس کا منشا
ہمیشہ یہی ہے کہ یہ قواے نفسانی پر جو جبلاً انسانی وضع میں ودیعت ہیں غالب
آسکے اور یہ خاصکر اس حالت میں جبکہ ضمیر ایک کسبی چیز ہے کسبی اس معنے
کر کہ اس کا حصول مدارج اور امتحانات کے اعتبار سے وہبی نہیں ہے بلکہ
سعی اور کوشش سے پایا جاتا ہے اور اسی سبب سے اگر کوئی شخص باعتبار
کمزوری ضمیر نظام تمدن میں مخل انداز ہے تو یہ اُس کا ذاتی قصور ہے جس کو
فطرت اور جبلت انسانی سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ کہنا کہ ضمیر ہمیشہ نظام
کائنات کے موافق ہو کر چلتا ہے خلاف واقعہ ہے کیونکہ ایسے
افراد انسان موجود ہیں جو یا تو بالکل ضمیر نہیں رکھتے یا اگر رکھتے بھی ہیں تو پورے
معنے ضمیر کے اُس پر صادق نہیں آتے اور اس لیے ایسے لوگ جنھوں
نے کسب ضمیر نہیں کیا یا کسب ضمیر کے بعد اسکو بالکل محو کر دیا ہے اخلاقی
مجرم ہیں خواہ وہ فطرتاً کسی امر خاص کے اوپر مجبول ہوئے ہوں اور
یہیں سے تقدیر کے مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ تقدیر کی نسبت
اعتقاد رکھنے والے تین جدا اعتقاد رکھنے والے گروہ ہیں۔ ایک
انسان کو مختار کل سمجھتا ہے اور دوسرا مجبور محض تیسرا گروہ وہ ہے
جو بین الاختیار والجبر ہے۔ اختیار کا عقیدہ سب سے پہلے جس شخص کے
ذہن میں آیا یا بالفاظ دیگر باعتبار وسعت تمدن اس مسئلہ پر غور کرنے کی

مزدرت ہوئی وہ معبد جہنی تھا جو اعتزال کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ جبریہ عقیدہ اُن لوگوں کا ہوا جنھوں نے بلا سوچے سمجھے اختلافات معتزلہ پر کمر باندھ لی اور تعصب نے اُن کے آنکھوں پر پردے ڈال دیئے۔ فقہائے اسلام نے بہت چھان بین اور غور و تعمق کے بعد ایک بین بین حالت اختیار کی۔ غور کرنے سے خود معلوم ہو سکتا ہے کہ کون سا مسلک موافق فطرت ہے یا کوئی بھی نہیں۔ ان تینوں گروہ میں سے اُس فرقہ کو تو خارج کیجئے جو بالکل اپنی کو مجبور محض سمجھتے ہیں کیونکہ سب سے رکیک اور قوانین قدرت کے منافی یہی مسلک ہے اور اس لیے اب صرف دو باقی فرقے رہ گئے ہیں جو فطرت عالم کے پہلو بہ پہلو چلتے نظر آتے ہیں۔ انسان کو مختار ماننا گو ذات باری تعالیٰ کی شان تنزیہ کی رعایت پر مبنی ہے مگر اسی کے ساتھ تھوڑی سی انانیت اور تکبر کی بو آتی ہے جو اگر بڑھ گئی اور یقینی بڑھے گی تو انتظام کائنات میں تخریب کا باعث ہوگی اور روابط تمدن میں کمزوری پیدا ہو جائیگی جو مقتضائے نیچر کے خلاف ہے۔ اس لیے علمائے اسلام نے جو حالت بین بین رکھی ہے وہ نہایت ہی پاکیزہ اور مستحکم اصول پر قایم ہے اگر گروہ معتزلہ مسئلہ اختیار میں زیادہ غلو سے کام نہ لیں تو اُن کو خود بعض اوقات ماننا پڑے گا کہ کوئی چیز ایسی بھی ہے جو ہمارے ارادوں میں، ہمارے قوانین تمدن کے اصول، ہمارے سمجھے ہوئے عالم اسباب پر حکمراں ہے اور وہ آناً فاناً بدل سکتی ہے مگر تاہم معتزلہ ہمارے بھائی ہیں اور ہمارے معتقدات کے ایک جزو کے موید ہیں۔ امام فخر الدین رازی "تفسیر کبیر" میں لکھتے ہیں قال الامام ابو القاسم الانصاری سئل عن تکفیر المعتزلۃ فقال لا لانہم

نہ ہو۔ فسئل عن اھل السنۃ فقال لالا ھم عظموہ یعنے …
امام ابوالقاسم انصاری سے سوال کیا گیا کہ کیا معتزلہ کافر ہیں تو … کہا
نہیں کیونکہ انہوں نے ذات باری کی تنزیہ کی ہے پھر اہل سنت کی
سوال ہوا تو آپنے جواب دیا کہ وہ بھی نہیں کیونکہ انہوں نے اس کی
عظمت وجلال کا خیال رکھا ہے۔ اور پھر آگے چل کے امام …
نے فرقہ اہل سنت کو ترجیح دی ہے

تعلیم الٰہی یہ کہتی ہے کہ ہر ایک قسمت کا حال لوح محفوظ میں …
ہے اور اس کے خلاف ہرگز …
نباتات، جمادات، غرضکہ … حال منقش ہو لیا ہے …
تحریر کے مطابق ظہور میں آیگا جف القلم بما ھو کائن …
معنے یہ نہیں ہیں جیسا کہ عوام سمجھے ہوئے ہیں یا بادی النظر میں …
ہوتے ہیں۔ کیونکہ قلم سے مراد نہ یہ دنیاوی قلم ہے جس سے …
کرتے ہیں اور نہ لوح سے مراد وہ تختی ہے جس پر بچے مشق کیا کرتے ہیں بلکہ قلم
اور لوح سے مراد قوانین قدرت ہیں جن کا دوسرا نام علم الٰہی ہے۔ جو علم الٰہی
ہے وہی قانون قدرت ہے اور جو قانون قدرت ہے وہی تقدیر …
علت ومعلول سبب ومسبب میں جو رشتہ قایم کر دیا گیا ہے یہی تقدیر ہے
جس میں تغیر وتبدل ممکن نہیں اور یہی مطلب ہے۔ لا تبدیل لخلق اللہ
کا اور یہی اشارہ ہے لفظ محفوظ کا جو لوح کے ساتھ مضمر ہے۔ …
اور آگ کا جلا دینا ہے پس گویا یہ ایک تقدیر ہوگئی جب کوئی …
مرجائیگا، آگ میں کودے گا جل جائے گا۔ اسی طرح ہر ذرہ …
اصول فطرت طاری اور ساری ہیں جن پر نظام عالم کا مدار ہے …

[illegible] والا کسی کو قتل کرکے پھانسی پر لٹکنے والا مجرم اپنے مصائب کا الزام [illegible] نہیں کہہ سکتا کہ اوس نے ایسا کیا میری تقدیر میں یہی لکھا تھا نہیں بلکہ اس نے خود قوانین قدرت سے اس بات کی استدعا کی کہ مجھکو قید کرا دو، مجھکو پھانسی پر لٹکا دو اگر وہ خود علت اور سبب نہ ہوتا اور اپنے ضمیر سے کام لیتا تو ہرگز اس آفت میں مبتلا نہ ہوتا - کوئی قوم نہیں بگڑتی تا وقتیکہ وہ خود اپنے تئیں نہ خراب کرے کیا مطلب رکھتا ہے یہی کہ جتبک نظام عالم اور ترتیب تمدن کے اصول میں انحراف نہ کیا جائیگا ہمیشہ سرسبز شاداب رہیگی لیکن جب اس کا لحاظ اور خیال ترک کر دیا جائیگا تو [illegible] کا [illegible] شروع کر دے گی جس پر ہم الزام رکھا کرتے [illegible]

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا
الْفَاسِقِينَ الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ
وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ
فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝

اللہ [illegible] انہی کو گمراہ کرتا ہے جو نقض عہد کرتے ہیں اور احکام الٰہی کے خلاف کرکے باعث فساد ہوتے ہیں - اب اس سے زیادہ [illegible] الفاظ حقیقت انسانی کی نسبت ہوسکتے ہیں - تاریخ کے صفحات ہمارے سامنے موجود ہیں اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ خاندان عباسیہ بنو امیہ صفویہ مغلیہ کی شان و شوکت کے زوال کا باعث کیا ہوا جبتک [illegible] اصول کا [illegible] کے [illegible] نظر رکھا اور اپنی تمدنی حالت درست رکھی کوئی زوال و انحطاط نہیں شروع ہوا، لیکن جب انہوں نے

خلاف ورزی قانون قدرت کرنا شروع کیا تو لگے تباہ و برباد ہونے جو لازمی نتیجہ تھا اُن کے افعال کا۔ ان سب قدرتی جکڑبندیوں کے ساتھ یہ نہیں کہ ہم بالکل اندھوں کی طرح چھوڑ دیے گئے ہیں بلکہ ہم کو ایک رہنما ایک چراغ روشن ہی دیا گیا ہے جس کو عقل یا ضمیر کہتے ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم اُس سے کام لیں نیک و بد میں تمیز کر سکیں ورنہ اگر آدمی باعتبار اپنی جبلت کے مجبور محض ہوتا تو اُس کے اعمال سے باز پرس خلاف دانشمندی اور انصاف تھا مگر نتیجہ جانتا ہے کہ اگر آدمی انسانیت سے کام لے تو اپنی جبلت اور جذبات خلقی کو بدل سکتا ہے۔ شیر اور چیتا وغیرہ درندے ہیں جن کی جبلت میں درندگی اور خونخواری اور بے رحمی ہے لیکن جب وہ پال لیے جاتے اور اچھی طرح ہل جاتے ہیں تو ویسے ہی حلیم اور بے ضرر ہو جاتے ہیں جیسے اور معمولی جانور اُن کی درندگی اُن کی ابتدا ہی جو فطرت میں تھی بالکل بدل گئی اور وہ صرف اس سبب سے کہ وہ شروع سے جبلت کے خلاف چلنے کے عادی بنا دیے گئے۔

فلاتیمون بہت بڑا حکیم تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ وہ محض ترکیب اعضا اور ساخت جسمانی سے اخلاقی حالت بخوبی پہچان سکتا ہے بقراط کے شاگردوں نے اُس کا امتحان لینا چاہا اور ایک تصویر اپنے اوستاد بقراط کی ہو بہو کھینچ کر فلاتیمون کے پاس لے گئے فلیمون نے دیکھ کر کہا کہ جس شخص کی یہ تصویر ہے وہ بڑا زانی ہے [illegible] بقراط [illegible] [illegible]

بقراط کے پاس واپس گئے اُس سے سارا قصہ بیان کیا، اُس نے کہا بیشک
میں زنا پر بہت حریص ہوں مگر میں نے اپنے قوائے عقل سے اُس کو دبا
رکھا ہے اور کبھی اپنی جبلی نقص کو نمایاں نہیں ہونے دیتا۔ علاوہ اس کے
اور مشاہدات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر انسان کسب ضمیر کرے
اور پھر اُس ضمیر سے کام لے تو بہت کچھ کام اپنی فطرت کے خلاف کر سکتا
ہے اور اسی اصول پر نظر رکھ کر معاد کا انتظام رکھا گیا ہے ورنہ ہرگز
انسان سے کوئی سوال نہ ہوتا اور نہ کوئی باز پرس کی گنجائش تھی
غرضکہ انسان کسی طرح اپنے کو اس الزام سے نہیں بری کر سکتا کہ اُس نے
اپنی عقل اور ضمیر سے کیوں کام نہیں لیا جب کہ اُس کے لئے ایک
کھلا ہوا راستہ ترقی تمدن اور کسب معیشت کا موجود ہے۔ جاہل ہیں وہ
لوگ جو ہر بات میں تقدیر پر الزام رکھتے ہیں۔ کاہل ہیں وہ جو محض تقدیر
کے بھروسہ پر کوئی کام نہیں کرنا چاہتے یا وہ کہیں کہ اگر انہوں نے کوئی
کام نہیں کیا تو تقدیر ہمیشہ اُن کو ذلیل و خوار رکھے گی کبھی کبھی ایسا
ہوتا ہے کہ ہماری تدابیر کارگر نہیں ہوتیں اور باوجود سعی و کوشش ہمیں ناکامیابی
ہوتی ہے لیکن اسکو دیکھ کے بجائے اس کے کہ ہم تدابیر کرنا چھوڑ دیں اور
بالکل تقدیر پر بیٹھ رہیں، اللہ کی قوت و برتری اور حکمت بالغہ کا قائل ہونا
چاہیے اور یہیں سے انسانی مجبوریت ظاہر ہوتی ہے بقول شخصے
الله بعرف بفسخ العزائم - سچ ہے ایک قوت برتر ہمارے اوپر اور ہے
جو ہمارے ارادوں، ہمارے خیالات پر حکمراں ہے کہ جدھر چاہے
پھیرے وَھٰذا ما قلت دلی برلی

(نیاز محمد خاں نیاز فتحپوری -)

نامۂ یار

ہے جگر کو تجھ سے تسکیں | مرے [illegible] تجھ سے [illegible]
تجھے دل میں اپنے رکھوں | کہ جگر میں اپنے رکھوں
ہے اگرچہ تجھ میں [illegible] | تو ذرا سا ایک پرزہ
نہیں پر ترے برابر | کوئی چیز [illegible]
تو ہی درد کی دوا ہے | تو ہی [illegible] دل کا مرہم
تو ہی راحت کی ہے صورت | تو سکون قلب محزوں
ہوئی تجھ سے آنکھ روشن | ہے دماغ تجھ سے فرحاں
ہوں نثار میں سراپا تو | کوئی سحر ہے کہ افسوں
یہ ہے آنکھوں کا تقاضا | کہ لگی رہیں تجھی پر
تجھے کس طرح میں پھاڑوں | تجھے کس طرح میں پھینکوں
تو شریک دشت فرقت | تو ہی غمگسار غربت
بھلا کس طرح ہے ممکن | کہ تجھے جدا میں کردوں
مجھے کب یہ ہے گوارا | کوئی غیر تجھکو دیکھے
وہ نہ تیری بو بھی پائیں | تجھے ایسی جا چھپاؤں
ہے کشش غضب کی تجھ میں | ہے غضب کی تجھ میں قوت
لیا صبر بھی سکوں بھی | کیا وہم میں مجھکو مجنوں
یہی اب مری دعا ہے | یہی میری آرزو ہے
لکھا جس نے ہے یہ نامہ | اسے اک نظر تو دیکھوں

[illegible]

کلیوپیٹرا

(دلی میں ایک ملاقات کی یاد)

کلیوپیٹرا مصر قدیم کی وہ پرناز و محتشم ملکہ جس رات بہت مغلوب ملال ہوتی، تو اپنا دل بہلانے کے لیے، اپنے مشتاق اور عاشق قیدیوں میں سے ایک کو بلا کر، اپنے تمام لطفوں کے ساتھ (جو عورت ہی دے سکتی ہے، اور وہ اس طرح کہ احمق مرد پر ظاہر کرے کہ وہ اسے چاہتی ہے) اسے مست و مدہوش کرتی، اور پھر گویا وہ یہ جانتی تھی کہ ایسی مسرت دار رات کے بعد اس قیدی کو اس سے جدا ہو کر زندہ رہنا بہت مشکل ہوگا۔ اپنے ہاتھ سے یہ کہکر "میری خاطر خوشی خوشی پیو گے نا؟" زہر کا پیالہ پلا دیتی۔

آہ، میں بھی تیرا قیدی ہو جاؤں، اے دلربا! تجھے بھڑک دار [illegible] میں، موٹر کاروں میں ناز و انداز سے بیٹھے دیکھ کر تیری نگاہ التفات کی ایک شعاع جو اتفاقاً مجھ پر پڑ جاتی ہے مجھے غرق مسرت کرتی ہے۔ میری روح کی بے تابانہ جذاب میں، ایک [illegible]

تو میرے لیے اتنی دور ہے، اتنی اونچی ہے کہ کلیوپیٹرا کی طرح دور ہے اونچی ہے۔ اتنی اونچی ہے کہ میری امیدیں بھی وہاں تک نہیں پہونچ سکتیں، تجھ تک ان کی رسائی نہیں۔

اس چکور کی مانند [illegible]
پہونچنے کے لیے اپنے سینے طاقت [illegible]

گرپڑتی ہے، میری نظریں بھی، اس اشتیاق میں اُٹھتی ہیں کہ تیری ایک نظر سے میں گو وہ بیگانہ ہی ہو، ایک مسکراہٹ کو دیکھیں گو وہ کسی دوسرے کے لیے ہی ہونٹوں پر آئی ہو، تری نظر کے ایک تار نور سے گرم ہوں گو وہ گریزاں ہی ہو، وہ تجھ تک جاتی ہیں اور صرف ان بالوں میں جو مصر کی ناز و انداز بھری ملکہ کی تاج کی یاد دلاتے ہیں پھنس کے رہ جاتی ہیں وہ قیدی، اس سر کے ساتھ ایک جگہ رات گذارنے کے لیئے جس پر وہ تاج رکھا جاتا تھا اپنی جانیں دے دیتے تھے۔

آ تو بھی میری کلیوپیٹرا ہے جس تکیہ پر یہ بال پریشاں ہوتے ہیں وہاں مجھے بھی سجدہ کرنے دے۔ اور مجھے اپنے قیدیوں میں لے

نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں
جسکی شانے پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

یلدرم

ہز ہائنس سر آغا خاں کی تصویر جو اس مہینہ کے رسالہ کی زینت کو بڑھا رہی ہے اُمید ہے کہ ناظرین تمدن کی نہایت دلچسپی کا باعث ہوگی، ہم اپنے محترم مولوی محمد عزیز مرزا صاحب سے ہز ہائی نس کے متعلق ایک مفصل مضمون لکھوانا چاہتے تھے مگر مولانا کی مرحوم کی موت نے یہ آرزو پوری نہ ہونے دی اور افسوس ہے کہ آج ہم اس تصویر کو بلا مضمون شائع کرتے ہیں۔

مذہب و سائنس

نہ پوچھو تم کہ مذہب کی ہے پابندی کی حاجت کیا؟ مسلماں ہو کے اس کے پوچھنے ہی کی ضرورت کیا؟
جو بندے ہو تو ناحق دخل دیتے ہو خدائی میں خدا کو مان کر فرمان میں اسکے یہ حجت کیا؟
پڑھو تم فلسفہ انساں نہیں ہو سکے لا مذہب بہ مشکل آدمی بنتا ہے اس میں قابلیت کیا؟
نہیں بچ سکتے بے مذہب شر نفس و شیطاں سے بھلا خدا کی قانون کے ہوگی حفاظت کیا؟
مطابق کس قدر قانون فطرت سے ہے یہ مذہب بتاتی ہے تمہیں اسلام کی دیکھو شریعت کیا؟
نہ رہبانیت اس میں ہے نہ چوپایوں سی آزادی بھلا انساں ہو کر اور ملتی ہم کو نعمت کیا؟
مضر ہیں جتنی چیزیں جسم کے یا روح کے حق میں حرام آئی ہیں سب میں تو بتا ہے یہ حرمت کیا؟

کہو گے تم کہ قیدیں ایک پر ہیں ایک ہیئت میں شریعت تو ہوئی پر دوسری ہے یہ طریقت کیا؟
سمجھنے کا طریقہ سہل سا یوں ہے اگر سمجھو کہ ہر ظاہر کو باطن سے نہیں ہوتی ہے نسبت کیا؟
تصوف اصطلاحی نام ہے اصلاح باطن کا نہو صورت تو پھر اصلاح باطن کی ہے صورت کیا؟
حدیث اِنّما الاعمال سے یہ صاف ظاہر ہے عمل کوئی ہو دیکھی جائیگی ہے اس میں نیت کیا؟
حقیقت کو سمجھ لو حال وہ کیا قال میں آئے یہاں مُلّا کی ہے قال اقولُ کی حقیقت کیا؟
جہاں اٹھ جائینگے غفلت کے پردے چشم خودبیں سے تو آنکھیں ہونگی دیکھو گے کہ ہے کثرت میں وحدت کیا؟

شفق از خود پرستی جلوۂ عرفاں کجا بینی
بت پندار شکن کے ز خود بینی خدا بینی

شفق عمادپوری

مردوں اور عورتوں کی اخلاقی حالت

طبیعت انسانی کا خاصہ یہ ایک مشہور مقولہ اور مقبول [illegible] ہے کہ انسان کی طبیعت، خوش آئند پسند واقع ہوئی ہے [illegible] بچے سے [illegible] [illegible] سے عقلمند آدمی [illegible] [illegible] خواہ وہ کسی قدر مبالغہ آمیز [illegible] [illegible] لیکن جہاں یہ [illegible] بات ہے کہ جس وقت اس سے اس کی برائیوں کا [illegible] خواہ وہ کیسا ہی خفیف اور اس کے مقابلہ میں بالکل ہی ہیچ اور ناقابل استبعاد کیوں نہو مگر وہ اس کی ناخوشی اور [illegible] کا باعث ہوتا ہے [illegible] کے تجربہ اور رات دن کے مشاہدہ نے یہ امر اچھی طرح پایۂ ثبوت کو پہونچا دیا ہے، کہ اچھی بات کو سنکر خوش اور بری بات کے سننے سے رنجیدہ ہونا طبیعت انسانی کا [illegible] [illegible] جب کسی شخص [illegible] پاکیزہ۔ نہایت پسندیدہ الفاظ ایک خوش [illegible] استعمال کرتا، اور اس کی اچھی بھلائی [illegible] ہے [illegible] نہایت اچھا اثر، اور وہی اثر جو ناصح کا مفہوم اصلی اور مقصود حقیقی [illegible] ہے بڑی عجلت، بڑی سرعت، اور بڑی سہولت سے [illegible] قبول کرلیتی ہے! اور اگر نامناسب الفاظ اور ناگوار طرز بیان کے ذریعہ

اصلاح قرار دیا جاتا ہے، تو اس کا نتیجہ مخالفت اور برافروختگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی قسم کے غیر مفید نتائج آجکل اس بحث کے متعلق ظاہر ہو رہے ہیں۔ جو مردوں اور عورتوں کے بارہ میں نہایت شدومد کے ساتھ متعدد رسالوں میں مستقل حیثیت لے رہی ہے:

نامناسب الفاظ کا استعمال | جو مضمون مردوں کے خلاف لکھا جاتا ہو اس میں مردوں کو [illegible] ظالم اور بے رحم

جیسے سخت الفاظ سے مخاطب کیا جاتا ہے، اور ایسا ثابت کرنے کی [illegible] درپردہ ان کو مستحق نفرت قرار دیا [illegible] ثابت کیا جاتا ہے، اسی طرح جو مضامین عورتوں کی مخالفت میں شائع ہوتا ہے۔ ان میں عورتوں کو مکار، بیوفا اور ناقص العقل کہا جاتا ہے، اور نہ صرف کہا جاتا ہے، بلکہ اس کے ثابت کرنے کی بھی پوری پوری کوشش کی جاتی ہے؛ جس سے طبیعتوں میں اشتعال پیدا ہو کر ایک فریق دوسرے کی مخالفت پر آمادہ اور اس کو ترکی بترکی جواب دینے پر کمربستہ ہو جاتا ہے، اور نصیحت کا مفہوم اصلی اور منشاء حقیقی بالکل مفقود ہو جاتا ہے۔ یہ کیوں ہوتا ہے؟

صرف اس لئے کہ نصیحت کا پیرایہ اور اصلاح کا طریقہ ایسا اختیار کیا جاتا ہے جو فطرتی طور پر ہر طبیعت کو اسی نتیجہ پر پہونچاتا ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

بد نہ بولے زیر گردوں گر کوئی میری سنے ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

مردوں کو جابر، ظالم، اور بے رحم، عورتوں کو مکار، بیوفا، اور ناقص العقل جیسے سخت اور کریہ الفاظ سے مخاطب کرنا، پھر ان باتوں کے ثابت کرنے کی

سعی اور فضول سعی کرنا، کامیاب ہونا تو کیا معنی، اور اُن دونوں میں مخالفت کا پیدا کرنا ہے؟

طرز تحریر اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے، کہ ہمارے ذی علم ریفارمر قوم کی اصلاح کے متعلق مضامین نہ لکھیں، نہیں، لکھیں اور ضرور لکھیں لکھیں اور زور کے ساتھ لکھیں، مگر وہی پاکیزہ اور شستہ پیارے پیارے الفاظ ہوں، جو اپنا حقیقی اور عمدہ ترین اثر کئے بغیر نہیں رہتے، اور وہی دلکش، دل آویز، دل کو کھینچنے والا طرز تحریر ہو، جو ایک نظر پڑتے ہی پڑھنے والے کے دل کو اپنی برقی و مقناطیسی کشش سے اپنی طرف کھینچ لے۔

الزامات کی تحقیق الفاظ اور طرز تحریر کی موزونیت سے گذر کر، اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ الزامات جو مردوں اور عورتوں پر عاید کئے جاتے ہیں کیا فی الحقیقت وہ صحیح طور پر اون سے متعلق ہوتے ہیں؟ یا صرف ایک نتیجہ اشتعال ہے؟ جو ایک فریق کو دوسرے کی نسبت الزامی جواب دینے پر مجبور کرتا ہے؟

چونکہ ہمارا روزمرہ کا تجربہ اور رات دن کا مشاہدہ، نیز آئے دن کے پیش آنے والے واقعات بظاہر ہمکو یقین دلا رہے ہیں، کہ مرد اپنی عورتوں کے ساتھ طرح طرح کی سختی اور بے جا تعدی عمل میں لاتے رہتے ہیں، اور عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ قسم قسم کی بے وفائی اور نابکاری کا برتاؤ کرتی رہتی ہیں، اس لیے ہم بادی النظر میں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں، کہ فی الواقع ہر دو فریق کی نسبت یہ الزامات صحیح معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن یا صرف اسی قدر تحقیق ایک کامل تحقیق کہی جا سکتی ہے؟ کیا ہمکو اسی قدر تحقیق پر اکتفا کر لینا چاہیے؟ نہیں ہرگز

نہیں، سرسری اور بادی النظری تحقیق پر رائے قائم کر لینا سخت غلطی ہوگی، بلکہ ہم کو ان الزامات کے اصلی اور حقیقی اسباب پر غائر اور عمیق نظر ڈالنی چاہیئے، اور ایسی چھان بین کرنی چاہیئے، جس سے واقعیت کا انکشاف پورے طور پر ہو جائے؛ قدرت نے عورت اور مرد کو ایک سی شکل و صورت، ایک سا ڈیل ڈول، ایک سے قوائے ظاہری و باطنی، عطا فرمائے ہیں، بجز ایک خاص فرق تذکیر و تانیث کے اور کوئی مابہ الامتیاز تفاوت نہیں پایا جاتا؛ اس لیئے ہم باعتبار تعدد اعضا کے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دے سکتے، لیکن تعدد کے بعد جب ہم اُن کے اعضا ظاہری و باطنی کی قدر و قوت پر غور کرتے ہیں، تو ہم کو ایک بین فرق نظر آجاتا ہے، اگرچہ ہم اُس کو قدرت کی طرف منسوب نہیں کر سکتے، نہ ہم اس کو عورت کی فطرت قرار دے سکتے ہیں مگر یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ عورت کی دماغی حالت نہایت تاریک اور اُس کی قوت عقلیہ، بحالت موجودہ نہایت کمزور پائی جاتی ہے؛ اس مسئلہ میں اگرچہ حکما کے اقوال بہت کچھ مختلف ہیں اور فلاسفر بھی باہم بہت بڑا اختلاف رکھتے ہیں، کسی کا قول ہے، کہ "علم فزیالوجی کی تحقیقات سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ عورت کا دل، دماغ اور گردے وغیرہ بمقابلہ مرد کے قدرتاً کمزور واقع ہوئے ہیں، اور کسی کا مسلک اس کے برعکس ہے؛ لیکن ہم کو ان مختلف خیالات سے کوئی بحث نہیں ہماری رائے میں اس وقت ان متضاد خیالات کو مابہ البحث بنانا، موضوع زیر بحث کے لیے ایک غیر ضروری امر ہے، ہم ان خیالات سے

علیحدہ ہو کر ایک تیسری بات دکھانی چاہتے ہیں، جو عورت کے دماغ کی تاریکی اور اس کی کمزوری عقل کا ایک خاص سبب ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، کہ عقل ایک بڑھنے اور گھٹنے والی چیز ہے، جس کا مدار اس کوشش پر ہے کہ جو اس کے متعلق کیجائے، اور جس کا بہترین ثبوت ہر انسان کی سوانح عمری ہو سکتی ہے، تجربہ نے اس امر کو پورے طور پر ثابت کر دیا ہے، کہ علم انسان کی عقل کی ترقی اور افزونی کا سب سے اعلیٰ اور مفید ذریعہ ہے، اور یہی انسان کے دماغ کو روشن بنا دیتا ہے، یقیناً یہ امر اس قدر نا قابل اشتباہ ہے، جس میں کسی شخص کو شک اور شبہ کی گنجائش نہیں مل سکتی، اور یہ انسان کے وہ حالات ہیں جن کو ہر شخص روز روشن کی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اس لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں: پھر جس وقت ہم مرد و عورت کی اکتسابی حالت، اور علمی لیاقت پر غور کرتے ہیں، تو ہم کو مرد کے لازوال دولت سے مالا مال نظر آتا ہے، اور عورت علم کے نام سے بھی لاعلم معلوم ہوتی ہے، گویا اس کو مرد سے وہ نسبت بھی نہیں ہے جو ایک کو ایک ہزار سے ہوتی ہے، پس معلوم ہوا کہ یہی اصل سبب ہے، اس کے دماغ کی تاریکی اور عقل کی کمزوری کا، ورنہ عورت کا دماغ خواہ کیسا ہی محدود پیمانہ پر تیار ہوا ہوتا، پھر بھی اس قدرتی باغ میں وہ پھول ضرور ہی کھلتے، جن کی پود قدرت نے اپنے دست قدرت سے لگا دی تھی، مگر وہ کب کھلتے جب کہ اس کی آبیاری علم کے پانی سے کی جاتی، ہر چیز جب تک اپنے قدرتی مرکز پر قائم رہتی ہے اس وقت تک اس سے، اس نتائج حقیقی کی صحیح طور پر تکمیل ہوتی رہتی ہے، جو واضع کا اس کے وضع کرنے سے منشا

لیکن ہمارا غلط استعمال اُس اصل مقصود کو غلط نتیجہ پر پہونچا دیتا ہے، علم صرف مردہی کے خانہ دماغ کا روشن چراغ نہیں ہے، بلکہ عورت کے دماغ کی تاریکی کو بھی کافور کر دینے کے لیے شمع کافوری ثابت ہوا ہے مردوں نے اُس روشنی سے صرف اپنے ہی دماغ کو منور کرنا پسند کیا، اور عورتوں کے لیے اُس کو غیر مفید تصور کیا، یہی غلط فہمی سب خرابیوں کی جڑ قائم ہوگئی، جس کی مختلف شاخیں، مختلف اطراف میں، مختلف اشکال سے پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں، اس میں شک نہیں کہ بحالت موجودہ عورتوں کی ناقص العقلی، مکاری اور بیوفائی کی مثالیں، عورتوں ہی کے افعال میں زیادہ ترملتی ہیں، جس کے جواب میں مردوں کی جانب سے بدرجہ مجبوری بالمثل الشدا و جبر و سختی عمل میں آتی ہے، اور اس لیے مردوں پر وہ الزامات جو اون پر لگائے جارہے ہیں، ایک حد تک صادق نہیں آتے، لیکن ساتھ ہی اسکے ہم عورتوں کو بھی بالکل بے قصور پاتے ہیں، جب یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کی جہالت کے اصلی اور حقیقی باعث یہی مرد ہیں، خود عالم بنے اُن کو جاہل رکھا، خود متضاد صورتیں اختیار کیں، خود جہالت کو اپنا انیس، جلیس اور رفیق زندگی بنایا، اور خود ہی اب یہ شکایت ہے، کہ اُس سے غیر مفید نتائج کیوں پیدا ہوئے؟

تمثیل | یہ بالکل ایک ایسی مثال ہے، کہ ایک شخص اپنی عورت کو ایک ایسی کوٹھری میں بند کردے جس میں نہ روشندان ہو، نہ روشنی کے آنے کا کوئی اور راستہ ہو، بلکہ اندھیرا گھپ ہو، بقول شخصے کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا ہو، اور جس میں رکھی ہوئی چیزیں کبھی اُس عورت نے دیکھی بھی نہ ہوں، پھر وہ شخص اس صورت سے اُس کوٹھری کی

چیزوں میں سے کسی چیز کے ڈھونڈھنے اور تلاش کرنے کو کہے، اور وہ عورت تحصیل علم میں، اُس چیز کی جستجو کوٹھری کے چاروں کونوں میں کرتی پھرے کسی چیز میں اُس کا ہاتھ لگے اور کسی میں پیر، اور کسی چیز پر وہ خود ہی اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑے، اور اس اتفاقیہ حرکت سے مختلف چیزیں ٹوٹ پھوٹ جائیں، پھر وہ شخص اُس عورت سے اُن چیزوں کے ٹوٹ جانے کی بابت باز پرس کرے، خشمگیں ہو، اور سخت سُست کہے، اگر اپنے کیے پر نادم نہو، تو وہ کون شخص ہے؟ جو ایسے شخص کی ایسی حرکت کو، دانائی، اور عاقلانہ کارروائی پر محمول کرے گا، وہی جو خود اس نادانی میں مبتلا ہے۔

اعتراض اس امر کے ثابت ہو جانے پر کہ عورتیں فطرتی طور پر مکارہ ناقص العقل، اور بیوفا واقع نہیں ہوئی ہیں، بلکہ یہ ایک دوسری ہی چیز کے اثرات ہیں، جو عورتوں کی فطرت میں داخل کیے جاتے ہیں، مردوں پر پھر وہی اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے، جس میں سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے، کہ مردوں نے عورتوں کو جہالت میں ہمیشہ اور علم سے بے بہرہ رکھا، یہ مردوں کی ایک ایسی ظالمانہ کارروائی ہے جس کے بدترین الزام سے وہ کبھی رستگاری حاصل نہیں کرسکتے، اور اُسی ظلم کا نتیجہ ہے کہ آج عورتوں کے اخلاق پر مختلف رنگ کے وہ بدنما دھبے پائے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے وہ مکارہ، ناقص العقل اور بے وفا قرار دیجاتی ہیں، اس لیے مردوں کی نسبت جو کچھ الزامات لگائے جاتے ہیں وہ سب اپنی جگہ پر صحیح معلوم ہوتے ہیں مگر ہمیں یہ اعتراض بھی اپنی جگہہ صحت کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا،

ازالۂ غلط فہمی

کیونکہ اس پردہ میں ایک ایسی غلط فہمی مخفی ہے جس کا انکشاف اصل واقعہ کو ظاہر کر دے گا، اور اس وقت وہ اعتراض خود بخود اُٹھ جائے گا، اور ثابت ہو جائے گا، کہ فی الواقع مرد بھی اس معاملہ میں بالکل بے قصور ہیں، اور ہرگز اُن الزامات کے مستحق نہیں جو اُنکی نسبت سے کیے جاتے ہیں؛

عورت اور مرد میں جو فطری اور ازلی ربط الفت اور سلسلہ موانست ہے اُس سے کون واقف نہیں، وہ زرین اصول فطرت یعنی وہ باہمی محبت، جس نے ابتدا سے آفرینش سے دونوں کو ایک روح دو جسم ایک جان دو قالب بنا یا کون نہیں جانتا؛

عورت اور مرد کا باہمی اتحاد

وہ سب سے پہلا اور اکیلا انسان جس نے سب سے پہلے اس دنیا میں قدم رکھا، اور ابو البشر کا خطاب پایا، جب تنہائی سے تنگ آ کر گھبرانے اور پریشان ہونے لگا، تو عورت ہی اُس کی مونس تنہائی، اور باعث شکیبائی ہوئی، عورت ہی نے اُس کو اتحاد اور یگانگت کی شاہراہ دکھائی، اور تکثیر نسل انسانی کی تدبیر بتائی؛ انسان کا وہ فطرتی جذبہ، یعنے محبت، سب سے پہلے عورت ہی کی جانب مائل ہوا۔ اور انسان سب سے پیشتر اسی کا فریفتہ اور دلدادہ ہوا۔ اسی کا سب سے اول اور سب سے زیادہ وہ ہمدرد اور غمگسار رہا، مخلوقات عالم میں مرد کے لیئے قدرتی طور پر عورت ہی سب سے اچھی اور سچی رفیق زندگی پیدا ہوئی ہے؛

لانگ فیلو کا مقولہ ہے کہ جس طرح کمان میں چلہ ہوتا ہے، ویسی ہی میاں بی بی کی مثال ہے، کمان کو خم دینا یا اس کو چلانا چلہ کے بغیر محال ہے

اسی طرح ان دونوں کی زندگی منشاء قدرت کے موافق بسر ہونا ایک دوسرے کی شرکت کے بغیر محال ہے،

عورت کی قدر یہ ایک مانی ہوئی بات اور مسلمہ اصول ہے، کہ ہر شخص اُس چیز کی سب سے زیادہ قدر و منزلت اور نگہداشت کرتا ہے، جو اُس کو سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہے، گویا ہر چیز کی وقعت اور حفاظت کا معیار اُس کا درجہ مقبولیت اور مرتبہ محبت ہے، جو چیز جس قدر مرغوب محبوب اور منظور نظر ہوتی ہے اسی قدر انسان اُس کے محفوظ رکھنے کی کوشش، اُس کی افزونی وقعت اور ازدیاد قدر و قیمت کی سعی اور اُس کے لیے بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ بنانے کی تدبیر کرتا ہے

اسی طرح چونکہ مرد عورت کو جو اُس کی سب سے بڑی غمخوار سچی ہمدردی کی نمونہ ثابت ہوئی، اور قدرتی طور پر اس کی رفیق زندگی بنائی گئی ہے دل سے عزیز رکھتا ہے، اس لیے اُس کی بہتری اور بہبودی کی فکر کرتا، اُس کی نگہداشت کو اپنا فرض اصلی سمجھتا ہے پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ جان بوجھکر سوچ سمجھکر ایک ایسے قابل قدر عطیہ قدرت اور ایسی لازوال دولت علم سے اُسکو محروم رکھتا، بلکہ یقیناً وہ اس خوشنما اور بیش بہا زیور علم سے اُس کو ضرور آراستہ کرتا،

اثبات غلط فہمی مگر اُس کی سمجھ نے غلطی کی، وہ ایک غلط فہمی میں مبتلا ہوا، وہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ بیش قیمت زیور میری پیاری اور عزیز چیز کو بھی خوبصورت بنا سکے گا، بلکہ وہ اس نتیجہ پر پہونچا، کہ اُس کی اخلاقی حالت بگڑ جائے گی اور اُس کے اُس حسین چہرہ پر جو نیکی اور سادگی کے سانچے میں ڈھلا ہے، بدنما چھینٹے پڑ جائیں گے، اس لئے اپنی راے

اور اپنی عقل کے موافق اُس کے ساتھ ہمدردی اور بھلائی کا برتاؤ کیا، گو کہ اس نے عورت کو ایک غلط رستہ پر چلایا لیکن نیت اوس کی اس کو اس منزلِ مقصود پر پہونچانے کی تھی - جو عورت کے لیے بہتر سے بہتر اور مفید سے مفید خیال کی جا سکتی ہے، اس صورت میں یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے، کہ اس نے عورت پر ظلم کیا، جبکہ صحیح طور پر یہہ صرف ایک غلط فہمی ثابت ہو رہی ہے مرد اگر مرد رہے، اور عورت - عورت تو یہ کبھی ممکن نہیں کہ مرد عورت کے لیے جابر - ظالم اور عورت مرد کے لیے مکار اور بے وفا ثابت ہو سکے، یہہ دونوں کی فطرت کے بالکل خلاف امر ہے، ایسا صرف اسی وقت ہو سکتا ہے - جبکہ وہ اپنی قدرتی مرکز سے ہٹ جائیں - لیکن اُس وقت نہ مرد - مرد رہتا ہے نہ عورت عورت، موجودہ حالت اس امر کی بین دلیل ہے، جبکہ مرد غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اور عورتیں جہالت کی تاریکی میں پھنس گئیں تو اُن برائیوں کا اظہار کہ جو اس حالت کا نتیجہ لازمی تھا - ہونے لگا، لیکن نہ مرد اپنے صحیح معنی میں مرد رہا نہ عورت عورت - اس لیے اس صورت میں یہہ کہنا کہ مرد جابر اور ظالم ہیں اور عورتیں بے وفا اور مکار ہیں بالکل منشاء قدرت اور اصول فطرت کے خود ہی غلط ہے، غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے، کہ عورت ہی مرد کی ماں ہوتی ہے، عورت ہی اُس کی بہن - عورت ہی اُس کی بیٹی - عورت ہی اوس کی بی بی - پھر جبکہ ایسے اہم تعلقات باہم وابستہ ہیں تو کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے کہ مردوں نے عورتوں کو تاریکی میں ڈالنے اور نقصان پہونچانے اور ذلیل کرنے کے خیال سے ذی علم

نہیں ہونے دیا، جبکہ ہر طرح پر عورتوں کے نقائص خود مردوں ہی کے نقصانات ہیں، اور مردوں سے ایسے متعلق ہیں کہ وہ اُن کے اثرات سے کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتے، اس لیے یہ امر بلاشبہ پورے طور پر ثابت ہے کہ مردوں نے صرف ایک غلط فہمی کی سبب جسکو اجتہادی غلطی سے زیادہ نہیں کہہ سکتے، اور جو ایک مقتضائے بشریت ہے محض ایک غلط فہمی کی وجہ سے انپر ایسے الزامات صحیح طور پر قائم نہیں کئے جا سکتے، بلکہ جس طرح عورتیں بے قصور ہیں اسی طرح مرد بھی بے خطا سمجھے جانے کے لائق ہیں،

اصلاح اب یہی یہ بات کہ ان جھگڑوں کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے، اس کے متعلق بے شمار کوششیں کی گئی ہیں اور ہزاروں مصلحان قوم اس غلط فہمی سے واقف ہو کر اُن کو رو رو کر چلا چلا کر خواب غفلت سے بیدار کر رہے ہیں مگر انھوں نے اس میٹھی نیند کا چسکہ نہیں چھوڑا ہے، لیکن کہاں تک سوتے رہیں گے آخر جگانے والے جگا کر رہیں گے :

نور احمد وکیل۔

مقتول تمنّا

کھٹکنا رات دن کانٹے کی صورت دل میں پیکاں کا / سمٹے گا کہاں تک جیب اس دست و گریباں کا
کوئی صدمہ بھی کیا آج برسوں ہو گئی مجھ کو / پتہ ملتا نہیں اب تک نشانِ راہِ ارماں کا
ہوئی مدفون آتی حسرتیں دل میں مرے یارب / نمونہ بن گیا سینہ مرا گورِ غریباں کا
مرا یہ دستِ وحشت دستِ مجنوں بن گیا تھا / کہ اب ملتا نہیں پتا بھی جیب و گریباں کا
مرے اشکوں میں تو صاف رنگِ خون ٹپکتا ہے / گواہی دے رہا ہے چاک دیکھو اپنے داماں کا
نہ پہنچا آسماں تک نالۂ غم واہ ری قسمت / کروں کیا دل سے شکوہ آہ اپنی سوزِ پنہاں کا
زمیں نے کب اجازت دی کہ دامن میں جگہ دیتی / فلک نے کونسے دن آہ میرا عیب تھا ڈھانکا

مجھے شک ہے کہ نکلے یا نہ نکلے آرزو میری
گلِ پژمردہ ہوں میں اڑ گئی ہے مجھ سے بو میری

ہمیشہ خنجرِ حسرت مرے سینے پہ چل جانا / غضب ہے آئے دن یوں خرمنِ ہستی کا جل جانا
کبھی کوئی نہیں اک آن سینہ غم سے خالی / گوارا ہی نہیں اس کو مرا دم بھر سنبھل جانا
مری امید کیا ہے اک گلِ نوخیزِ گلشن ہے / اِدھر اک دم کو کھلنا اور اُدھر مرجھا کے جل جانا
مجھے بالکل نہیں ہے یاد اپنی زندگانی میں / جگر کا اور دلِ صد زخم خوردہ کا بہل جانا
بہت دستِ اجل دکھلا رہا ہے شوخیاں اپنی / کبھی اک پاس آ جانا کبھی کچھ دور نکل جانا
مری اس زندگی کے ختم کرنے کو کیا کم ہے / یکایک اس طرح میرے مقدر کا بدل جانا
مجھے ہر دم رلاتا ہے خیالِ ہستیِ فانی / کہ ہائے وہ مرا ہر اچھی صورت پہ مچل جانا

وہی میں ہوں کہ اب میں تختۂ مشقِ ستم بھی ہوں،
گرفتارِ بلا بھی، رنج بھی، تصویرِ غم بھی ہوں،

مری آہوں میں اکثر شعلہائے رنج و غم نکلے　　نہ لطفِ زندگی مجھکو میسر اور نہ دم نکلے
وہ برگشتہ مقدر ہوں جو فرشِ گل پہ جا نکلا　　تو پابوسی کی خاطر خارِ غم زیرِ قدم نکلے
دلِ اندوہگیں سے حسرتیں جانے نہیں پاتیں　　نہ ارمان دل سے جاتا ہے نہ اس سینے سے غم نکلے
بندھی تھی کچھ ذرا ڈھارس کنارے کچھ دکھا کر　　مگر افسوس وہ بھی ہمرہِ ملکِ عدم نکلے
جنھیں میں پی گیا تھا جانکر اُمید کی ساغر　　مری قسمت سے وہ بھی تھے لہو کے گھونٹ سم نکلے
مرا دم غم سے وابستہ تھا بالکل شامِ غربت میں　　اسی باعث بوقتِ مرگ یہ دو توأم نکلے
بس اب رحمت پہ تیری آرزو کا حصر ہے یارب　　بر آئے دل کی حسرت یا یہ جانِ پُر الم نکلے

پتہ کیا پوچھتی ہے آرزو حسرت کے ماروں کا
کوئی پھاہا نظر آتا نہیں اب دلفگاروں کا

میر زید الواسطی - دہلوی

غزل

اُمڈیں گھٹائیں اور ترشح ہے باغ میں　　ساقی شراب خوب سی بھر دے ایاغ میں
میرے لیے محبتِ گیسو وبال ہے　　ہوگی یہ زندگی بسر اب کیا فراغ میں
فرقت کی شب تھمیں گے نہ آنکھوں سے اشک خوں　　جلتا رہیگا تیل ہے جبتک چراغ میں
عجیب کس قدر ہے تلاشِ حبیب بھی　　میں محو ہو گیا ہوں کسی کے سراغ میں
ارماں ہیں دل میں سینکڑوں اور عمر گھٹ چلی　　شب کم رہی ہے تیل بہت ہے چراغ میں
پھر وحشتِ جنوں سے گریباں کے گل ہوئے　　پھر شوق لے چلا مجھے صحرا و باغ میں
کرتا ہے منع مے سے جو رندانِ مست کو　　واعظ خلل نہ آیا ہو تیرے دماغ میں
وا ان گلوں تو یاں ہے موقع عبرت ہے دیکھ لو　　بے لطفِ باغ میرے دلِ داغ داغ میں

رنگیں بیانیوں کا جمے رنگ یارب آج
محوی ہے نغمہ سنج حریفوں کے باغ میں

محمد حسین محوی لکھنوی

شکریّہ

دنیا کے مہذب ممالک کی قوموں میں شکریہ کا اس قدر لحاظ ہے کہ اسکی خلاف ورزی ایک اخلاقی جرم خیال کیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا اثر ہماری روزانہ زندگی یا یوں تصور فرمایئے کہ روزانہ طرز معاشرت پر اس قدر غالب آگیا ہے کہ بات بات پر شکرگذار ہونا پڑتا ہے حتی کہ حرکات اور سکنات بھی اس اعلیٰ ترین اور پاکیزہ اصول سے مستثنےٰ! نظر نہیں آتے +

لیکن مشاہدات کے تجربہ سے اور بھی بہت سی ایسی ذی روح مخلوق معلوم ہوئی ہے کہ جس کو فیاض قدرت نے اس خاص صفت سے محروم نہیں رکھا، گو شکریہ کا طریق اظہار ان میں مختلف ہے،

شکریہ شکریہ اس جذب نامتناہی کا نام ہے کہ جو جسم کے تمام حصص سے منتقل ہوکر ایک خوشگوار مسرت کے ساتھ زبان سے ادا ہوجائے۔ یعنی وہ حقیقی جذبۂ دل جو احسانات کے مقابلہ میں اظہار خیالات کا کافی قائم مقام ہو۔ مزید توضیح کے لیے میں ایک مثال بیان کرونگا۔ وہ یہ کہ فلسفۂ منطق کی رو سے کسی چیز کے اثبات کے لیے ہمیشہ اس کے خلاف سے بحث کی جاتی ہے اور جب تک وجہ ثبوت کا طریق استدلال قوی نہو اس کی صحت ہمیشہ مشتبہ رہتی ہے۔ مثلاً راستہ چلتے ہوئے کسی کی [illegible] نہ ہو [illegible] کیسی [illegible]

تو [illegible] شکریہ لیکن۔ تعرف الاشیاء باضدادہا

غالباً شکریہ کے صحیح مفہوم کے لیئے مذکورہ بالا بیانات کافی ضمانت ہیں اب میں چند زندہ اور نمایاں مثالیں پیش کر کے شکریہ کا غالب اثر سوسائٹی پر ثابت کرونگا +

شکریہ کے مختلف طریق ہیں اور جہاں اُس کے مختلف طریق ہیں وہاں اُس کے اظہار کے بھی مختلف ذرائع ہیں - ایک ہندی مثل کے مطابق کہ ہمارا روان روان شکر گزار ہے، کوئی چیز ہمیں دی جائے تو ہم شکریہ کے ساتھ لیں اور کوئی چیز ہم پیش کریں تو شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے۔ جہاں کسی سے کوئی غیر معمولی خدمت سرانجام ہوئی اور شکریہ کے رزولیشنوں کا تانتا باندھ دیا گیا ہماری انجمنوں اور کمیٹیوں میں صدہا رزولیشن ہر روز شکریہ کے کسی نہ کسی واقعہ کے متعلق پاس ہوتے رہتے ہیں

چھوٹی چھوٹی باتوں میں بعض اوقات ہم آنکھ یا ہاتھ کے اشارے سے یا کسی اور حرکت جسمانی سے شکریہ کا اظہار کرتے ہیں -

ایک بیرسٹر جب اپنے مؤکل کی جانب سے مقدمہ کی پیروی میں خاص قانونی اور دماغی قابلیت صرف کر کے ڈگری حاصل کرتا ہے تو علاوہ اُس حق المحنت محنتانہ کے شکرانہ اور اسپر مزید فیس شکرانہ کے نام سے بھی وصول کرتا ہے اگر یہ فیس جائز ہو یا ناجائز اس سے ہمیں بحث نہیں

ایک سادہ اور اوسط شخص کی زندگی کو اگر بار سے وجود سے کچھ فیض ہو تو گو ابھی اس کی جانب سے شکریہ کا اظہار باقاعدہ نہ کیا ہو تاہم اس کے لب و لہجہ سے شکرگذاری کی شان ٹپکتی ہے -

[illegible]

[illegible]

اُس میں کامیابی نصیب ہوتی ہے تو تم شکرانہ کی نماز کے ذریعہ سے اسکی بارگاہ میں رطب اللسانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

لطیفہ، ایک ظریف اخبار کے انتظامی شعبہ کے متعلق میں نے اپنی کچھ رائے لکھ کر بھیجی تو دفتر ظرافت سے مجھے ایک خط موصول ہوا جس کے الفاظ یہ تھے۔ شکریہ با دلِ ناخواستہ۔ بس الحق مُر سمجھئے۔ دکھلانا یہ منظور ہے کہ شکریہ سے تا صر نہیں رہے احسانات کا بدل بعض اوقات غیر ممکن ہے مگر یہ شکریہ ہے جو مشکور کی جانب سے محسن کے دل پر اس کے احسانات کا صحیح اثر محسوس کراتا ہے اور یہ وہ سچا اثر ہے جو خالص بدل اور پورے بدل سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ شکریہ عقیدت مندی کی ایک شان ہے اور احسانات کا اعتراف۔ کہ جس سے محسن محسوس کرے کہ ہمارا احسان رائگاں نہیں گیا۔

شکریہ جزو اخلاق ہے اور اسکی ادائیگی فرض۔ اور جب تک ادائیگی نہ ہو اخلاق نامکمل ہے۔

شکریہ سے نہ صرف شکرگذاری مقصود ہوتی ہے بلکہ اس اعلیٰ ترین اور پسندیدہ صفات کا اظہار بھی ہے جو اطاعت و انقیاد کے نام سے موسوم ہیں۔

غرضکہ شکریہ ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہو رہا ہے۔

اردو کا ایک حقیقت پرست شاعر کہتا ہے ؎

منعم کے شکر میں بھی ملا کرتی ہیں نعمتیں
تمہارے لذت دیتی ہے زباں ہمیں

سید سلطان علی بخاری

شکایت صیاد

ہوئی ہے بلبل آشفتہ جاں بلب صیاد اسیر کرکے تو آمادہ تھا غضب صیاد
بلا کے دام میں گیسوئے خم بخم تیرے کہ جیسے سینے میں دل کو ہے تب بتب صیاد
ہے غم نصیب ز خود رفتہ نامراد ترا نہیں امید رہائی کی کچھ اب صیاد
تڑپ تڑپ کے قفس میں غم جدائی سے جو [illegible] دی ہے تو کیا عجب صیاد
کچھ اسکو قید میں رہنا تو ناگوار نہیں گلوں کے غم میں [illegible] ہے بے سبب صیاد
زباں دراز نہ تھی یہ بوقت آزادی ہوئی ہے یاس میں بلبل یہ بے ادب صیاد
پڑیگا صبر تو اس بے زباں کا کیا تجھ پر نہ دے یہ رنج بہت تو بے سبب صیاد
کیا ہے خانہ خراب اور بے وطن ناحق کسی چمن ہی میں رکھدے قفس کو اب صیاد
گلوں کی جامہ دری پر عندلیب ہو یہ تجھ سے کرتے نہوں خونبہا طلب صیاد
ہزار صدمہ و نیم صدمے اُٹھائیگا محوی بلائیگا ترے آزار سے نہ لب صیاد

قفس میں شوق رہائی و حسرت پرواز
فضول ہے جو اسیروں کا بخت ہو ناساز

آہ مظلوماں - ہماری بہن محترمہ بنت نذر الباقر صاحبہ نے آہ مظلوماں کے نام سے جس کتاب کا اعلان فرمایا تھا وہ مکمل ہوگئی اور اس کتاب کو دیکھکر ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ جس قابلیت سے محترم بہن نے اس مسئلہ کو حل کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ قصہ اس قدر پر لطف ہے کہ بغیر ختم کئے کتاب چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا اس کا منافع تمام یونیورسٹی فنڈ کے واسطے ہے امید ہے کہ ناظرین تمدن اپنی ایک بہن کی حوصلہ افزائی فرما کر نیز یونیورسٹی فنڈ کو تقویت دیں گے قیمت ۱۲ ار مصنفہ سے کوہاٹ کے پتہ سے مل سکتی ہے

سیر تاتار

(از محمد شفیع الدین خاں ایم۔ آر۔ اے۔ ایس)

اگرچہ مذہب اسلام اس وقت دنیا کے ہر ایک آباد اور غیر آباد ملک میں پھیلا ہوا ہے اور چین ۔ ہندوستان جزیرہ نمائے ہند ۔ جزیرہ نمائے ملایا ۔ اور مجمع الجزائر ہند شرقی کے زرخیز اور سرسبز میدانوں کے رہنے والے کروڑوں کی تعداد میں اس مقدس مذہب کے پیرو ہیں۔ لیکن عجیب اتفاق یہ ہے کہ ساحل بحر اطلانتک سے لیکر ساحل بحر الکاہل تک جو ممالک اور اقالیم خود مختارانہ طور پر پرچم اسلامی کے زیر نگین ہیں وہ سب کوہستانی ۔ ریگستان ۔ اور بڑے بڑے صحرا اور بیابانوں سے مملو ہیں ۔ کیا شمالی افریقہ کی حکومتیں جن میں مراقش ۔ ریاستہائے بربر طرابلس ۔ مصر ۔ سوڈان اور وسط افریقہ کے اسلامی حکومتیں شامل ہیں اور کیا مغربی اور وسط ایشیا کے اسلامی ممالک جن میں عرب ۔ شام عراق ۔ ایران ۔ افغانستان ۔ بلوچستان ۔ ترکستان شرقی یعنی تاتار اور ترکستان غربی میں توران داخل ہیں ۔ ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کے چوتھائی رقبہ میں ریگستان اور بڑے بڑے لق و دق بیابان واقع ہوں اور اسی لیے نکتہ چین عیسائی معترضین اسلامی بہشت کا مضحکہ اڑانے کی ہمت کر بیٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بہشت میں نہریں ۔ باغات اور میوے شیریں اور سرد پانی کے چشمے اس غرض سے دکھلائے گئے ہیں کہ ریگستان کے بادیہ نشینوں اور بے آب گیاہ

وہ پہاڑ نہیں ہوتا بلکہ نخلستان کے پُرفضا باغات ہوتے ہیں جو گرد کے پردہ میں پہاڑ نظر آتے ہیں۔ سیّاح کو حیرت ہوتی ہے کہ یکایک سماں کیونکر بدل گیا اور کسی ایسے صحرائی جانگزا میں نمونہ فردوس نکل آیا۔ جہاں سبزہ زار کی بہتات۔ درختہائے میوہ دار کی کثرت۔ نہروں اور چشموں کی افراط باغ ارم کا دہوکہ دیتی ہے۔ انگور۔ نارنگی۔ لیموں۔ آڑو۔ شفتالو اور تربوز کے انبار نظر آتی ہیں۔ ایسے ہی شاداب مقام میں ترکستان کا کوئی نہ کوئی شہر و قصبہ آباد ہے جہاں بازار بھی ہوتا ہے قصبات کے بازار پختہ نہیں ہیں بلکہ لکڑی کے دروں اور ستونوں پر چٹائیوں کا سائبان لگا دیا جاتا ہے یہ بازار اکثر بیکار پڑے رہتے ہیں۔ صرف پنٹھہ یا بازار کے روز ان کی دہوم دہام اور رونق قابل دید ہوتی ہے جہاں اطراف و جوانب سے سوداگر و دوکاندار جمع ہو جاتے ہیں۔ اور ہفتہ بہر کے لیے لین دین ہو جاتا ہے۔

مکانات یہاں کے شہروں کے اس طرح پر ہیں کہ بازار اور رستہ کی طرف کوئی دریچہ نہیں ہوتا صرف ایک دروازہ اور صحن ہوتا ہے اس کے بعد مکان صحن میں درختوں کی کثرت ہوتی ہے اور عموماً دیواروں سے اونچے اونچے درخت سڑک کی طرف جھکے نظر آتے ہیں باشندے اس ملک کے سب مسلمان ہیں اور حکومت چین کی ہے۔

ناظرین تمدن [illegible] براہ اپنے خیالوں پر
[illegible] خریداری کی ضرور تحریر فرمائیں [illegible]
کی شکایت سے معاف کریں۔ منیجر تمدن

تازہ ستم

دشمن ہوا ہے ناحق چرخِ کہن ہمارا پیشِ نظر خزاں نے لوٹا چمن ہمارا
گردش چھڑا رہی ہے ہم سے وطن ہمارا کوئی نہیں جو پوچھے رنج و محن ہمارا

دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدارا
دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

مشہور تھے جہاں میں ہم آن بان والے جھکتے تھے آستاں پر عرش آستان والے
زیرِ نگیں تھے سارے نام و نشان والے دب کر رہے ہمیشہ تاب و توان والے

رفعت نشان ہا ہی ہر جا علم ہمارا
خورشیدِ تمکنت تھا دستِ کرم ہمارا

مخفی نہیں کسی سے خُلقِ حسن ہمارا تہذیب مسلمونکی سب پر ہے آشکارا
ظلم و ستم کسی پر کب ہے ہمیں گوارا با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

کرتے رہے ہیں احساں ہم اپنے مدعی سے
جھگڑا انہیں کیا ہی ناحق کبھی کسی سے

بیجا مخالفت پر ہم سے ہی کیوں زمانہ بھولے ہیں کیوں سلاطیں آئین خسروانہ
کرتا ہے خون جگر کو تبریز کا فسانہ نشتر ہے زخم دل کو حافظ کا یہ ترانہ

شہریست پر حریفاں از ہر طرف نگارے
یاران صلائے عشق است گر میکنید کارے

دنیا میں ہو چکے ہیں گو انقلاب اکثر تازہ ستم کیا ہے اے چرخ تو نے ہم پر
مسلم کے خون سے کافر کرتا ہی سرخ خنجر بیداد او ستمگر - بیداد او ستم گر

ہاتھوں سے کفر کے ہے اسلام کی تباہی
فریاد یا الٰہی! فریاد یا الٰہی

افسوس کیا کہوں میں تھا عشرۂ محرم — دل کو ہلا رہا تھا اہلِ وطن کا ماتم۔
نظارہ وہ الم کا سب روبرو جو ہر دم — برسا رہی ہیں آنکھیں قطرے لہو کے پیہم
اسلام کے مشائخ مارے ستا ستا کر
سر دار پر چڑھائے ہمکو دکھا دکھا کر

کوئی ہمیں بتا دے دنیا میں بن کے عادل — کیا ہم ہی رہ گئے تھے ایسی جفا کے قابل
اسوقت وہ نہیں ہیں وزر جزا کے قائل — جا کر کہاں چھپیں گے ہنگامِ حشر قاتل
چہرہ ہے سرخ خوں سے خورشید خاوری کا
نزدیک آگیا ہے دوران داوری کا

ارشدؔ بس اب زباں کو تابِ بیاں کہاں ہے — مونس نہیں ہے کوئی۔ دشمن ترا جہاں ہے۔
فرصت کا وقت کم ہے پُر درد داستاں ہے — کر خاتمہ دعا پر اللہ مہرباں ہے
پہنچا دے جلد یارب ہمکو حضور مہدیؑ
ہیں منتظر نگاہیں۔ دکھلا ظہور مہدیؑ

آغا غلام حسین ارشد

مسلمانوں کے دسترخوان پر ایک ناخواندہ مہمان

بروسہ سے دو تین میل ادھر اس مقام پر جہاں کوہ اولمپس کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے دامن کوہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں قریۃ الیہود ہے جس میں زیادہ تر یہودی آباد ہیں قسطنطنیہ یہاں سے کچھ بہت دور نہیں مگر ان لوگوں کا طرز معاشرت ترکوں سے بالکل علیحدہ ہے سنگین محلوں یا دو منزلوں سہ منزلوں کے بجائے ان کے مکان کچی مٹی اور چھوٹی چھوٹی دیواروں کے ہیں جن میں صاف ستھری ہوا آزادی سے آتی جاتی رہتی ہے زیتون کے خوبصورت باغ اور کھجوروں کے اونچے اونچے درخت چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور یہ ہی ان غریبوں کی جائداد اور اثاثہ ہے۔

بستی کا بڑا حصہ یہودی ہے لیکن کچھ مسلمان اور عیسائی بھی ہیں مدائنہ چونکہ یہاں سے قریب ہے اس لیے ضرورت کی چیزیں مہیا کرنے کے واسطے انکو اکثر شہر میں جانیکا اتفاق ہوتا ہے مگر یہ اپنی حالت میں ایسے مگن ہیں کہ شہری زندگی کو رشک وحسد سے نہیں دیکھتے اور سلطان کی جان و مال کو دعا دیتے ہیں جس کے عہد سلطنت میں بےفکری سے اپنی زندگیاں بسر کر رہے ہیں +

ربیع الاول ۱۳۲۰ھ کی ابتدائی تاریخوں میں جس کو آج سے تقریباً دس سال ہوئے قریۃ الیہود کا رئیس الدہیہ موسیٰ اپنے گھر میں مغموم و متفکر بیٹھا ہے۔ اُسکے ہاتھ پر اُس کی بیوی خاموش ہے اور سامنے ایک چودہ برس کی مہ جبین لڑکی ضعیف العمر والدین کے لیئے تھوڑہ

تیار کر رہی ہے۔ موسم کھلا ہوا ہے اور گو اس نازنین کے گلے میں ایک میلی سی قمیص ہے مگر قدرت نے اس کو حسن کے سانچہ میں ڈھال کر اس طرح دنیا میں بھیجا ہے کہ ایک زمانہ اس کی صورت پر فریفتہ ہو رہا ہے۔

زیور کا نام نشان تک نہیں مگر چاندنی اس کے پاؤں میں لوٹ رہی ہے رات کا پہلا پہر ختم کے قریب ہے مگر چشم کا فرینسند سے آشنا نہیں البتہ افعی کی طرح لہراتے ہوئے سیاہ بال آتا پتہ دے رہے ہیں کہ چمکتا دمکتا چاند اس افعی کو ڈسنے میں پوری پوری مدد دیگا

موسیٰ جو عالم خیال میں ایک ضروری مسئلہ کے حل کرنے میں مستغرق تھا دفعتہً چونک پڑا اور بیوی سے کہا۔

اس میں شک نہیں کہ یورپ کی دیکھا دیکھی آزادی نسواں کی گھٹا ٹرکی پر بھی چھا گئی قسطنطنیہ کے بازار قسم کھا سکتے ہیں کہ پچھلی صدی میں سوا کسی خاص ضرورت کے وہ کبھی کسی جوان یا حسین عورت کے قدموں سے آشنا نہ ہوئے مگر ہمارے دیکھتے دیکھتے یہ اثر بجلی کی طرح تمام ملک میں سرایت کر گیا اور برقع کی آڑ برائے نام رہ گئی۔ خیر ہمیں اس سے زیادہ بحث نہیں سلطنت اس کی ذمہ دار ہے اور اس کے حسن و قبح پر غور کرنا مسلمانوں کا کام ہے لیکن کوئی چیز ہم کو مجبور نہیں کر سکتی کہ ہم اپنے جیتے جی شادی کے فیصلہ کا اختیار مریم کو دیں اس کو اس معاملہ میں رائے دینے کا مطلق حق نہیں۔ تم کو مجھ سے اتفاق کر لینا چاہیئے۔ میری طرف سے مسلمان اور عیسائی دونوں یکساں ہیں۔ لیکن ایسی حالت میں کہ قریۃ الیہود کے کسی خاندان میں کوئی یہودی لڑکا ایسا نظر نہیں آتا جو پیاری مریم کی آیندہ زندگی کو خوشحال بنانے کی امید

دلا سکے ہیں محل کے مقابلہ میں ادہم کو ترجیح دیتا ہوں۔

(۲)

آرمینی گورستان کے عظیم الشان اور خوبصورت کتبے اُن مٹنے والی روحوں کے نام یاد دلا رہے ہیں جو اپنی زندگیاں فلاح قوم پر قربان کر گئے دوپہر کا سنسان وقت ہے اور کھجور کے تناور درخت ان بےخبری کی نیند سونے والوں کا پہرہ دے رہے ہیں۔ ایسے قیامت خیز وقت میں کہ آفتاب عالمتاب نے کائنات کے سر پر [illegible] رکھا تھا مریم ایک زیتون کے درخت کی آڑ میں خاموش کھڑی تھی لباس کی سادگی نے صرف اس کے [illegible] [illegible] [illegible] پسینہ کے قطرے نرم و نازک رخسار و نیز پیشانی کی طرف سے بہتے چلے آرہے تھے اور موتی بن بن کر آب و تاب سے چمک رہے تھے نگاہ شوق انتظار کی تکلیف میں مصروف تھی کہ ہوا کے گرم جھونکے نے زیتون کا ایک پتہ گندھے ہوئے بالوں پر پھینکا باد سموم کی یہ چھیڑ چھاڑ مریم کو اچھی نہ معلوم ہوئی اور وہ نگاہ جو جنگل بیابان کیطرف ٹکٹکی بندھی ہوئی تھی ہٹ کر درخت پر پہونچی ابھی درخت سے واپس نہ ہوئی تھی کہ ایک نوجوان ترک مریم کے پہلو میں کھڑا تھا جس کے قدموں کی آہٹ نے اس نازنین کی خشم آلود نظر کو بالجبر اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ چونک کر پیچھے ہٹی

ترک: "کیوں؟ مریم! اس طرح جھجک کر پیچھے کیوں ہٹیں! کیا ڈر گئیں"!

مریم: "یہ تم کب سے کھڑے تھے آئیے خیر سے سپاہی بننے کا بھی شوق ہے

ترک: "شوق ہے ہی نہیں بلکہ پورا بھی ہو گیا۔ پیاری مریم تم یہ سنکر خوش ہو گی کہ تمھارا ادہم آج عثمانی فوج میں شامل ہو گیا"!

مریم۔ بیشک بیشک، انسان وہی ہے جس کی زندگی ملک اور قوم کے کام آئے۔
ادہم۔ میرے دل و جان کی مالک مریم کس منہ سے شکر یہ ادا کروں۔ غضب کی وقت کہ زیتون کے پتے تک تپ رہے ہیں اور یہ نازک جسم لو کے تھپیڑوں کی برداشت کر رہا ہے اے گلبدن وہ کونسا مبارک وقت ہوگا جب ادہم اپنی جان مریم پرسے قربان کر دے۔
مریم۔ ان فضول باتوں سے کیا حاصل! اب میں جاتی ہوں۔
ادہم۔ اتنی اجازت دو کہ میں یہ نازک پاؤں جو اس قدر تکلیف اٹھا چکے ہیں اپنی آنکھوں سے لگاؤں۔
مریم۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ تم شرع موسوی کے بموجب ایسے ہی نامحرم ہو جیسے کوئی اسلئے میرے جسم کو ہاتھ نہیں لگا سکتے مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو۔
ادہم۔ یہ تو بتاؤ کیا طے ہوا؟
مریم۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ کیا ہوا اور کیا ہوگا بظاہر والد تمھاری طرف مائل ہیں اور والدہ یحییٰ کی طرف۔ اچھا خدا حافظ!

(۳)

وہی قریۂ الیہودا اور موسیٰ کا گھر صبح کا سہانا وقت ہے طائران خوش الحان چہک چہک کر روز روشن کا استقبال کر رہے ہیں موسیٰ منہ اندھیرے کسی ضرورت سے بروسہ چلا گیا، مہجبین مریم چھت پر کھڑی نظام عالم کے کارنمایاں دیکھ رہی تھی باد صبا اس کی سیاہ زلفوں سے سرگوشیاں کرتی تھی اور ہٹ جاتی تھی پرند اس کے حسن خداداد پر درود پڑھتے تھے اور اڑ جاتے تھے زمین اس کے پائے نازک کے بوسے لیتی تھی اور لوٹ جاتی تھی

آفتاب جو ادبیس کی چوٹیوں سے جھانک جھانک کر مریم کو تاک رہا تھا جیسا جیسا آگے بڑھا اور اس کے ساتھ ہی ایک عیسائی جوان نیچے کے گھر میں داخل ہوا۔

مریم کی ماں اسکی صورت دیکھتے ہی تعظیم کو اٹھی اور اندر دالان میں لاکر بٹھایا مریم کو اوپر سے بلایا اور ان دونوں کو ایک جگہ بٹھا کر باہر چلی گئی

مریم۔ مسٹر مجل آپ کا مزاج؟

مجل۔ اب تو بظاہر تندرست ہوں مگر کوئی رات کوئی دن بلکہ کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا کہ اس صورت کا تخیل دل سے دور ہوتا ہو میڈم واقعات پر غور کرو اور یقین کرو کہ مسلمان سے کبھی نیکی کی توقع نہ کرنا تکثیر ازدواج ان کے ایمان کا ادنیٰ ثبوت ہے

مریم۔ مسٹر مجل! مجھے اس معاملہ میں بولنے دینے کا کوئی حق نہیں والدین اس کے مجاز ہیں وہ جو مناسب سمجھیں کریں۔

مجل۔ آپ کی والدہ میری درخواست کو منظور کرتی ہیں آپ کو علم ہو کہ اس وقت ایک لاکھ سوالر کی جائداد میرے قبضہ میں ہے میں نہایت خوشی سے اسکو آپکے نام منتقل کرسکتا ہوں

مریم۔ اچھا میں اس معاملہ میں غور کروں گی۔

مریم کا فقرہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ موسیٰ گھر میں داخل ہوا اور مجل سلام کر کے مریم کی ماں سے کچھ کانا پھوسی کرنے کے بعد رخصت ہوا۔

(۴)

بروسہ میں بارش اول تو اول ہی برائے نام ہوتی تھی مگر ۱۳۲۳ء کے دونوں سال تو ایسے ظالم نکلے کہ قریۃ الیہود پانی کے نام کو ترس گیا زمین آسمان کا منہ تکتی رہی مگر اس سنگدل کا دل نہ پسیجا ہری بھری لہلہاتی ہوئی کھیتیاں جل جل کر خشک ہوگئیں اور قریۃ الیہود پر ایسی قحط کی بلا نازل ہوئی کہ موسیٰ کو کئی ہزار درہم کا باغ جو اسکی بنائی ہوئی لاثانی اور سوروپے کی جائداد تھی کوڑیوں کے مول علیحدہ کرنا پڑا چند ہی روز میں

غرض اس کے ذریعے چھن گئے اور موسیٰ کے گھر میں سوا اس دولت کے جو قدرت نے حسن کی صورت میں موسیٰ کے گھر پر نازل کی تھی کچھ باقی نہ رہا۔ محیل کے واسطے اس سے بہتر کامیابی کا موقع کیا ہوتا اس نے غریب موسیٰ کو قرضہ اور اس کے احسان میں اتنا دبایا کہ سر اٹھانے کی جگہ نہ رہی اور ضرورت نے اسکو مریم کی شادی میں متفق ہونے پر مجبور کر دیا۔

ذی الحجہ کی وسطی تاریخوں میں ایک رات جبکہ چاند اپنی پوری آب و تاب سے سطح آسمان پر جلوہ گر تھا اور چادر ماہتاب در و دیوار پر پھیلی ہوئی تھی مریم تن تنہا بالا خانہ کی چھت پر بیٹھی مختلف معاملات پر غور کر رہی تھی چشم آہو کو شکست دینے والی آنکھیں جو ہندوستان کے سرمہ اور کاجل سے معرا تھیں چاند پر گڑ گئیں ریشمین سرخ بلاؤس نے اس وقت مریم کو گل لالہ بنا دیا تھا،

کانوں میں آویزے بالوں میں پن ہاتھ میں رومال کندھے پہ شال۔

جوانی کا سن مرادوں کے دن گلابی رخسار نشہ محبت میں سرشار لب لعلیں گل ناشگفتہ تل سیاہ در ناسفتہ موسیٰ کی جان حسن کی کان المختصر لکبیر کی تقدیر مریم مہ جبین زلیخا کی دوسری تصویر عالم استغراق میں محو تھی سوائے ان لبوں کے جو گلاب کی پنکھڑی سے زیادہ نازک تھے متواتر بوسہ لئے مگر وہ اپنے خیال سے نہ چونکی چاندنی کھجور کے درختوں سے چھن چھن کر گری اور جھنجوڑا لیکن تخیل کے اس سرسبز چمنستان نے جس میں ادہم کی محبت کا پھول کھلا ہوا تھا اس کو باہر نہ نکلنے دیا۔ ماں کی اس آواز نے کہ مریم یہاں آؤ اس کے بنے بنائے گلدستوں کو اُجاڑ دیا اور وہ حیران و مایوس ماں باپ کے سامنے آ بیٹھی۔

موسیٰ۔ بیٹی مریم گو میری دلی آرزو یہی تھی کہ تمہاری شادی ادہم سے ہو مگر تم دیکھ رہی ہو کہ محیل کا قرضہ ہزاروں تک پہونچ گیا اور قحط نے جان پر بنادی ہم نے کئی کئی وقت کے فاقے کئے مگر کب تک کرتے [illegible]

گذارہ کی نہ دکھائی دی تو اسکی طرف رخ کیا اب میں چونکہ قول دے چکا ہوں اور وہ تقاضی ہے آیندہ اتوار کو میں یہ رسم ادا کرتا ہوں اور میری دعا ہے کہ تم اپنی آیندہ زندگی مجل کے ساتھ بخیر و خوبی بسر کرو۔

(۵)

جامع ایا صوفیہ کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد میں پندرہ بیس ترک شاش بشاش سلطان عبدالحمید کے دوران حکومت پر مختلف آئیں دے رہے ہیں عصر کی نماز ہو چکی ہے اور آفتاب اپنے فرض منصبی کو انجام دیتا ہوا مغرب کی طرف لپکا جا رہا ہے دفعتہً ادہم اپنی محبوبہ مریم کو ساتھ لیے مسجد میں داخل ہوا مریم اس وقت عروسی پوشاک میں تھی اور دلہانی لباس غضب ڈھا رہا تھا اس کے اندر آتے ہی ایک سفید ریش بزرگ آگے بڑھے اور کلمہ طیبہ پڑھا کر مشرف باسلام کیا جسپر تمام حاضرین نے آفرین و مرحبا کے نعرے لگائے اور اس کے بعد مریم کا نکاح ادہم سے شرع اسلام کے بموجب پڑھا دیا گیا اور وہ بجائے والدین کے خدا کے گھر سے سسرال سدھاری مریم نے اب اپنے شوہر ادہم کے ساتھ قسطنطنیہ میں زندگی بسر کرنی شروع کی مگر اس واقعہ نے موسیٰ اور مجل کے دلمیں تہلکہ ڈالدیا مجل کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اسنے بڈھے موسیٰ کو اپنے روپیہ کے عوض جیلخانہ بھجوایا اور موسیٰ کے پاس اس کے سوا کوئی تدبیر نہ تھی کہ اسنے ادہم پر اغوا کا دعویٰ دائر کیا۔

مجل گو اپنی امید دل سے مایوس ہو چکا تھا مگر ادہم کو سزا دلانیکے واسطے دوران مقدمہ میں ہر طرح کوشش کی گئی یہ ثابت ہونے پر کہ مریم سن بلوغ کو پہونچ گئی دعویٰ خارج ہوا مگر مجل نے قسم کھائی کہ موسیٰ چاہے جیلخانہ میں سڑ کر مر جائے مگر وہ اپنے مطالبہ سے دست بردار نہ ہوگا۔

(۶)

ان باتوں کو برسوں گذر گئے عبدالحمید خاں معزول ہو کر سالونیکا پہنچے انجمن اتحاد

ترقی کا دور دورہ ہوگیا غازی انور بے کے گیت گائے جانے لگے قسطنطنیہ کی حالت میں

میں آسمان و زمین کا فرق ہوگیا۔

ایک دن جبکہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور کالی کالی لنگور گھٹائیں آسمان پر

چھائی ہوئی تھیں بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی اور بادل تھم تھم کر گرج رہے تھے گو رات

کا پہلا پہر تھا مگر ہوا کی سائیں سائیں سے آدھی رات کا سماں بندھ رہا تھا مریم جو اس وقت

زندگی کے دو پھولوں کی مالک تھی گود کے بچے کو لوری سنا رہی تھی زبان ترکی

تھی مگر مضمون قریب قریب یہ ہی سا تھا۔ جا سو جا پیارے۔ نیند کے ماتے

کٹ پالن۔ کٹ نیند۔ سو میرے بھولے تو سو میرے چاند۔ ...

بچہ سوگیا تھا لوری ختم نہ ہوئی تھی مینہ اسی زور شور سے برس رہا تھا ...

دور دورہ ہی تھا کہ کوئی شخص مریم کے کمرہ میں داخل ہوا ... مریم چلّا اٹھی

ہوئی بیتابانہ دوڑی میری محترم والدہ۔

ماں - مریم! خبردار! مجھے ہاتھ نہ لگانا تو اتنی ... دیکھ ... کیا ...

ہوا کہ! خواہش نفسانی کی مغلوب بیٹی میری اور محض تیری بدولت ... تباہ برباد

ہوگیا تو اور تیرے افعال یقیناً اس قابل نہیں کہ انسانیت کا اطلاق تجھ پر ہوسکے۔ اے

... مجھے بدرجہا بہتر ہیں جو حسن کشی کے الزام سے محفوظ ہیں! بہت بہتر

تھی موت ایسی زندگی سے جو تجھ جیسی ناہنجار بیٹی کے بعد قدرت نے مجھکو دی! تو نے

نہ صرف قریۃ الیہود کو بدنام کیا بلکہ تمام خاندان کی ناک جڑ سے کاٹ دی! اچھا سنگدل

بیٹی سنگدل مریم تجھے دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے ایسی حالت میں کہ تیرا

بڈھا باپ محض تیری وجہ سے جیلخانہ میں پڑا ہے مرجا! مرجا! اے مریم مرجا! زمین شق ہو

تو سما جائے"

شعیث جس کا بیمار چولی دامن کا ساتھ تھا، تو نے اسکو چھوڑا اور ساتھ دیا

ایک ایسے شخص کا جس سے لغو اور فضول مذہب دنیا میں کوئی نہیں جس ماں کی گود سے ملکر اور بڑھکر آج تو اس قابل ہوگئی کہ اپنی بچہ کو پوری [illegible] یقین کر اور سمجھ [illegible] تجھ پر حرام ہے اس وقت تک جب تک کہ تو اپنے اس باپ کو جو صرف تیرے [illegible] جنت رہا نہ کروا دے۔ نجل اس بات پر آمادہ ہے کہ اگر تو ایک دفعہ اس کے پاس چلی معافی مانگ تو مریم! تیرا باپ قید کی مصیبتوں سے نجات پائے گی آج پندرہ روز سے [illegible] اپنے ماموں کے پاس سلطنت طالیہ کا وزیر جنگ ادہم روانہ ہوگیا اور تو یاد رکھ کہ اگر اب بھی تو اپنے افعال سے تائب نہ ہوئی تو بہت قریب ہے وہ وقت کہ اٹلی تیری ساتھ [illegible]

(۷)

ستمبر ۱۹۱۱ء ختم ہو رہا ہے اٹلی کے خونخوار حملہ نے طرابلس کے مسلمانوں کو خاک تیرہ باد کر دیا قسطنطنیہ میں بچہ بچہ کی زبان پر یہی چرچا ہے آبنائے باسفورس کے کنارے شام کے قریب ادہم اپنی محبوبہ مریم کو ساتھ لیئے غروب ہونے والے آفتاب کا لطف اٹھا رہا ہے۔ ہوا کی رفتار دھیمی تھی اور بڑی اطمینان سے یہ دونوں میاں بیوی ابنائے کے کنارے کنارے اس طرف نکل گئے جہاں چند کھجور کے درختوں کے سوا اور کوئی نہ تھا مریم نے رخ نازک سے برقع اٹھا کر ادہم کو دیکھا اور کہا۔

کیسی خوشگوار ہوا ہے؟

ادہم۔ مگر میری رقیب ہے اس لیے کہ ان سیاہ بالوں کے ساتھ جو صرف مجھ سے کھیلنے کے لیے بنائے گئے ہیں چھیڑ چھاڑ کر رہی ہے۔

مریم۔ تمکو ہر وقت ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں۔ ہاں بتاؤ؟ تم نے طرابلس کے متعلق کیا فیصلہ کیا حمیت اسلام تم سے کیسی گذری ہوئی اور ایسی حالت میں کہ ظالم اطالیہ تمہارے بہن بھائیوں پر ایسے ستم توڑ رہی ہے تم اپنی زندگی کی پروا کرتے ہو اس وقت کو یاد کرو جب ۶۶۸ء میں حضرت ایوب انصاری علمبردار احمد چند بادیہ نشین عرب

دار الخلافہ قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوئے اور بہ حالت ناکامی انکی زبانوں سے یہ لفظ نکلے کہ ہمارے خون کا ہر قطرہ جو اس سرزمین پر گرا ہے ضائع نہ جائیگا ہم بیج بو چلے ہیں اور اور قریب آرہا ہے وہ وقت کہ اس خون سے سرسبز و شاداب پھول کھلینگے اور چمنستان اسلام اس سرزمین پر لہلہا رہا ہوگا ہمارے رسول (صلعم) کا ارشاد پورا ہوگا اور آیا سمجھو وہ وقت کہ مسلمان اس ملک کے مالک ہوں گے۔

ادہم! پیارے ادہم! آخر میرے نہیں تمھارے باہمت شجاع سلطان محمد ثانی کی تلوار آٹھہ سو برس کے بعد ۱۴۵۳ء میں اس سرزمین پر چمکی حسن و اعتقاد کے دریا اسکے دلمیں لہریں لے رہے تہے۔ اور حدیث نبوی کی تکمیل اس کا یقین کامل تہا اسکو جو کچھہ کرنا تہا وہ کر گیا اور اب تمھارا فرض ہے کہ اسلام کی لاج رکھو اور اس سے پہلے کہ اٹالیہ طرابلس پر قابض ہو تم اپنی ملک اور قوم پر سے قربان ہو جاؤ۔

مریم کی یہ گفتگو تیر کی طرح ادہم کے کلیجہ میں لگ گئی مگر ساتھہ ہی اسکی بدگمانی نے اس کا حوصلہ پست کر دیا اور اسے یقین ہو گیا کہ مجھکو طرابلس بھیجنے کے بعد مریم محل سے معافی مانگنے کے لیے قریۃ الیہود جانا چاہتی ہے وہ خاموش ہو گیا اور کچھہ جواب نہ دیا

(۸)

۲۸- اکتوبر ۱۹۱۱ء کی وہ تاریخ جس میں اٹالیہ نے طرابلس میں قتل عام کیا ہے ٹہیک وہی پندرہواں دن تھا جب پل کے ویس آنکی خبر بھی قسطنطنیہ کے در و دیوار اپنے بیکس اور بے بس بہائیوں پر خون کے آنسوؤں سے رو رہے تھے اور شجاعان عرب تلوار کے قبضہ پر ہاتھہ رکھے ہوئے چاروں طرف غصہ میں جھومتے پھرتے تھے گو طوفان خیز سمندر بیچ میں حائل تھا مگر اٹالیہ کے مظالم انکی آنکھہ کے سامنے تھے واللہ پانی انپر حرام تہا ہر چند کوشش کرتے تھے کہ میدان جنگ میں پہونچ جائیں مگر کوئی رستہ نظر نہ آتا تھا مغرب کی نماز سے فراغت پاکر ادہم ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں گھر کیطرف لوٹا آخری فیصلہ جو اس نے اپنے دلمیں کیا یہ تھا کہ اگر مریم چند روز

کے واسطے قاہرہ چلی جائے تو میں نہایت خوشی سے میدان جنگ میں پہنچ جاؤں۔ یہ فیصلہ چونکہ مریم کی مرضی کے عین مطابق تھا وہ شاداں و فرحاں گھر میں داخل ہوا مگر دیکھتا کیا ہے کہ مریم اور بڑا بچہ محمود دونوں غائب ہیں۔ ہاں مریم کی یادگار اور گیارہ برس کی محبت کا آخری ثمر معصوم شیر خوار بچہ تنہا دودھ کے واسطے تڑپ رہا ہے۔

ادہم کی آنکھوں میں یہ دیکھ کر دنیا اندھیر ہو گئی۔ بچہ کو گود میں اٹھایا بہلانے کی ہر چند کوشش کی مگر اس مظلوم کی بات کو کسی نے نہ سنا۔ بہتیری کوشش کیں کہ دودھ پلایا جائے لیکن ماں کی گود کا فراق ایک سلطنت تھا جو اس بیکس سے چھینا تھا۔ تاروں بھری رات ادہم کے سر پر تھی اور ہوا کا ہر جھونکا مریم کی بیوفائی قریۃ الیہود کی رشتہ داری کی صدا تھی۔ رات کے آخر حصہ میں بدنصیب باپ کی گود میں تھا کہ ایک ہچکی آئی اور گیارہ مہینہ کا لال باپ کی گود میں دودھ کو ترستا اور باپ کا منہ تکتا دنیا سے رخصت ہوا۔

قریۃ الیہود کی خاک چھانی قسطنطنیہ کی گلیاں اور کوچے دیکھے ممکن کوششیں کر ڈالیں اور مریم کی تلاش میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا مگر جدھر پہنچتا تھا ناکام اور جہاں جاتا تھا مایوس۔ مریم جیسی محبوبہ کی دغا ادہم کی زندگی پر ایسی بجلی گری جس نے خرمن ہستی کو جلا کر خاک کر دیا۔ اب بقیہ زندگی زہر معلوم ہونے لگی اور بار بار خود دل نے صلاح دی کہ اس دنیا کو سلام اور اس کے تعلقات کو الوداع۔ مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ خودکشی حرام موت ہے۔ بہتر یہی ہے کہ جنگ میں شہادت کا درجہ حاصل کروں اور ملک و قوم پر سے فدا ہو جاؤں۔ اس خیال کی تکمیل میں اب کیا چیز سد راہ تھی۔ بھیس بدل مصر کی راہ لی اور شروع نومبر میں نخلستان جا پہنچا۔

(۹)

اللہ اللہ پچیس ہزار خادمان شمشیر ناواقف اور معمولی عرب اور ترکوں کے مقابلہ میں ایک لاکھ مسلح فوج آمادۂ پیکار ہے جس کے آرام و آسائش کی ذمہ دار سلطنت اٹالیہ ہے۔ غازی انور بے جس کا نام اس وقت تک جبکہ عالم فانی کی پائدار رہیں اپنے اعمال و افعال کی بازپرس کے واسطے میدان حشر میں جمع ہوں مثل ستارۂ درخشندہ کی طرح صفحہ تاریخ پر چمکیگا ان نصیب عربوں کو جن کے بھائی

اٹالیہ کے ہاتھوں موت کی چاشنی چکھ چکی اور جنکی عمریں کاشتکاری میں بسر ہوئیں جو ادھر ادھر جمع کر رہا ہے اور انسے کہہ رہا ہے کہ شجاعان عرب تمہاری رگوں میں آجتک ہاشمی خون دوڑ رہا ہے اٹالیہ نے جس بیرحمی اور سنگدلی سے تمہارے گھر اجاڑے ہیں اس کا جواب دو دو یا مر جاؤ -

۲۵ نومبر ۱۹۱۱ء کو جب تمام سپاہی نیا رنگ رلیاں منا رہی تھی روسیاہ جنرل کینوا کے حکم سے اٹالیہ کے ایک پلٹن طرابلس کے اندرونی حصہ میں داخل ہوئی اور چند گھنٹوں تک ضعیفوں بچوں معصوموں اور عورتوں کو لوٹا جو مال مردوزن کے قبضہ میں تھا ... مرشد جسمانی تکلیف کراہ رہے تھے اور عصمت کی دیواروں سے کہ ہاتھ بندھے ہوئے تھے ننھے منے بچوں میں چھپا ہوئی حسین مرصع ... کی بچوں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں اور عورتیں ننگی کی گئیں -

طرابلس کی سرزمین کا ذرہ ذرہ ان مظلوموں کے خون سے تر ہو رہا تھا کہ گولیوں کی باڑ نے ان مظلوموں کو شربت شہادت پلا دیا

(۱۰)

شہسوار مشرق حریت و آزادی ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کو انیس سو گیارہ سال ختم کرنیکے بعد بارہویں سال کا پیغام لایا ہی غازی انور بے آتش نژاد کے ہمراہ ترکوں کو ساتھ لیکر اٹالیہ کے اس حصہ پر ٹوٹ پڑا جسکی حفاظت کے واسطے اٹھارہ ہزار مسلح لشکر موجود تھا ساحل کی جنگی توپیں مدد پر آگ برسا رہی تھیں اور ایک نوعمر ترک مشکی گھوڑی پر سوار با آواز بلند پکار رہا تھا - بہادرو! کلمہ طیبہ کی حفاظت میں گھرے اپنے سروں کو اور گلوں نیز کلیجوں سے شرف ... علی مرتضیٰ خالد ابن ولید کے جانشین آج تمہارا قدم پیچھے نہ ہٹے بزدل اٹالیوں کے چھکے چھوٹ رہے ہیں آگے بڑھو پیچھے ہٹو تو خدا اور اسکے رسول کا نام آئے تو شہادت جیسا کار خیر ... بڑھے

اٹالیہ نے بھی اس موقع پر غیر معمولی شجاعت دکھائی دونوں طرف سے توپخانہ اپنا کام کر رہا تھا اور جری ترک بھی کسیطرح پیچھے نہ ہٹے تھے کہ دفعتہً نائب کمانڈر وہی نوجوان گھوڑی کو مہمیز کرتا ہوا توپچی کیطرف چلا غضبناک گولے برس رہے تھے مگر اسکا قدم پیچھے نہ ہٹتا تھا ناگاہ بہادر توپچی کے سر پر تھا اور پیاسی تلوار اسکی گردن پر وہ اسی طرف کی گولہ باری

قید ہوتے ہی جیسا ہی لا الہ الا اللہ کے نعرے لگاتے ہوئے مورچے پر جا پہونچے اور ہزاروں اطالیوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اس معرکہ کی فتح وہ فتح ہے جو ہمیشہ ضروری کو ترکوں کے لشکر موج ظفر آمود حاصل ہوئی مگر فتح کے بعد کے وہ چند لمحہ نہایت درد انگیز تھے جب نائب کمانڈر ایک لاش کو خاص اہتمام سے دفن کر رہا تھا۔

غازی انور بولے "یہ آپ کا کوئی عزیز ہے؟"

نائب کمانڈر "جی ہاں! یہ میرا شوہر ادہم ہے"

انور بولے "شوہر؟"

نائب کمانڈر "جی ہاں! میں قریۃ الیہود کے مشہور تاجر موسیٰ کی بیٹی مریم ہوں جو اسلام پر ایمان لائی اور ادہم سے نکاح کیا۔ ۲۸ اکتوبر کے خونریز واقعہ کی خبر مجھکو قسطنطنیہ میں پہونچی اور میں طرابلس ادھر روانہ ہوگئی بڑا بچہ میرے ساتھ آئی تھی ایک ہے لیکن چھوٹا بچہ چونکہ شیر خوار تھا اسکو وہیں چھوڑ آئی ادہم میرے بعد اسکی شرکت جنگ میری خواہش تھی ہمیں بدل کر یہاں آیا افسوس ہے کہ اسکی صورت آخر وقت میں دیکھ سکی جبکہ دم توڑ رہا تھا اور مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ ننھے بچے جو گھر میں چھوڑ آئی تھی آج رات مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا"

مریم کی تقریر سے تمام لشکر میں ایک سناٹا چھا گیا عرب اور ترک اس نے یا دن آنکھوں سے لگا رہے تھے اور اب مریم اپنے بڑے بچے محمود کو ڈھونڈھنے نکلی مگر جب وہ زندہ نظر نہ آیا تو لاشوں کی طرف گئی اور ایک لاش کو دیکھکر ٹھٹکی۔ یہ اسکا لخت جگر محمود تھا۔

میدان جنگ سے جو خط مریم نے اپنے حقیقی دیور کاظم آفندی کو لکھا ہے ہم اسکی نقل درج کرکے بالفعل اس کہانی کو ختم کرتے ہیں۔ (۱۱)

کاظم آفندی! تم لوگ سمجھے ہوئے ہو گے کہ مکار بھاوج دغا دے گئی، آخر یہودن تھی، دھوکے باز نکلی، مگر تمہیں تعجب ہوگا یہ سنکر کہ بھاوج اس نمک کا حق ادا کر رہی ہے جو اس نے مسلمان خاندان کا کھایا تھا اور اس فرض کو پورا کر رہی ہے جو کلمہ توحید نے اسیر اسوقت مقرر کیا جب وہ خانہ خدا میں اسلام لائی، احمد کی موت کانوں سے سنی، ادہم اور محمود آنکھوں کے

ڈاکٹر برمن کی بنائی ہوئی مشہور دوائیں

ستائیس برس سے ہندوستان میں استعمال میں آرہی ہیں

(۱) دمہ جیسے زور سے اچھلتا ہو اس دوا کے دو ایک موتا دہی سے دب جاتا ہے۔

(۲) بنا ہوا اور اس دوا کا استعمال کیا جائے تو دمہ جڑ سے جاتا ہے۔

دمہ کی دوا ڈاک محصول ایک سے تین شیشی تک ۵ آنہ قیمت ایک شیشی ایک روپیہ چار آنہ (عہ)

مقوی گولیاں ڈاکٹری میں طاقت دینے والی دوائیوں میں مشہور دوائیں۔ فاسفورس اسٹکنیا اور ڈمیتا ملا کر یہ گولیاں بنی ہیں مقرر یہ ڈرک۔ ماس اور خون کو یہ طاقت دیتی ہے اس لیئے ان کی کمزوری سے پیدا ہوئے معمولی کمزوری۔ ہول دل۔ یاد بھولنا۔ ہاتھ پیر کانپنا لقوہ۔ وغیرہ ان گولیوں سے آرام ہوتے ہیں دو ہفتہ کی خوراک تین گولیوں کی شیشی قیمت ایک روپیہ (عہ) ڈاک محصول ایک سے چار شیشی تک پانچ آنہ۔

امراض مستورات کی دوا یہ ہر ایک قسم کے مستورات کی دوا ہے ہر طرح کا رحم کی بیماری پرودر روگ حمل کی کمزوری پیٹ جانگ میں درد وغیرہ کو مٹا کر اس دوا کے استعمال سے رحم کی خرابی تمام دور ہو کر جسم قوی ہوتا ہے ایک دفعہ اس دوا کی بھی آزمائش کیجیے قیمت ایک شیشی ایک روپیہ (عہ) (۱۶ خوراک) ڈاک محصول ۵/

ان دوائیوں کی اصل حالت معہ سرٹیفکٹوں کی پوری کتاب بلا قیمت ملتی ہے منگا کر پڑھیے

ڈاکٹر ایس۔ کے۔ برمن

نمبر ۵/۱ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ

نوٹ۔ ہمارے ایجنٹ آغا منصب علی کشمیری دروازہ دہلی میں ہیں

فرمایش کے ساتھ اخبار کا حوالہ ضرور دیں

جلد (۲) مارچ سنہ ۱۹۱۲ء نمبر (۶)

تمدن

یکتائے زمانہ ایشیاٹک ماہنامہ

معاشرتی ۔ تمدنی ۔ ادبی ۔ فلسفی ۔ اخلاقی ۔ تاریخی ۔ اور علمی مضامین کا مخزن

ایڈیٹر ۔ شیخ محمد اکرام ۔ محمد عبدالراشد الخیری

(فہرست مضامین)

باہتمام محمد عبدالراشد الخیری

قیمت سالانہ قسم اول ۴ قسم دوم ۳ ۔ تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا ۔ قیمت فی پرچہ ۵ ۔ کتب خانہ ... دہلی

عِصمت

(دہلی)

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگانِ قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کے واسطے عصمت ایک نعمت ہے جس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی محفوظ ہے کنواری لڑکیوں کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی، بیوی کیلئے عصمت سے بہتر شفیق رفیق۔ عصمت سے بہتر ناصح و صلاح کار ملنا ناممکن ہے عصمت ان کو بتلائے گا کہ ہوا ہے کہ زندگی میں ان کو کس طرح گذارنا اصل چیز ماں باپ کا ادب، بہن بھائیوں کی خدمت، بڑوں کی اطاعت، چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں ان کو شادی کے بعد قدم رکھنا ہے اس کیلئے انہیں کیا تیاری کرنی ہے۔ جو جو دقتیں ان میں پیش آتی ہیں ان کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔ غرض ان کی آئندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پرلطف و باطمینان بنانے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں بیاہی لڑکیوں کو خانہ داری، گھر کے حساب کتاب، بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے۔ وہ عصمت ہے عصمت ان کو بتائیگا انہیں دلی لگاؤ سے اپنے شوہر کی و کس محنت و شفقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے ان کے سپرد کئے ہیں ان کی ذمہ داریاں ہم کیا کیا ہیں۔ کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے دل بہار، گھر بار والے ہوں گے تو خوشی سے دن بسر کریں گے اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے۔ عصمت بتلائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائیگا +

تمثیل پیچ کی آب و تاب، سنہری بیل، درجہ اعلیٰ کا کاغذ، ہاف ٹون تصاویر، تنہائی میں دل بہلانے والا، فرصت میں کہانیاں سنانے والا، مذہب کی وقعت بتانے والا، عصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہو گا۔ عصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے ہر ماہ میں ۶۴ صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول مفت میں۔ قیمت سالانہ ۳ روپے

منیجر عصمت و تمدن

(دہلی)



تمدّن

مسئلہ حدوث و قدم عالم

عالم اجسام جن ذرّات سے بنا ہے ہم اُن کو اجزائے فردہ کہتے ہیں سمجھ لو کہ یہ فیصلہ ابھی نہیں ہوا کہ یہ ذرات اجزائے لاتیجزی ہیں یا ذیمقراطیسی ان اجزا کے چھوٹے ہونے کی کوئی حد نہیں معلوم ہوتی۔ ہوا میں جو ذرے پریشان ہو رہے ہیں کہ یوں تو نہیں دکھائی دیتے لیکن کسی تاریکی میں روزن سے شعاع آرہی ہو تو مختلف الالوان ریزے اُن میں سے دکھائی دینے لگتے ہیں اجزائے فردہ کے ساتھ ان ریزوں کو وہی نسبت ہے جو پہاڑوں کو رائی کے دانہ سے۔ اگلے زمانہ کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اجسام کے ٹوٹنے سے ریزے پیدا ہوئے ہیں لیکن تحقیق یہ ہے کہ ریزوں سے اجسام پیدا ہوئے ہیں اور بدلائل ثابت ہے کہ ان اجزائے فردہ میں باہم دگر تماس نہیں ہے شیخ الرئیس وغیرہ نے جو ابطال جزو پر دلیل تماس لکھی ہے وہ یہاں نہیں

چل سکتی۔ اور باوجود تماس نہونے کے علاوہ ایسا قوی ہے کہ ہر عنصر کے اجزائے فردہ کبھی اتنے قریب ہوجاتے ہیں کہ وہ منجمد ہو جاتا ہے کبھی اتنے بعید ہوجاتے ہیں کہ وہ ہوا بن جاتا ہے کبھی قرب وبعد میں حالت متوسطہ ایسی پیدا ہوتی ہے کہ وہ عنصر سیال ہو جاتا ہے۔ اس پر بھی عنصر کی حقیقت میں تغیر نہیں ہوتا۔ مثلاً برف اور پانی اور بھاپ تینوں ایک ہی چیز ہیں گو یہ عنصر نہیں ہے مگر یہی قیاس ہر عنصر میں جاری ہے جس کے امتحانات ہو چکے ہیں۔ قرب وبعد کی پیدا کرنے والی چیز حرارۃ ہے زمین پر آفتاب کی اتنی ہی حرارۃ پہنچتی ہے کہ فولاد منجمد رہے اور ہیڈروجن بخار کی صورت میں رہے۔ ایک ذو ذنب ستارہ میں یہ ممکن ہے کہ آفتاب سے اتنا دور ہو جائے کہ عنصر ہیڈروجن بھی اُس میں منجمد یا سیال ہوجائے۔

اسی بنا پر ستارہ ہالی کے متعلق جو مضمون میں نے لکھا تھا اس میں یہ فقرہ لکھا تھا کہ اس میں ہیڈروجن کے پہاڑ اور سمندر ہیں جو آفتاب کے قریب آکر منجمد و سیال نہیں رہ سکتے۔ بخار بن جاتے ہیں اور مشتعل ہو جاتے ہیں اور مشتعل ہونے کے بعد اسپکٹرم میں صاف دکھائی دینے لگتے ہیں تمام حرکات اُن اجزائے فردہ کے جو ہیڈروجن میں ہیں۔ اشتعال کی کنہ سمجھنے کے لیے یہ خیال کرو کہ حرارۃ ایک زور ہے جو اجزائے فردہ کے درمیان فاصلہ بڑھا کر منجمد کو سیال اور سیال کو بخار بنا دیتا ہے مگر اشتداد حرارۃ کی صورت میں اجزائے فردہ میں ایسی تھرتھری پڑ جاتی ہے کہ اس کے سبب سے ملا اثیری میں اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ اضطراب اثیری پردہ چشم میں نفوذ کرکے روشنی بن جاتا ہے اور اجسام غیر مشف میں حرارۃ بن جاتا ہے۔ یہ آفتاب کے اجزائے فردہ کی تھرتھراہٹ ہے جس نے

جس نے ایتھر میں ایسا ارتعاش پیدا کر دیا ہے جس کو ہماری آنکھ شعاع سمجھتی ہے۔ شعاع آتشی شیشہ میں سمٹ کر ایسی قوی ہو جاتی ہے کہ روئی کو جلا دیتی ہے اور شیشہ گرم بھی نہیں ہوتا۔ یورپ کے طبقہ محصلین نے ایک عجیب امتحان کیا کہ برف کے ٹکڑے کو آتشی شیشہ کی طرح محدب تراش کر شعاع آفتاب کو اس پر لیا دیکھا کہ برف ذرا نہیں پگھلی اور روئی جل اٹھی۔ یہ اُن کا ایک کھیل تھا جس سے یہ راز معلوم ہوا کہ اجزائے فردہ کی تھرتھراہٹ جسے ہم حرارۃ سمجھتے ہیں ایتھر میں سرایت کر کے شعاع بن جاتی ہے۔ یعنی ہمارے جسم کے اجزائے فردہ پر برق اتصال کا ایک زور پڑتا ہے جس کا نام ہم نے حرارۃ رکھا ہے۔ اور شعاع جب تک ایتھر میں یا جسم مشف میں ہے شعاع ہے حرارۃ نہیں جسم غیر مشف کے لیے وہ حرارۃ ہے شعاع نہیں۔

مشف و غیر مشف ہونا بھی اجزائے فردہ کی چادروں کی تطبیق و عدم تطبیق کے سبب سے ہے۔ میگنیشیا کا گلاس حسب عادۃ شفاف ہوا کرتا ہے اوسے ایک طالب علم نے بہت جلدی سے سرد کر دیا تو وہ سنگ مرمر سفید کی طرح غیر مشف ہو گیا۔ اور ایسا ہوا شیشہ غیر مشف ہو جاتا ہے جسم شفاف میں ارتعاش ایتھر منقلب بہ ارتعاش اجزائے فردہ نہیں ہوتا۔ میں نے دیکھا کہ شیشہ کی قلم کا ایک سرا ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا لیمپ کے شعلہ سے پگھل پگھل کر ٹپک رہا ہے۔ شیشہ کے اجزائے فردہ ارتعاش حرارۃ کے قبول کرنے میں عاصی ہیں ورنہ ہاتھ جلنے لگتا۔ لیمپ کی چمنی کا آدھا ٹکڑا ٹوٹ کر بالشت دو بالشت کے فاصلہ پر میں نے گرتے دیکھا معلوم ہوا کہ شفاف و نازک ہونے کی وجہ سے حرارۃ کے زور کو نہ روک سکا نہ راہ دے سکا۔ اجزائے فردہ کائنات کا تخم ہیں اور اوس کی حرکت دنیا کا اوجالا ہے

[illegible] پر چوٹ پڑنے سے مختلف صدائیں نکلتی ہیں یعنے
[illegible] کے اجزائے فردہ میں پیدا ہوتا ہے ویسا ہی نغمہ ہم
[illegible] اسی طرح ہر عنصر مشتعل کے اجزائے فردہ کے ارتعاش
[illegible] تموج اثیر میں پیدا ہوتی ہے اس میں اس عنصر کا
[illegible] اصوات کو سنکر سمجھ سکتے ہیں اور اسپکٹرم
کی [illegible] زبان سے لیتے ہیں کہ اجزائے فردہ میں کس طرح کی تھرتھراہٹ
[illegible] وہ صدمہ ہے جو کسی جسم کے اجزائے فردہ میں
[illegible] سرایت کر گیا ہے اور شعاع وہ صدمہ ہے جو اثیر میں
سر الیور لاج لکھتے ہیں کہ جس طرح ادراک صوت دلیل بیّن ہے اس
بات کی کہ مادہ کے لیے وجود خارجی ہے اسی طرح ادراک شعاع دلیل ہے
اس امر کی کہ [illegible] اثیر بھی موجود ہے کہتے ہیں کہ حس سمع کے سوا
دوسرا حس ہم نہ رکھتے تو فقط ادراک صوت اس بات کی دلیل تھی کہ ہم سے
خارج میں مادہ موجود ہے اور حس لمس ہمارا اگر اور قوی ہوتا تو فقط آفتاب
کی خصوصیت نہ رہتی بلکہ تمام کواکب کی شعاع کا بغیر آنکھ کے دیکھے ہم ادراک
کر سکتے ہیں جو وجود اثیر کی شاہد ہے یعنی جس طرح اندھا یہ سمجھ سکتا ہے
کہ مجھ پر دھوپ آگئی اگر لامسہ قوی ہوتا تو یہ بھی وہ سمجھتا کہ میں چاندنی
میں بیٹھا ہوں یا اندھیرے میں ہوں۔

غرض کہ اجزائے فردہ سے تکوین عناصر ہوئی اور اختلاط عناصر سے
آفتاب و کواکب پیدا ہوئے اس سے ظاہر ہے کہ اجزائے فردہ کا وجود
آفتاب و کواکب سے بیشتر ہے۔ کلرک میکسویل وغیرہ کا قول ہے کہ ہم نے
پانی میں سے عنصر ہیدروجن کو جدا کر کے اس کا اسپکٹرم لیا۔ کولا [illegible]

جو ہزاروں برس زمین میں مدفون رہا اُس میں سے ہیدروجن نکالا اور اسکا
اسپکٹرم لیا اُس کی دھاریوں میں ایک ہی طرح کا ارتعاش پایا۔ آفتاب کے
اسپکٹرم میں جو عناصر کی دھاریاں ہیں اور ثوابت میں سے شعری
یمانیہ وسماک رامح وغیرہ کے اسپکٹرم میں جو عناصر کی دھاریاں اور
رنگ ہیں ان میں ذرا فرق نہیں معلوم ہوتا۔ ان اجزائے فردہ کا
ارتعاش جیسا کرۂ زمین کے عناصر میں پایا جاتا ہے ویسا ہی آفتاب میں
بھی ہے ویسا ہی ثوابت میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے
کہ لاکھوں برس کی کھنگی نے ان میں ذرا بھی تغیر نہیں کیا اور یہ عالم کے
تغیرات سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ ان کا وجود بدو فطرۃ میں واقع ہوا ہے
جب نہ آفتاب تھا نہ کواکب تھے اور ان ستاروں کے فنا ہو جانے کے
بعد بھی یہ اپنی حالت پر باقی رہیں گے۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے
کہ یہ قدیم ازلی و ابدی و سرمدی ہیں۔ ان کی قومیت زوال و حدوث سے
محفوظ و مصون ہے۔ اس کے برخلاف حکیم ہرشل اجزائے فردہ کو ایک
کارخانہ کی بنی ہوئی اور ایک سانچہ کی ڈھلی ہوئی چیزوں سے مشابہت دیتا ہے
اور اس سے ان کے مخلوق و مصنوع ہونے کا قیاس کرتا ہے دوسری
دلیل اُس کی یہ ہے کہ تعدد و قدما کو مطلقاً عقل باور نہیں کر سکتی نہ کہ اتنی
لاتعد و لاتحصیٰ چیزوں کے قدیم و ازلی ہونے کو انسان تسلیم کرے۔
وہ کہتا ہے کہ اگر یہ اجزا قدیم ہوتے تو سب کی ایک ہی کرکت نوعی
حکمائے عصر کا فیصلہ ہے کہ عالم کی حیات حرارۃ آفتاب کے سبب سے
ہے اور جتنی حرارۃ اُس کی شعاع بن بن کر فضائے نامتناہی میں تلف
ہو رہی ہے یقیناً وہ پھر واپس نہیں آتی۔ دلیل اس پر یہ ہے کہ اگر

یہ نکلی ہوئی حرارت پھر واپس آتی تو رات میں اس کی کرہ ارض بھی واقع تھا۔ چاہیے تھا کہ جتنی حرارۃ دن کو آفتاب سے زمین کو ملتی ہے اتنی ہی رات کو واپسی حرارۃ کے وقت حاصل ہوتی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اور یہ دلیل بین ہے کہ حرارۃ آفتاب سے نکل کر واپس نہیں آتی۔ آفتاب کی حرارۃ کا تلف ہونا ایسا ہے گویا عالم کی جان نکلی چلی جا رہی ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک زمانہ میں عالم اس قابل نہ رہے گا کہ اس میں زندگی کا قیام رہ سکے ٹامسن نے انھیں مقدمات سے یہ نتیجہ نکالا کہ عالم کے لیے ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی اس کارخانہ میں ازلیۃ وابدیۃ کی علامتیں نہیں پائی جاتیں۔ اجرام سے ذرہ کے حالات و حرکات دریافت کر کے حکماے وقت نے اسرار کائنات اکثر سمجھ لیے لیکن اثیر کیا چیز ہے یہ مسئلہ ایک عقدہ معقودہ ہے۔ برکلی ایک حکیم الٰہی کا قول میرے دل میں چبھتا ہے کہ مادہ ارادہ الٰہی کی ایک صورت ہے جو ہمارے مشاعر و مدارک میں پائی جاتی ہے +

علی حیدر طباطبائی

عصمت جس طرح یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ قوم کی ترقی کا انحصار تعلیم النسواں ہے اسیطرح اس میں بھی کلام نہیں کہ رسالہ عصمت لڑکیوں کے واسطے ایک بیش بہا نعمت ہے جس میں خانہ داری تعلیم و تربیت۔ مذہب وغیرہ پر منتخب اہل قلم کے مضامین نکل رہے ہیں عصمت کواری لڑکیوں کو فرمانبردار بیویاں اور بیویوں کو سلیقہ شعار گھروالیاں اور سگھڑ مائیں بنانے کے واسطے ایک لاجواب چیز ہے جو بیش قیمت کاغذ اعلیٰ درجہ کی لکھائی چھپائی۔ رنگین ٹائٹل سنہری بیل اور تصویر سے مزین ہوکر ہر مہینہ شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ ۲ روپیہ منیجر عصمت و تمدن دہلی

تأسف

ستم برپا کیا پھر اے دلِ ناشادماں تو نے
کہ چھیڑی عہدِ ماضی کی غم افزا داستاں تو نے

تری غفلت پرستی نے رکھا محو طرب تجھکو
سُنی گو بارہا بانگِ درائے کارواں تو نے

تری تقصیر سے دم بھر کی ترا سرمایۂ عشرت تھا
نہ پایا بیخبر ذوقِ نشاطِ جاوداں تو نے

نہ سمجھا معنیِ نفع و ضرر بازارِ ہستی میں
ہوائے سُود میں دیکھا فقط روئے زیاں تو نے

تری لائی ہوئی تھی جو بلا ٹوٹی تری سر پر
عبث چھیڑا ہے یہ ذکر جفائے آسماں تو نے

کوئی ہمدرد بھی دیکھا کوئی غمخوار بھی پایا؟
سبھوں کو تو سنائی درد و غم کی داستاں تو نے

زبانِ آفرینِ خلق سے کچھ کام بھی نکلا؟
دکھائیں تو زمانے کو بہت رنگینیاں تو نے

نہ دیکھی کیا کوئی خوبی بہارِ لالہ و گل میں
کہ گلشن سے اُڑایا جلکے بس رنگِ خزاں تو نے

مصیبت کیا پڑی تجھپر کہ گویا دست و پا توڑے
دکھائی اپنی کمزوری بوقتِ امتحاں تو نے

اُبھرنے کی کوئی صورت نہیں بحرِ معاصی سے
ڈبو یا لا کے مجھکو اے خردِ دشمن کہاں تو نے

یہی ہوگا کہ آلودہ کرے اس خاکِ اقدس کو
اگر پیدا کیا شوقِ سجودِ آستاں تو نے

مجھے تو خود نظر آتا ہے تُو اک خاک کا تودہ
گرائی کس پہ برقِ نالۂ آذر فشاں تو نے

تری فریاد نے کھینچا دلِ شیخ و برہمن کو
طلسمِ تازہ باندھا و حشت جادو بیاں تو نے

ضیا علی خاں

مہر افروز بیگم یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈھے نہیں ملتی تھی اور اب عصمت الحسینی نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہے قصہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے قابل مصنف مولوی سید احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے قیمت ۸ر منیجر عصمت و تمدن دہلی

زیارت قاہرہ و قسطنطنیہ

محبت، وہ پری جس کے عالم شمول بازوؤں کے سایے کے نیچے، میں بھی زندگی بسر کرتا ہوں۔ شکر ہے مجھے قاہرہ تک تو لے آئی۔ اس کی تفصیل اب آپ نہ سنیئے کہ آیا میں سینہ پرسکوں لیکر آیا تھا اور متہیج لے کے نکلا یا متہیج لے کر آیا تھا اور پرسکوں لے کر نکلا۔ بازارِ مصر میں تنہا میں ہی اک پرشوق مگر بے مایہ خریدار نہیں آیا ہوں۔ اک سوت کی انٹی والی مجھ سے پہلے بھی گذر چکی ہے۔ بازار میں برقی روشنی ہو رہی تھی، اور ازبکیہ یہ اس حصہ شہر کا نام ہے جہاں میں ٹھیرا تھا۔ ایک بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ وہ ادیب شہیر و استاد محترم، شبلی جس کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا مجھے بھی فخر حاصل ہے، اپنی علمی صحبتوں میں جو ان کے ساتھ ہی علی گڈھ سے خدا جانے کہاں شاید لکھنؤ چلی گئیں اپنے شاگردوں کو اپنا اور قدیم استادوں کا کلام سنا سنا کر طلبہ میں مذاق سخن پیدا کرتے تھے۔ میں بازارِ مصر میں آپ یہ نہ خیال۔ فرمائیں کہ میں بار بار بازارِ مصر بازارِ قاہرہ کی بجائے صرف ایک لفظی رعایت کی وجہ سے کہتا ہوں، اہل مصر شہر قاہرہ کو مصر کہتے ہیں۔ نکلتے ہی ایک مصرعہ میری زبان پر بیساختہ آگیا!۔ ڈانڈا ملا دیا ہے حبش سے تتار کا۔ وہیں مجھے یہ بھی یاد آگیا کہ یہ مصرعہ مولانا شبلی کے زبان سے سنا تھا مصرع تھا یا پورا شعر، جو انہوں نے فرمایا تھا یہ یاد نہیں مگر میں اسے بار بار دہراتا رہا۔ یہاں کی حالت پر وہ بلفظہ صادق آرہا تھا۔ ہمارے شعرا کی سحر و شام کا اجتماع جیسا میں نے یہاں دیکھا اور کہیں

نظر آتا ہے جس قہوہ خانے میں گھس جائیے، جس ٹراموے پر سوار ہو جئے، اک حبشی زاد و شب رنگ کے پہلو میں ایک ترک تمن پر بیٹھا ہوا ہے۔ شب دیجور اور صبح صادق ایک ہی میز پر کھانا کھا رہی ہیں یا چائے پی رہی ہیں۔ (معلوم ہوتا ہے ابھی تہذیب میں مصر نے بالکل ترقی نہیں کی۔ ٹرانسوال سے اور ہندوستان کی ریلوے کمپنیوں سے چند درس گویاں مدنیت وہاں بھیجدینے چاہییں)

کھانے کا وقت تھا، اور میں بھوکا بھی تھا۔ ایک کھانے کے ہوٹل میں۔ یا یہاں کی اصطلاح میں لوکنطہ میں۔ میں بھی جا بیٹھا۔ میں جب کبھی ہندوستان سے باہر آیا، ہندوستان کی ایک خصوصیت کا خیال بہت شدت کے ساتھ دماغ میں آیا۔ مصر بہت سی باتوں میں ہندوستان سے مشابہ ہے۔ موسم ملتا جلتا ہے۔ پیداوار قریب قریب یکساں ہے۔

باشندوں میں اختلاف مذاہب بھی ہندوستان کی طرح ہی شدید ہے۔ نئی اور پرانی تہذیبیں دونوں یہاں بھی ہندوستان کی طرح جلوہ گر ہیں۔ ہندوستان کی مانند یہاں بھی طرز قدیم اپنی ہستی قائم رکھنے کے لیئے مدافعانہ گو مذبوحانہ کوشش میں مصروف ہے، اور طرز جدید حملہ کناں ہے۔ سیاسیات میں ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کے مخاصمانہ تعلقات کا چربہ مصر میں قبطی اور مسلمانوں کے تعلقات نے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی اوتارا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر طرز معاشرت میں وہ یکسانیت ہے جسے آنکھیں ہندوستان میں حسرت سے ڈھونڈھتی ہیں اور نہیں پاتیں۔ یکسانیت ہی نہیں اشتراک بھی ہے۔ اخبارات کو دیکھیے تو آپ کو یہ خیال ہو کہ قبطی اور مسلمان ایک دوسرے کو کھا جائیں گے، مگر ہوٹلوں میں، قہوہ خانوں میں، اور گھروں میں جائیے تو دیکھیے گا کہ ایک دوسرے کو بھی، اور ایک دوسرے کے ساتھ کھاتا ہے۔ سیاسی اور پولیٹکل سب و شتم مصر

میں بھی ایک فن لطیف ہوگیا ہے؛ مگر دونوں جانب کے استادان فن عربی ہی میں اپنا کمال دکھلاتے ہیں: اور میرے خیال میں دہلی کے لیے یہ لازم بھی ہے شاعر کہتا ہے۔

سر بزم وہ گالیاں دے رہے ہیں　　منہ لیتے والے مزا لے رہے ہیں

ہمنے فرض کیا کہ سر بزم وہ گالیاں دے رہے ہیں اور یہ بیحد جائے مسرت وخوشی ہے۔لیکن مزا لینے والے تو مزا اسی وقت لے سکتے ہیں جب وہ اُن گالیوں کو سمجھیں۔یہاں یہ کوشش ہے کہ گالیاں تو ضرور دی جائیں۔بغیر اس کے زندگی ایک بار گراں ہو جائے گی۔مگر ہم ہندی میں گالیاں دیں گے تم اردو میں۔ اور یہی نہیں بلکہ ہمارا اور تمھارا ہر جیستر میں تل پانی کا ساتھ ہونا ظاہر کیا جائے۔ ہم دہوتی پہنیں گے تم پاجامہ پہنو اور ہاں دیکھنا کہیں کھانا ایک جگہ نہو۔تنہا خوری الی الابد تنہا خوری!

مصر میں دوسرا ہی منظر پیش نظر ہوتا ہے۔مصر میں کیا ان تمام ممالک میں ایک ہوٹل میں آپ کھانا کھانے کے لئے تشریف لیجاتے ہیں۔تمام خدام یا اٹیالین ہیں، یا یونانی یا ارمنی حسین، سرخ وسفید لڑکے اعلیٰ درجے کا سیاہ کھانیکا سوٹ پہنے ہوئے، نہایت صاف ستھرا کالر لگائے ہوئے، صاف شفاف قمیص جس کے کف اور فرنٹ (سامنے کا حصہ) روشنی میں چمک رہے ہیں زیب بدن کئے آپ کی پذیرائی کے لیے کھڑے ہیں۔ یہ سب صاحب لوگ ہیں۔اس بات کو آپ ہرگز نہ بھولیے گا کہ اگر آپ کی ملاقات کلکتہ میں، یا بمبئی میں انمیں سے کسی سے ہوگی تو یہ آپکے بات کرنی بھی ہتک عزت سمجھیں گے۔ہندوستان پہونچکر ارمنی بھی اپنے تئیں فاتحان ہند میں سے شمار کرنے لگتے ہیں اور یونانی بھی۔

آپ داخل ہوئے اور یہ غلامان پری تمثال دوڑ کر آئے اور آپ کو گھیر لیا؛
ایک کہتا ہے "اہلاً و سہلاً" ایک کہتا ہے "تفضل" ایک آپکا اوورکوٹ اتارنے میں مدد دیتا ہے، ایک ہیٹ
اور بید آپ کے ہاتھ سے چھڑا لیتا ہے، ایک میز کے پاس ایک کرسی کو
آپکے لیے گھسیٹتا ہے؛ اور فوراً کھانے کی فہرست آپکے سامنے
لاکر پیش کرتا ہے۔ آپنے کھانا انتخاب کرکے اُسے لانے کو کہا۔ وہ
آپسے استفسار کے طور پر پوچھتا ہے "نعم یا سیدی؟" آپ چونک اُٹھتے
ہیں۔ ان لبوں سے "یس سر" کی توقع ہوتی ہے، اور کہتے ہیں "نعم یا سیدنا"
ایک دم آپ کو یہ خیال آتا ہے کہ آپ مصر میں ہیں۔ کھانا لایا جاتا ہے۔ طریقہ مغربی
ہے، لانے والے یورپین ہیں؛ آپکو دماغ سے پھر یہ واقعہ نکل جاتا ہے کہ
آپ پارس میں یا روما میں نہیں ہیں کہ اتنے میں آپ کے سامنے، مقابل کی
کرسی پر، الف لیلہ کے صفحات میں سے ایک تصویر نکل کر آبیٹھتی ہے اور نہایت
بے تکلفانہ اور بے دھڑک طریقہ سے، ٹمن چاپ کے لیے حکم دیتی ہے۔
وہی الف لیلہ کا عبا ہے، وہی ہارون الرشید کے زمانہ کا قبا ہے، وہی
عمامہ ہے اور جمال رُخ روشن ہے وہی۔ اتنے میں ایک مولوی صاحب اس صفائی
سے بیٹھے ہوئے ٹمن چاپ اُڑا رہے ہیں، پاس والی میز پر دو اور حضرات،
ایک قبا سے عربیت میں، ایک رخت مدنیت میں، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے،
آکر بیٹھتے ہیں۔ آپ دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف بھی دیکھتے ہیں اور اپنے
دل ہی میں حیران ہوتے ہیں کہ یہ کون ہیں۔ قبا سے عربی آمرانہ لہجے میں
کھانے کو حکم دیتا ہے۔ غلمانِ جنت کے زمرے کا ایک غلام ان کے لیے
بھی کھانا لاتا ہے۔ یہ منظر اب آپ کے لیے معمولی ہوگیا ہے۔ آپکے سامنے
پہلے ہی سے ایک مولوی صاحب بیٹھے ہوئے ٹمن چاپ خوری کر رہے تھے،

گویا بوالعجب! یہ کیا؟ قبائے عربی کے سامنے گلاس اور بوتل لاکر رکھی جاتی ہے
اور وہ کاگ کھول کر ایک گلاس اس عرق کا جس کا تیز بھپکا آپ کی ناک سے
گزر کر دماغ کو ٹکرا کر یہ کہتا ہے: میں شراب ناب ہوں، کچھ اور نہ سمجھئے گا!
اپنے رفیق کوٹ پتلون کو دیتا ہے۔ اور پھر ایک گلاس اپنے لئے بھی بھر
کر، نہایت اطمینان سے تلچھٹ تک پی جاتا ہے! یہ دُرد آشام آپ کے
رہے سہے حواس باختہ کر دیتا ہے۔ یہ جامۂ تقویٰ، یہ لباس مشروع اسلام
اور علانیۃً مصاحبت صراحی و جام! غضب کہاں ہے؟ عکس کدھر ہے؟ مگر
تھوڑی دیر میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مسلم صورت، لیکن بصورت مسلم ہے؛
یہ اور اس کے آبا و اجداد اسلام سے اسی قدر دور رہے ہیں جس قدر مشرق
ریورنڈ زویمر حضرت نصرانی ہیں؛ اور سب متعصب دشمن اسلام نصرانی نہیں
اس پر فخر ہے کہ ہمارا خاندان شیوع اسلام سے پہلے عیسائی تھا اور اب تک
عیسائی ہے۔ یہ قبطی ہیں۔ نیل مبارک اسلام نے تمام مصر کو سیراب کیا، مگر قبطی
بادیۂ خشک ہی رہا۔ اور انہوں اس بادیہ سے وہ جھاڑ جھل رہے ہیں۔ اس
شدت کی بالعموم گھٹ ہی ہے کہ مصر کی مذہبی شادابی معرض خطر میں ہو۔
مگر میں اس حقیقت کا مجرم ہوں کہ اگر میرے اس قدر لکھنے سے آپ کے
دل پر یہ اثر ہو کہ مصر کے ہوٹلوں میں اسلامی لباس پہنے جو لوگ جام کف
نظر آتے ہیں وہ سب قبطی نصرانی ہیں، یہ صحیح نہیں۔ وہ سب قبطی نہیں؛
انہیں سے بعض قبطی ہیں لیکن اکثر اور بیشتر مسلمانان مصر ہیں بالکل گویان شام!
یہ ان لوگوں کا حال ہے جو اپنا پرانا قومی لباس پہنے نظر آتے ہیں۔
ہاں نوجوان مصر، جو اپنے کپڑے پیرس سے سلوا کے منگواتا ہے؛ جو مذاق فیشن
میں انگریزی رنگیلے رسیلے فوجی لفٹننٹ سے بھی کئی منزل آگے نکل گیا ہے؛

یہ نوجوان مصر، یا بقول خود انکی اصطلاح کے،
"مصر الفتاۃ" اسکی نہ پوچھیئے۔ انکی زندگی عجیب زندگی ہے۔ اول تو یہ دن بھر سیر سپاٹے میں بسر کرتے ہیں، اور شام کو گھر آتے ہیں: آرام لینے اور سونے کی غرض سے نہیں، کیونکہ ان ظریف و شستا سال فرض عشرت کے قسمت میں گھر پر بیٹھنا اور آرام لینا کہاں لکھا ہے۔ انہیں تو گھر پر کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا: یہ صبح کے نکلے شام کو گھر آتے ہیں صرف کپڑے بدلنے کے لیئے! یہ ہر کس کسی صنعت کار کے ہاتھ کا (جو درزی گری کو بھی شاعری اور مصوری کے ہمراہ فنون لطیفہ میں شامل کیئے جانیکا بحق مدعی ہے) سلا ہوا سوٹ پہنکر "مصر الفتاۃ" باہر نکلتا ہے۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ مگر وہ ہر شب گھر سے باہر کھانے کی ٹھان لیتا ہے اور کسی رسٹاران (ہوٹل خانہ) میں جاکر کھانا کھاتا ہے۔ رسٹاران میں ہیں نے غلط کہا رسٹاران کے باہر سڑک پر کھانا کھاتا ہے۔ قاہرہ کے فیشن ایبل بازاروں میں جائیے۔ دور تک سڑک کے دونوں طرف دوکانوں کے سامنے پٹڑیوں پر قطار در قطار چھوٹی میزیں لگی ہوئی ہیں، گرد دو دو چار چار کرسیاں پڑی ہیں۔ میز پر سفید شفاف چادر بچھی ہوئی ہے۔ دل دادگان تمدن ان پٹڑیوں پر لگی ہوئی میزوں پر جاکر کھانا کھاتے ہیں خلقت جوق جوق گذر رہی ہے یہ اس عالم گذران کا تماشہ بھی کرتے ہیں اور کھانا بھی کھاتے ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ میں اپنے دل میں انہیں قابل مواخذہ نہیں سمجھتا۔ مصر کے اس صاف نیلگوں چادر کے نیچے، اس قدرتی ملکوکب شامیانے کے تلے، رہنے کو جسکی چھت میں جڑے ہوئے موتی اور ہیرے ایسی جلاوتری سے چمکتے ہیں، کون کیوں گھر کی چاردیواری میں ساکنان ملاء اعلیٰ جہاں سے شرارت سے

یونہی کنان خطۂ خاک کی طرف آنکھ مارتے ہیں) انسان کا دل اس طرح بے اختیار ہو کر چاہتا ہے کہ مصر کی بناہائے محتشم جن کی بنانے میں فراعنۂ قدیم، اور مغرب سے آئے ہوئے فراعنۂ حال نے اپنی ہمتیں صرف کی ہیں، اپنی طرف بلاتی ہی رہ جاتی ہیں۔

آسمان، ہمارے ہندوستان کا بھی صاف ہے، اور دلکش۔ مگر کم ایسا ہوتا ہے کہ اس گنبد اخضری میں کہیں سفید پلاسٹر سے مرمت نہ کی گئی ہو۔ آسمان مصر اپنے پورے معنوں میں گنبد اخضری ہے۔ آپ دو برس لگا کر بھی دیکھیں تو ایک کہیں ٹکڑا ابر نظر نہ آئے گا۔

اور اس وقت آپ کو شاعر کا قول نہایت درست معلوم ہوگا:

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

(جلد دوم)

اخلاق عزیزی یا پارس وٹ سنیکا مولوی محمد عبدالعزیز صاحب کورٹ انسپکٹر لکھنؤ نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے [illegible] پر احسان کیا ہے جس کے مطالعہ سے اخلاق پر خاص اثر پڑتا ہے نوجوان طلبا [illegible] اس لئے یہ کتاب خصوصیت سے مفید ثابت ہوگی۔ [illegible] کتاب کو پسند فرمانا قابل مصنف کی [illegible] افزائی ہے جو یقیناً حق بجانب ہے۔ ترجمہ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ ہم مولانا کو خلوص سے اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔

قیمت حصہ اول ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ) حصہ دوم - بارہ آنہ (۱۲)

صاحب مصنف سے مل سکتی ہے

کلام شاد

سید الشعرا خان بہادر مولانا سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی عم فیوضہٗ

(رباعیات)

کیا مفت کا زاہدوں نے الزام لیا تسبیح کے دانوں سے عبث کام لیا
یہ نام وہ تھا جسے بے گنتی لیتے کیا لطف جو گن گن کے ترا نام لیا

کھلنے کے لیے جہاں میں کیا کیا نہ کھلا تقدیر کا راز اب تک اصلا نہ کھلا
کیا علم کہ کیا لکھا ہے پیشانی میں افسوس اسی خط کا لفافہ نہ کھلا

دنیا میں جو ہیں بھی تو نہ ہونے کی طرح جاگے بھی کبھی کبھی تو سونے کی طرح
ہنسنا تو بھلا ہم کو بہت مشکل تھا روتے ہیں کہ رونے بھی نہ رونے کی طرح

دل موردِ ایذا و بلا ہوتا ہے - پاداش عمل میں سب بجا ہوتا ہے
جو قرض کہ خوش ہو کے لیا تھا میں نے وہ سود سمیت اب ادا ہوتا ہے

ہو مشکل جاب کیا ٹھکانا میرا کٹ جائے گا ایک دم میں زمانا میرا
گر سانس نہ آسکے کام سب میں برباد چلتا ہے ہوا پہ کارخانہ میرا

غزل

کچھ کہے جاتا تھا غرق اپنے ہی افسانے میں تھا مرتے مرتے ہوش باقی تیرے دیوانے میں تھا
ہائے پروانے کا وہ جلنا وہ رونا شمع کا! میں نے روکا ورنہ کیا آنسو نکل آنے میں تھا؟

دیر تک میں ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھا کیا ✦ چہرۂ ساقی نمایاں صاف پیمانے میں تھا ✦
ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے اکثر قصہ خواں ✦ اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا

حارث

(۱)
میں کیا تھا؟

مجو درستیٔ عہد از جہان سست نہاد
کہ این عجوزہ عروس ہزار داماد است

آپ جانتے ہیں مفلسی کیا چیز ہے؟ —— وہ مفلسی نہیں جس کی شکایت کوئی ڈپٹی کلکٹر یا منصف کرتا ہے، وہ مفلسی نہیں جس کا نام لے لیکر ہمارے رؤسا اکثر اوقات خواہ مخواہ غل مچایا کرتے ہیں! نہیں وہ نہیں۔ بلکہ وہ مفلسی جو نان شبینہ کو اور پیٹ بھرنے تک کی اجازت نہیں دیتی، جو عشیروں کے سامنے گردن اٹھا کر چلنے سے روکتی ہے۔ جو ہم وطنوں سے نظر چار کرنے سے مانع آتی ہے، اور جو۔ اور جو اشرف المخلوقات کو ارذل المخلوقات بنا کر بھی نہیں چھوڑتی! ایسی مفلسی میرا مطلب ہے اور ایسی مفلسی کو آپ بھی جانتے ہیں کیا چیز ہے؟ ۔ آہ ۔ یہ ایک چکی ہے ۔ احتیاج اور ناداری کے پاٹوں سے مل کر بننے والی چکی ہے ۔ جو تمام شریفانہ جذبات اور جائز انسانی خواہشات کو پیستے پیستے سرمہ بنا دیتی ہے! یہ ایک لعنت ہے ۔ ناقابل برداشت اور لاعلاج لعنت ہے جو کہ ہر وقت قائم رہنے والا اثر جیسا کسی کے ساتھ بات کرنے اور آنکھ ملانے تک سے روکتا ہے! یہ ایک کیڑا ہے ۔ نظر نہ آنے والا اور مردم خوار کیڑا ہے ۔ جو دل و دماغ کے اندر ہی اندر ہمت و استقلال کو کھا جاتا ہے، جرأت و خودداری کو چاٹ جاتا ہے، اور بدقسمت انسان کو تباہ کر دیتا ہے

کردیتا ہے، فنا کردیتا ہے ا

آنکہ شیراں راکند روباہ مزاج احتیاج ست، احتیاج ست، احتیاج

جس وقت اُسے نظر آتا ہے کہ سوسائٹی کی منظورِ نظر۔ گوشت کی تھیلی

چکنائی اور چربی بھری ہوئی۔ جوان عورت اپنے سرخ سرخ رخسارے دکھاتی،

موٹر میں پانوں پھیلائے پڑی ہوئی، اُس کے پاس سے ہوا کیطرح گذر گئی؛

جس وقت وہ دیکھتا ہے کہ تموّل کا پُتلا فیشن ایبل جنٹلمین۔ اعلیٰ درجہ کی

تمباکو کے دُھوئیں اُڑاتا، نہایت غرور کے ساتھ پارک کا نظر فریب سبزہ

روندتا پھرتا ہے؛ اُس وقت۔ اور خصوصاً اُس وقت مفلس آدمی کا خون

ایک ایک رگ میں عشرت کے ساتھ دوڑنے لگتا ہے، دماغ چکراتا ہے

دل بیٹھتا ہے اور روحِ انسانی۔ زندانِ خاکی میں قید ہونے والی پری

آزادی حاصل کرنے کےلیے ہاتھ پانوں مارتے ہوئے چیخ اُٹھتی ہے

کہ "یہ اندھا دُھند! یہ بیوجہہ طرفداری! کیوں ایک شخص تموّل کی

زرین جھول والا حیوانِ ناطق محض وراثت کی اتفاقی وجہہ سے بغیر کسی

ذاتی قابلیت کے تمام دنیا کے لذائذ اور عیش و آرام کے مزے لوٹتا ہے

اور کیوں میں۔ غریب، مسکین، مصیبت زدہ انسان۔ تمام دن جدوجہد

اور انتہائی کوشش کے بعد، رات کو بھی خوش ذائقہ کھانا حاصل نہیں کر

سکتا اور پانوں پھیلاکر آرام سے سو نہیں سکتا؟ کیا جوہرِ آفرینش کے

لحاظ سے وہ کسی اعلیٰ درجہ کی مٹی کا پتلا ہے؟ کیا خلقِ خدا اور

ملکِ خدا پر اُسے کوئی خاص حق حاصل ہے؟ اور اگر نہیں:۔ تو پھر

یہ ظلم کیوں؟ یہ بے انصافی کیوں؟" ——— واقعی یہ ناقابلِ فہم

راز کیوں نظر آتا ہے؟ بنانے والے کے منصف اور عادل ہونے پر بھی

ایسی صریح بے انصافی! اور اس قدر زیادتی کے ساتھ! آخر کیوں؟ زیادہ غور کے ساتھ سوچنے والا - بار بار تنگدستی کی وجہ سے اکتا کر سوچنے والا - ایک ایک مرتبہ اس نتیجہ پر بھی پہنچتا ہے کہ اس تمام کائنات کا وجود بالکل اتفاق ہی اتفاق پر - مادہ کی خود رائی اور خود مختاری پر - مبنی ہے! کوئی علیم، دانا، اور خصوصاً عادل اس کا خالق نہیں! یہی وجہ ہے کہ تموّل کے بدولت جس کسی کو متموّل ہونے کا موقع نیکی یا بدی کے ذریعہ سے مل جائے۔ تمام عیش اور حکومت کے لطف اڑاتا ہے ایک ایک چیز کو محض اپنی ہستی کے لیے موجود سمجھتا ہے اور نشۂ دولت میں مست ہو کر برگزیدہ اخلاق کو ٹھوکر مار کر دور پھینک دیتا ہے! آج سے دس سال پیشتر میں بھی یہی سمجھتا تھا، اور غالباً برابر سمجھتا رہتا اگر میری "اپنی بپتی" - خوفناک تعجب انگیز مگر سچی سرگذشت - میری غلطی مجھے نہ سمجھا دیتی - ان ہی آنکھوں سے نہ دکھا دیتی! الامان! وہ خوفناک، ہیبت ناک، تغیّر پذیر ہستی - جس کو میرے اُستاد یا ادیب رہنے کا موقع ملا - کیا چیز تھی؟ میں کانپ جاتا ہوں، میں تھرّا جاتا ہوں، میں لرز جاتا ہوں؛ جب میں دیکھتا ہوں کہ اکثر افرادِ بنی آدم اسی مکتب میں تعلیم پا رہے ہیں، اُسی ناقابل تشبیہ اُستاد سے سبق لے رہے ہیں جس کی زیر نگرانی میں بھی ایک عرصہ تک رہ چکا ہوں! آہ! کیا اچھا ہوتا کہ میں آج سے دس سال پیشتر ہر ایک چیز کو اُن ہی آنکھوں سے دیکھتا جن سے اب دیکھتا ہوں، ہر ایک بات کو اسی طرح سمجھتا جس طرح کہ اب سمجھتا ہوں، اور اُس خاص راز کی اصلیت سے - تموّل اور افلاس کی گُتھی سے - ایسا ہی واقف ہوتا جیسا کہ اب ہوں! کیوں؟ اس لیے کہ وہی چیز جس کو میں نا انصافی سمجھتا تھا اب عین انصاف بالکل مساوات کے اصول کے موافق نظر آتی ہے! یہ تو ناممکن ہے کہ جو اعتقاد میں نے تجربہ اور مشاہدہ سے حاصل کیا ہے اُس کو محض عقلی دلائل سے آپ کے دلنشین

کرسکوں ؛ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ میں وُہی حیرت انگیز "اپنی بیتی" بلے کم و کاست آپ کے سامنے پیش کردوں ، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تہذیب یافتہ دُنیا کے بہت کم حضرات اس سرگذشت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہونگے ! تاہم ، میری دلی تمنّا ہے کہ میرے عزیز بھائی بھی اپنی ترقی یافتہ دُنیا کو - ظاہر و باطن میں زمین و آسمان کا فرق رکھنے والی دُنیا کو - اُس کی تہ تک پہنچ سکیں ، اُسکی اصلیت معلوم کرسکیں اور اُس بھیڑ کی کھال اوڑھنے والے بھیڑیے کو اچھی طرح پہچان سکیں ! !

معاف کیجیے اگر میں "اس اپنی بیتی" سے پہلے کچھ اپنی نسبت نہایت مختصر طور پر بیان کروں ، کیونکہ میری پوری حالت کا اندازہ کیئے بغیر آپ اس نادر سرگذشت کا لطف مشکل سے حاصل کرسکتے ہیں ! میں صفر کے مہینے میں ہنچر کے دن رات کے ٹھیک بارہ ۱۲ بجے پیدا ہوا ؛ ایسے ٹھیک بارہ بجے ، کہ ادھر تو طاق پر رکھی ہوئی گھنٹے نے بارہ بجانے شروع کیئے اور اُدھر میں نے اپنی زندگی میں سب سے پہلی آواز نکالتے ہوئے بلک بلک کر رونا شروع کیا ! گھنٹے کا بجنا اور میرا رونا ، یہ دونوں باتیں اس قدر ساتھ ساتھ ہوئیں کہ میرے محلّہ کی اکثر بوڑھیوں کو - جو میری پیدایش کے وقت موجود تھیں - ابتک اچھی طرح اور تعجب کے ساتھ یاد ہیں ! میری پیدایش کے مہینے ، دن ، اور وقت کے لحاظ سے - اُس وقت کے توہمات کے موافق اکثر عورتوں نے رائے لگا دی تھی کہ میں بدقسمت ہو کر جیوں گا اور زیادہ تر بھوت پلید کے خلل میں مبتلا رہونگا ! پیشین گوئی کا پہلا حصّہ - میرا بدقسمت ہونا نہایت صاف طور پر سچّا ثابت ہوا ! سب سے پہلی بدقسمتی - اور غالبًا سب سے بڑی نحوست - یہ تھی کہ میں نے ماں جیسی نایاب اور بے مثل رحمت کا لطف نہیں اٹھایا اور آغوشِ مادر میں ہاتھ پانوں مارتے ہوئے - اُن محبت میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرانے کا پاک مزا حاصل نہیں کیا ! کیونکہ جس وقت میری آنکھیں اس نلپاک دُنیا میں

پہلی مرتبہ کھلیں اس کے پورے دس گھنٹے بعد میری ماں کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں! میں ایک جاہل انّا کی آغوش میں دیدیا گیا۔ پلا اور بڑھا۔ مگر مجھے خوب یاد ہے کہ جب کبھی مجھے اس خشمناک انّا سے چھٹکارہ ملتا، میں لڑکتا لڑکاتا اپنی مرحوم ماں کی قبر پر، جو مجھ منحوس کی پیدائش پر سے قربان ہوئی اور جس کی قبر میرے گھر کے احاطہ میں ہی تھی۔ جا پڑتا تھا؛ اور یقین کیجئے کہ اس قبر کے ٹھنڈے ٹھنڈے پتھر مجھے اس قدر اچھے معلوم ہوتے تھے اور وہاں مجھے اس قدر آرام آتا تھا کہ میں قبر کے تعویذ سے لپٹ کر نہایت چین کے ساتھ سو جایا کرتا تھا! یہ ایک فطرتی کشش تھی، یہ ایک ناقابل بیان قدرتی جذبہ تھا، جس کا احساس مجھے اس وقت قطعی نہیں تھا! مختصر یہ کہ پیشین گوئی کا پہلا جزو سچا ثابت ہوا! رہا آخری حصّہ اس کی نسبت میں کچھ نہیں کہہ سکتا! مجھے یاد نہیں کہ میں ایک مرتبہ بھی سایہ سکہ کی وجہ سے بیمار پڑا ہوں؛ ہاں صرف ایک بات کا مجھے خیال ہے کہ میں اسکول میں ابتدائی جماعتوں کے زمانہ میں اکثر اوقات پٹتے وقت استاد کو لپٹ جایا کرتا تھا، اور اگر موقع لگ جاتا تھا۔ جیسا کہ کئی مرتبہ ہوا۔ تو استاد کا ہاتھ یا انگلیاں چبا ڈالتا تھا! اب اسکو آپ بھوت پلید کا اثر سمجھیں یا دماغی جنون بہر حال میں اپنے بچپن میں اکثر اوقات اپنے آپے سے باہر ہو جایا کرتا تھا! میں پٹتا تھا، میں کٹتا تھا میں چار چوٹ کی مار کھاتا تھا، لیکن کیا ممکن جو ایک دن بھی مدرسہ سے بھاگ سکتا! کیونکہ ماں کی مضبوط آڑ اور آغوش مادر کی فطرتی حمایت میرے لیے نہ تھی، اور رعب پدری ایک دن بھی مجھے مدرسے سے غیر حاضر ہونے کی اجازت نہ دیتا تھا! میں پڑھتے گیا، اور پڑھتے گیا: یہاں تک کہ میں نے مڈل پاس کیا، انٹرنس پاس کیا، ایف۔ اے۔ پاس کیا، بی۔ اے۔ پاس کیا، اور اب میں ایم۔ اے کی تیاری کر رہا تھا کہ یکایک میرے والد نے یعنی میرے اکیلے سرپرست نے ہیضہ کیا، اور باوجود میری بیحد دوڑ

دُھوپ اور سول سرجن کی انتہائی کوشش کے صرف ایک دن اور ایک رات میں چٹ پٹ ہوگئے ؛ اِس کو میری دوسری بدقسمتی سمجھ لیجئے! اس جانکاہ غم کی حالت میں مَیں امتحان میں شامل ہوا اور ڈگری حاصل کرتے ہی تعلیم کے سلسلہ سے مجبوری کے ساتھ ہاتھ دھو بیٹھا! دو تین مہینہ کے اندر ہی اندر اُس تمام جائداد پر جس کو میں ترکۂ پدری میں پانیکا اکیلا مستحق تھا، ایک دو تین کی بولی بولدی گئی اور گھر کے مکان تک پر ڈونڈی پٹ گئی! میرے والدِ مرحوم کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی سخاوت نے، خدا اُن کی رُوح نہ شرمائے، قرضہ کا انبار لگا دیا تھا؛ اور اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی قرضخواہوں نے۔ دھوتی باندھنے والی بنیوں نے منقولہ وغیر منقولہ تمام جائداد نیلام کرا کر چھوڑی! اب میں تھا اور تنہائی، عالم بیکسی تھا اور پریشانی، بھری پُری دنیا تھی اور محض میری ذاتی کوشش! یہ میری تیسری بدقسمتی کہی جاسکتی ہے! میری لیاقت اچھی تھی، میرے خاندانی حقوق کافی تھے، مگر میرے پاس سفارش کا گولا بارود قطعی نہ تھا، اور اسی لیئے میں گورنمنٹ سروس حاصل نہ کرسکا! ضرورت برابر مجبور کررہی تھی اور ساتھ ہی میری طبیعت کا قدرتی لگاؤ بھی اسی طرف تھا، میں نے ایک اخبار کی اڈیٹری منظور کرلی! اس ملازمت کا سلسلہ مشکل سے ایک سال قایم رہا! کیونکہ میں نے اُس اخبار میں ایک مرتبہ ایسے مصنف کی تعریف کی جو میری رائے میں نہایت لایق اور طباع شخص تھا، مگر مالکِ اخبار کی مذہبی آنکھوں میں نیچری تھا؛ غرض اُس خطا پر مجھے ماراکہ خطا وار نہ تھا، اُس نیچری کی تعریف شائع کرنے پر میں برخاست کردیا گیا! اب میرے لیے سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ مختلف مضامین لکھوں اور اپنی دماغی محنت کو پیٹ پالنے کے لیے کوڑیوں کے مول مختلف اڈیٹروں کے ہاتھ فروخت کردوں، اور اسی قلیل آمدنی پر کسی نہ کسی طرح بسر اوقات کروں!

الستر ستر نمبر اصلاح: نپی روٹی تلاشو رہ! یہ میری پہلی.... دوسری.... تیسری ہاں چوتھی بدقسمتی تھی!

اب آپ سمجھئے یہ میری زندگی کا مختصر سا خاکہ! میں مضمون نگاری پر زندگی بسر کر رہا تھا، بمشکل اپنا پیٹ بھر رہا تھا، الستم نشستم گزر اوقات ہو رہی تھی کہ دفعتاً میں افلاس کے انتہائی کنارے پر جا لگا! یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ میں نے اپنی موروثی جائداد کے نیلام ہوتے ہی وطن کو خیرباد کہہ دیا تھا، اور تلاش معاش کے لیے بمبئی کو اپنا مسکن۔ گمنام اور خاموش مسکن بنا لیا تھا! کھیتواڑی کی پشت والی گلی میرا پوشیدہ مسکن تھا، اور چال نمبر.... مالا نمبر.... میرا وحشت بھرا آشیانہ تھا! دراصل اس مالے میں ایک زردوز کا کارخانہ تھا جس نے بغل کا چھوٹا کمرہ اپنے طور پر بیس روپے ماہوار پر مجھے دے رکھا تھا! مجھ تنہائی پسند کے لیے وہ کمرہ۔ تنگ و تاریک کمرہ۔ کافی سے بھی زیادہ تھا، اور اس زردوز کا محبت آمیز برتاؤ۔ کیونکہ کئی کئی مہینے وہ مجھ سے کرایہ نہ مانگتا۔ افلاس کی مصیبت میں بزرگوں کی شفقت سے کم نظر نہ آتا تھا! تاہم افلاس۔ فلاکت اور بدقسمتی کا سیاہ بادل۔ میری خاموش زندگی پر چھاتا جاتا تھا، اور میرے دماغ و طبیعت کو علمی قابلیت کے روشن آفتاب کو رفتہ رفتہ اپنی گھٹاٹوپ سیاہی میں چھپاتا جاتا تھا! نوبت بہ اینجا رسید، کہ ایک روز میں۔ ایم اے۔ او کالج کا ایم اے فقر و فاقہ کے دست بدست اور رو برو تھا!!

آپ یقین کیجئے کہ دسمبر ۱۹۰۵ء کی تیسری تاریخ میرے لیے ایک منحوس ترین دن تھا! میں دن بھر تلاش رزق میں مارا مارا پھرا، پھر بھی شام کو میری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی! اسی زمانہ میں، میں نے ایک ناول نہایت دماغ سوزی اور جانکاہی کے ساتھ لکھا تھا؛ لکھا تھا اور ارادہ کیا تھا کہ کسی طرح اپنی آمدنی

میں سے تھوڑا بہت بچا کر پیٹ کاٹ کر اُسے خود چھپواتا : مگر ناداری کا بُرا نہ ہو، وہ
گھٹنے کے عیوض بڑھتی ہی رہی اور آخر کار بھوک نے ۔ ناقابلِ تسکین شعلۂ جہنم نے
مجھے مجبور کیا کہ میں اس تصنیف کو بھی ۔ اس اپنی تنہا ملکیت کو بھی ۔ آتش جوع
کے نذر کردوں !! اسی کو لے کر میں مختلف ایڈیٹروں کے پاس گیا ، لیکن بلا مبالغہ
ہر ایک نے لینے سے انکار کر دیا ! جو اڈیٹر صاحب ملاحظہ کرتے ۔ اندھا دُھند ورق
اُلٹ کر کہیں کہیں سے پڑھتے ۔ وہ عجیب ہمہ دانی اور لیاقت کا چہرہ بنا کر فرماتے
کہ مسٹر جواں بخت ! آپ نے محنت تو واقعی بہت کی ہے ، مگر سوسائٹی پر نکتہ چینی سے
کیا فائدہ ؟ یہ بہت برا رنگ ہے آپ کو زمانہ اور ترقی کے ساتھ چلنا چاہیئے ! اور ۔ اور
غالباً آپ کی یہ اردو بھی ٹھیک نہیں ، آپ کاروبار کی اردو دیکھیں ، بالکل ٹھیٹ ! اسی
بول چال علمی زبان محض لغو سمجھی جاتی ہے ، غالب اور ذوق کی اردو اب سوسائٹی
پسند نہیں کرتی !! واقعی میں سوسائٹی کے عیوب ایک ایک کرکے گناتا تھا ، میں
غالب اور ذوق کی سی اردو لکھنے کی کوشش کرتا تھا ! میں تسلیم کرتا ہوں اگر
یہ دونوں باتیں عیب سمجھی جائیں ۔ تو مجھ میں تھیں اور اچھی طرح تھیں ! وہ میرے
رنگ میں بیٹھ گئی تھیں ، میری فطرت میں ڈوب گئی تھیں ، اور اُن کے خلاف
لکھتے ہوئے میرا کانشنس مجھے ملامت کرتا تھا ! میں دن بھر پھرا ، بیسیوں دروازے
جھانکے ، بہت سی گلیاں چھانیں ، مگر شام کے آٹھ بجے جب واپس آیا تو یک بینی
و دو گوش ایک بار افکار والم لیکر واپس آیا ! اپنے تنگ و تاریک کمرے میں گھستے
ہی میں نے لیمپ جلایا اور ایک عجیب جذبہ کے ساتھ ۔ غصہ ، نفرت ، بیکسی
اور مجبوری کے ساتھ ۔ میں اپنی ہیچکارہ تصنیف کو زمین پر پھینکتے ہوئے کرسی
پر گر پڑا ، گر پڑا ، اور بیدم ہوگیا ، بیدم ہوگیا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر
آنکھیں بند کرلیں !!

آہ! اے کبھی نہ ماننے والی پیٹ کی آگ، تجھے آگ لگے! آہ! اے بغیر کھائے نہ بجھنے والے شعلۂ جوع، تو غارت ہو! رات کے کھانیکا خیال، بیہودہ خیال! جوئندہ یابندہ کا مقولہ، لغو مقولہ! مجھ سے زیادہ کون جوئندہ کا لقب حاصل کرسکتا ہے؟ مگر آہ! مجھ سے زیادہ کون یابندہ کی حالت سے کوسوں دور ہے؟ اے برابر بڑھنے والی بھوک کی آگ! میری ہڈیوں کو جلادے، جلادے اور چربی نکال لے، نکال لے اور اسی کو معدہ میں عمیق غار جہنم میں۔ ڈال دے! کیا رزق میرے لیے آسمان سے برسے گا؟ ... مگر آسمان تو محض ایک حد نظر ہے! تو پھر کیا خدائے رحیم ...؟ ... مگر کسی خالق کا وجود تو محض ایک ڈھکوسلا۔ لغو اور مہمل ڈھکوسلا ہے! اُف! کوئی صورت نہیں: کوئی جائے پناہ نہیں: کوئی نقطہ اس افلاس کی کشمکش سے بچانے والا نقطۂ سکون نہیں۔ کہیں نہیں! خود مختار مادے کی رنگ برنگ کی شکلیں نئی نئی دلفریبی کے ساتھ جلوہ افروز ہیں! حرکت کا زبردست انجن برابر مادے کی صورتوں کو پلیٹ رہا ہے؛ آب و آتش باد و خاک، ہستی کا اسٹیم پیدا کرکے نظام عالم کو نا زوال رنگ میں حرکت دیئے جارہے ہیں؛ اور تمول کا عظیم الشان پہیہ اتفاق یا ایکسیڈنٹ کے بدولت کبھی نہ ختم ہونیوالی گردش میں مشغول ہے! آہ! کیا میری باری کبھی نہ آسے گی؟ کیا ہر وقت حرکت کرنیوالا تمول کا پہیہ مجھے اس فلاکت سے اوپر نہ اٹھائیگا؟ اٹھائیگا اور ضرور اٹھائیگا! ٹھہر، اے سوسائٹی کے نور نظر، گوری چمڑی والے نوجوان ٹھہر! اسوقت تک ٹھہر جب تک کہ میں اسی زیست کے تلاطم میں، اسی دولت کے بھنور میں، اسی مالداری کی مشین میں، دیکھتے دیکھتے اونچا ہوجاؤں اور اس بے مروت، اس سیاہ قلب، اس بے شرم و رون، سوسائٹی کو اس برتاؤ کا اچھی طرح جواب دے سکوں!!

ہوا کا ایک تیز و تند جھونکا، گولی کھائے ہوئے ہرن کی طرح مادھر سے کواڑ کھولتا ہوا اندر گھسا، اور میرے ہوشیار ہوتے ہوتے لیمپ کو گل کرتا ہوا غائب ہو گیا! اندھیرے نے مجھے گھبرایا۔ طبیعت اور زیادہ گھٹی، اور میں نے دیاسلائی کا بکس جیب سے نکال کر ٹٹول ٹٹول کر میز پر رکھے ہوئے لیمپ کو روشن کیا!! اب طبیعت کسی قدر ساکت تھی، ہوک کا شعلہ تو بڑھ رہا تھا مگر دماغی الجھن کم ہو گئی تھی: افلاس کی منحوس شکل تو برابر منڈلا رہی تھی مگر یہ حواس بہت کچھ درست ہو چکی تھی! لیمپ جلانے کے ساتھ ہی اس مرتبہ تین خط مجھے میز پر پڑے ہوئے نظر آئے، جن کو غالباً ڈاکیہ میری عدم موجودگی میں حسب معمول رکھ گیا ہو گیا! ان میں سے ایک خط سبز لفافہ میں تھا جو بظاہر کوئی سرکاری حکم نظر آتا تھا، دوسرا خط نہایت خوبصورت مونوگرام لئے ہوئے نیلے رنگ کا تھا، اور تیسرے خط کے معمولی لفافہ پر بیروت کی مہر تھی! یہ آخری خط میں جانتا تھا کہ میرے اسکول کے زمانہ کے ایک ہم جماعت کا تھا! میں اور وہ معین الدین - انٹرنس میں ہم جماعت تھے، جس کے بعد وہ بیروت چلا گیا اور وہاں تجارت کی بدولت خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گیا! دو مہینے گذرے کہ میں نے اسے ایک خط لکھا تھا۔ اپنی تنگدستی کی کیفیت ظاہر کرتے ہوئے اس سے کچھ مدد قرض دستگرداں کے طور پر چاہی تھی۔ اور غالباً یہ اسی کا جواب تھا! سب سے پہلے میں نے یہ ہی خط اٹھایا، اور پڑھنے سے پیشتر اس کا وزن جانچنا شروع کیا اس نے میری درخواست پوری کی ہوگی؟ کیا اسے وہ محبت بھرا آزادی کا زمانہ یاد ہو گا جبکہ چاندنی رات میں ہم دونوں اسٹریچی ہال کے سامنے ٹہلا کرتے تھے!

آہ! کالج کی زندگی اور خصوصاً ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی زندگی، ناممکن ہے کہ کوئی بھول جائے! مگر پھر بھی امداد کی امید مجھے مطلق نہ تھی! میں خوب جانتا تھا کہ اور بیسیوں دوستوں کی طرح معین نے بھی کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑا ہوگا! اور کچھ نہیں تو مجبوری کا اظہار۔ پہلو تہی کرنے کے لیے آسان سا ٹکا ہے! تاہم میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اوروں کی طرح اس نے بھی صرف مجبوری ظاہر کرتے ہوئے افسوس کیا تھا یا کوئی نیا عذر تراشا تھا! میں نے خط کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔ معین نے اپنی غلط سلط انگریزی میں لکھا تھا:۔

"ڈیر سکیٹ! مجھے افسوس ہے کہ تم جیسا لائق شخص بھی زمانہ کے ظلم سے محفوظ نہ رہا! میں ڈھائی سو روپے کے تین نوٹ اسی خط کے ساتھ ملفوف کرکے بھیج رہا ہوں! تاخیر محض برٹش گورنمنٹ کے نوٹ حاصل کرنے کی وجہ سے ہوئی! میری دلی دعا ہے کہ میں جلد تمھیں کامیاب اور مقصد ور دیکھوں! میں ایک شخص کو تمھاری سرپرستی کے لیے آمادہ کر رہا ہوں۔ وہ بھی آرہا ہے اُس کا نام پرنس حارث کنسی ہے! یہ شخص بے حد متمول ہے اور چونکہ نہایت وسیع معلومات کا شخص ہے اس لیے لائق و طبّاع آدمی کی جان و دل سے مدد کرتا ہے! تم اس سے بہت فائدہ حاصل کر سکتے ہو اگر اس کی رائے پر کاربند رہو! وہ تم سے مل کر طرح طرح سے تمھاری امداد کرے گا۔ مجھے اس وقت فرصت بہت کم ہے اس لیے فی الحال رخصت! میری رقم واپس کرنے میں جلدی نہ کرنا! اور بلا تکلف ضرورت کے وقت یاد کرکے حق دوستی ادا کرنے کا موقع دینا!" ——— میں حیراں تھا! صادق — "بفیلو"

خط ختم کرتے ہی میں نے تینوں نوٹوں کو اچھی طرح دیکھا، اور لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا! اب میں قطعی مطمئن تھا! ابکیٹ اور بغیلو ایک عرصہ دراز کے بعد میری نظر سے گذرے تھے! کالج کی متبرک زندگی نے مجھے بکیٹ کا اور معین کو بغیلو کا خطاب عنایت فرمایا تھا! مگر آہ، ظالم معین تو نے کالج کی یاد کو پھر تازہ کر دیا! تو نے مُردہ دل میں پھر بجلی دوڑا دی! تو نے اُس مبارک یونین کلب کا نظارہ پھر یاد دلا دیا! کیسی متبرک تھی وہ بے فکری کی زندگی، کیسی سچی محبت پیدا کرنے والی تھی اُس کی تعلیم!! ہیں - جہاں بخت نہیں - وہی جان بکیٹ!! اور تو معین نہیں - وہی بھولا بھا، گداز جسم والا بغیلو! پیارے بغیلو! ڈیر بغیلو! معاف کرنا، میں سمجھتا تھا کہ تم بھی اپنے دوافتادہ مفلس بکیٹ کو بھول گئے ہو گے!!

سُلطان حیدر جوش (علیگ)

مرحوم مولوی محمد عزیز میرزا صاحب بی۔ اے۔ کی موت نے جن کی تصویر ہدیہ ناظرین ہے جو نقصان قوم کو پہنچایا ہے اسکی تلافی کا بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا مغفور محمڈن کالج کے اُن طلباء میں سے اور قوم کے اُن افراد میں سے تھے جنپر کالج اور قوم دونوں کو ناز تھا ملازمت سے قطع تعلق کرنے کے بعد مرحوم نے اپنی عمر قومی خدمات کے واسطے وقف کر دی تھی اور قوم کی بہت سی اُمیدیں مرحوم سے وابستہ تھیں جو موت نے پوری نہ ہونے دیں خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ اور پس ماندگان کو صبر دے ٭

انقلاب

اب کہاں پہلی سی وہ سرمستیِ جوشِ شباب　　ہے گرفتارِ خمارِ عیش مدہوشِ شباب
عمر کا حصہ جو گزرا ہے تو نہ کچھ حاصل ہوا　　نیش ہے کہتا ہے اک عالم جسے نوشِ شباب
صحبتِ دوشینہ کے اب ذکر سے کیا فائدہ　　کیوں بنے منت کشِ گفتار خاموشِ شباب
اٹھ کے جاتے ہی وہ باتیں بھی سب جاتی رہیں　　سعی لاحاصل ہے اب کرنا غمِ دوشِ شباب

یادِ عہدِ نوجوانی لاکھ نشتر زن رہے
کچھ غمِ فردا سے پیری بھی دل آزار رہے

شانِ برنائی کہاں وہ آن رعنائی کہاں　　حسنِ صورت اب کہاں وہ طرزِ زیبائی کہاں
اب جوانی کی کہاں پر لطف وہ کیفیتیں　　وہ لبِ لعلیں میں پہلی سی شکر خائی کہاں
جوشِ دیوانگی اب کاش پیچھا چھوڑ دے　　جذبۂ الفت کہاں اب اور یہ سودائی کہاں
حسرت و ارمان اب گھیرے ہوئے ہیں یوں مجھے　　کنجِ تنہائی میں شوقِ بزم آرائی کہاں

ولولے سب اب گئے تو شورش افزا کون ہو
خارزارِ زندگی میں گام فرسائی کہاں

سرگزشتِ نوجوانی اک فسانہ ہو گیا　　منقلب یعنی نصیبوں سے زمانہ ہو گیا
خواہشیں دل میں جو تھیں پیری میں سب جاتی رہیں　　صبح ہوتے قافلہ سارا روانہ ہو گیا
آرزوہائے مسلسل میں پڑا ہے تفرقہ　　کیا گھڑی آئی کہ برہم کارخانہ ہو گیا
ان علائق کا نہ آسانی سے دامن چھوٹتا　　ترکِ دنیا ہو مگر اچھا بہانہ ہو گیا

غم نہیں پیری اگر صبر آزما ہونے کو ہے
رندِ عشرت کوش بھی اب باخدا ہونے کو ہے

سید محمد تقی

لکھنؤ کے قدیم نظارے

شاہان اودھ اگرچہ ایک چھوٹی سی سلطنت کے مالک تھے لیکن شوکت پسندی اور اظہار جاہ و حشمت میں شاہان مغلیہ کے قدم بقدم چلتے رہے ان کے دربار کی شان و شوکت، ان کی سواریوں کا تزک احتشام، ان کے محلوں کی رفعت، ان کی تفریح گاہوں کی نفاست، ان کے جلسوں کی کیفیت، اور روزانہ زندگی کے واقعات بجائے خود ایک دلچسپ افسانہ ہیں جن کا ذکر موجودہ نسلوں کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دینے کو کافی ہے۔ ایسٹ انڈین کمپنی سے گہرے تعلقات قائم ہونے کی وجہ سے لکھنؤ ہمیشہ افسران کمپنی کی جولاں گاہ بنا رہتا تھا اور ہر اعلیٰ افسر کی آمد پر اظہار شان و شوکت کی حد ہو جاتی تھی خصوصاً گورنر جنرل، کمانڈر انچیف اور نئے رزیڈنٹ کا داخلہ نہایت شاندار ہوتا تھا اور استقبالی رسم اس شان و شوکت سے ادا کیجاتی تھی کہ ان سادہ مزاج اہل مغرب کو دریائے حیرت میں غرق کر دیتی تھی۔

استقبال خود بادشاہ یا ولیعہد سلطنت کرتا تھا اور اس کے بعد شاہی دعوت ہوتی تھی جس میں روشنی اور آتش بازی کے منظر نہایت تابناک ہوتے تھے۔ مارکوئیس آف ہیسٹنگز ایک منظر کا ذکر حسب ذیل کرتے ہیں:-

"قسطنیہ (جنرل مارٹین کی کوٹھی) کے ایک پھاٹک سے ہمنے اس"
"سڑک پر نظر ڈالی جو شاہی محل کیطرف گئی تھی۔ اس کے دونوں جانب"
"لکڑی کے ستون قایم کیے گئے تھے اور ہر ستون پر ہشیار گلاس روشن تھے"
"جب ہم آگے بڑھے تو روشنی کے بلند پھاٹک (ترپولیے) نظر آئے جو"

"جو بانس کے ٹھاٹھروں پر کپڑا منڈھ کے کھڑے کئے گئے تھے اور جو"
"سر سے پانوں تک روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ تھوڑی دور آگے بڑھ کے"
"ہم ایک ایسے مقام پر پہونچے جہاں دونوں جانب نہایت صاف و شفاف"
"عارضی بازار لگے ہوئے تھے ہندوؤں اور چینیوں کے قومی بانوں کی"
"حیرت انگیز تصویریں دکھائی گئی تھیں۔ اس کے بعد ہم ایک کوشک یا"
"گرمائی محل کے قریب پہونچے جو نہایت پُر تکلف طریقے سے آراستہ"
"تھا لیکن یہ تمام شور اور تابناک نظارے اس قلعہ نما احاطے میں پہونچکر"
"ماند پڑ گئے جو وعوت خانہ کے محاذی واقع تھا جس کی کھڑکیاں اس"
"احاطے کی طرف کھلی ہوئی تھیں۔ یہ احاطہ اس قدر وسیع تھا جس کی وسعت"
"انگلستان کے متوسط میدان کے برابر تھی۔ سارا احاطہ خوشرنگ پھولوں کی"
"کثرت سے باغ ارم معلوم ہوتا تھا۔ روشن گلاسوں اور قندیلوں کی تعداد جن سے"
"اس موقع پر زمین ڈھک دی گئی تھی بے انتہا تھی اور ان کے مختلف رنگوں"
"کی ترتیب نہایت خوش آیند تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ روشنی فی الحقیقت اپنی"
"قسم کی سب سے بہتر روشنی تھی جو میں نے دوسرے مقامات پر نہیں دیکھی"۔

دریائے گومتی پر روشنی اور آتش بازی کے منظر اس سے زیادہ دلچسپ ہوتے تھے۔ اس قسم کے ایک منظر کے متعلق مسٹر منڈی حسب ذیل رقمطراز ہیں:۔

"جو منظر یہاں (دریائے گومتی پر) میری نظر سے گذرا وہ کلیۃً دلکش اور"
"خالص مشرقی طرز پر مبنی تھا۔ یہ ایک ایسا منظر تھا گویا الف لیلہ کے کسی"
"تابناک سین کو واقعی طور پر پیش نظر کر دیا گیا ہے۔ رات اگرچہ تاریک"
"تھی لیکن آسمان بالکل شفاف تھا جس برآمدے پر ہم کھڑے ہوئے"
"تھے وہ لب دریا واقع تھا جس کے نیچے موجیں اپنی روانی کا لطف"

"دکھا رہی تہیں اور متعدد ساخت کی کشتیوں اور بجروں سے سارا دریا بھرا"
"ہوا تھا۔ دریا کے بیچوں بیچ میں ایک آراستہ کشتی پر ناچ ہو رہا تھا"
"جس میں ناچنے اور گانے والی طوائفوں کا ایک پورا گروپ تھا۔ تمام"
"منظر نیلی قندیلوں سے منور کیا گیا تھا جو اس ترکیب سے برآمدے"
"میں لگائی گئی تہیں کہ ان کی ٹھنڈی اور پر اسرار روشنی بغیر آنکھوں"
"کو تکلیف پہونچانے کے تمام سین پر چھائی ہوئی تھی۔ دریا کے دوسرے"
"کنارے پر جو اس کے محاذی واقع تھا اس سرے سے اس سرے تک"
"آتش بازی کی قطار تھی جو مختلف قسم کی تھی اور بہت بڑی گوناگونی پر مبنی"
"تھی، اور دریا کی سطح پر کشتیوں میں بھی اس کا انتظام تھا۔ تھوڑے"
"تھوڑے وقفے پر غبارے اڑائے جاتے تھے جو ایک شاندار"
"انداز سے ہوا میں بلند ہو کے باری باری سے کبھی کسی خوبصورت"
"محل کا کبھی کسی مندر یا مسجد کا نقشہ دکھاتے تھے جس کے طلائی"
"مینار ایک لمحہ کے لیے نہایت چمک دمک سے روشن ہوتے اور بعد ازاں"
"تاریک ہو کر غائب ہو جاتے تھے"

دریا میں روشنی ہندوستان کا ایک نہایت قدیم طریقہ ہے جو گنگا وغیرہ کے بڑے بڑے میلوں میں اب تک نظر آتا ہے۔ ہندی میں اسے "جل بہار" کہتے ہیں۔ زندہ دلان لکھنؤ نے جل بہار کو ایک خاص سالانہ میلے کے طور پر اختیار کیا تھا جس کی مٹی ہوئی نشانی اب تک باقی ہے۔ اس موقع پر دریا میں دور تک آراستہ کشتیاں چھوڑی جاتی تھیں جن پر زرتار شامیانے کھنچے ہوتے تھے اور جھاڑ، کنول، وغیرہ کی روشنی میں ناچ ہوتا تھا۔ دریا کے دونوں جانب کی عمارتیں اور ریتی، اور گھاٹ روشنی سے جگمگاتے تہے جن کی چھوٹ میلوں تک پہونچتی تی

لیکن روشنی کے سب سے زیادہ تابناک نظارے محرم کے ایام میں نظر آتے تھے۔ جب سارا شہر ایک بقعۂ نور معلوم ہوتا تھا۔ ہر گلی کوچہ امام باڑوں کی کثرت سے روشنی کا ایک خاص مرکز ہوتا تھا اور شاہی امام باڑوں کی تیاریاں بے پایاں تھیں جن کی تفصیل کو ایک دفتر درکار ہے حسین آباد اور شاہ نجف کی روشنی اگرچہ اب نصف سے بھی کم رہ گئی ہے۔ تاہم نو وارد لوگوں کے لیے وہ ایک حیرت انگیز منظر ہے۔ اس موقع پر یہ کہنا مبالغے میں داخل نہیں ہے کہ محرم کی تاریک راتیں اپنی جگمگاہٹ سے روز روشن کو شرماتی تھیں۔

اسیطرح آتش بازی بھی لکھنؤ کی ایک خاص صنعت تھی جس پر اب تک دنیا کا کوئی شہر سبقت نہیں لے گیا۔ آجکل لوگ امریکہ کی آتشبازی پر مٹے ہوئے ہیں جس کی ہوائیوں سے پریاں نکل کر ناچنے لگتی ہیں۔ راقم کو بھی کئی مرتبہ اس آتشبازی کے نظارے کا فخر حاصل ہوا ہے، اور اُسے دیکھ کر اس نتیجے پر پہونچا ہے کہ یہ اسی قدیم صنعت کی غیر مکمل نقل ہے جو عہد شاہی کے سیاحان لکھنؤ کی تحریروں سے اخذ کی گئی ہے جس طرح ہندوستان کی دوسری صنعتیں ولایتی آب وہوا میں پہونچکر مقامی رنگ میں جلوہ گر ہوئی ہیں، اُسی طرح لکھنؤ کی یہ صنعت بھی امریکن فضا میں پہونچکر سائنٹفک لباس میں نمودار ہوئی۔ امریکن آتش بازی میں سائنس کے خواہ کیسے ہی غیر معمولی کرشمے کیوں نظر نہ آئیں لیکن اس میں اُس صنعت کو مطلق دخل نہیں جس پر لکھنؤ عرصے تک ناز کرتا رہے گا۔ یہاں کی آتش بازی کے قلعے بجائے خود ایک تھیٹر ہوتے تھے جنھیں آگ دیتے ہی ایک اصلی جنگ کا نظارہ پیش نظر ہو جاتا تھا۔ طرفین کے سپاہی اور گولہ باری صاف نظر آتی تھی اور قلعے کے برج اور فصیلیں اور دوسری عمارتیں بالکل تھیٹر کی طرح روشن ہو جاتی تھیں۔ اسی طرح ہاتھیوں، بلند ٹھوں اور دوسرے

جانوروں کی لڑائیوں کے منظر نمایاں کیے جاتے تھے۔ غبارے، ہوائیاں، مہتابیں، اور دوسری قسم کی آتش بازیاں بھی خاص کیفیت رکھتی تھیں۔ لیکن اس فن کا سب سے بڑا کمال فرشی آتشبازی تھی جس کے شعلے سفید و شفاف فرش پر گرتے تھے لیکن اس میں دھبہ تک نہیں پڑتا تھا۔ شاید آجکل کے لوگوں کے خیال میں بھی یہ بات نہ آسکے گی کہ گنگچی، سرسوں اور الائچی کے دانوں میں بارود بھر کے ان سے آتشبازی کا کام کس طرح لیا جاتا ہوگا۔ لیکن اب سے چہارم صدی پیشتر تک نواب میرزا علی خاں صاحب جو حسین آباد کی پشت پر رہتے تھے۔ ایک سالانہ میلے کے طور پر اس قسم کی فرشی آتشبازی چھوڑا کرتے تھے جس میں اہل شہر کے علاوہ بعض جلیل القدر انگریز اور میمیں بھی آتی تھیں۔ ان کے کمال کی شہرت صرف لکھنؤ ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ "وکٹوریل لکھنؤ" کے انگریز مصنف نے بھی ان کا مجمل ذکر کیا ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی بے حقیقت آتشبازیوں کی حقیقت اس وقت ظاہر ہوتی تھی جب ان میں سے مختلف رنگ کے پھول پھل، پتے اور کلیاں نکل کر آتش بازی کا ایک مسلم درخت دکھا دیتی تھیں۔ لطف یہ کہ ان میں نہ دھواں ہوتا تھا نہ گندھک کی بدبو آتی تھی۔ اس مختصر نظیر سے [illegible] لکھنؤ کی نفاست پسندی کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔

ان شاہانہ مدارات اور دھوم دھامی جلسوں کے بعد گورنر جنرل یا دیگر اعلیٰ افسران کمپنی کے ساتھ ایک تخلیے کی صحبت بھی ہوتی تھی جس میں گورنر جنرل یا دیگر حکام کمپنی اور بادشاہ اودھ کے مابین امور سلطنت پر گفتگو ہوتی تھی اس موقع پر بادشاہ کو انتظامی معاملات کے متعلق ہدایتیں کی جاتی تھیں اور تمام امور [illegible] طے ہو جاتے تھے۔ یہ صحبت بادشاہ اور [illegible] میں کبھی ہفتہ وار ہوا کرتی تھی جسے عموماً [illegible] پانی کی

صحبت کہتے ہیں اس کا انعقاد باری باری سے کبھی شاہی محل میں ہوتا تھا اور کبھی رزیڈنسی کی عمارت میں۔ اس "چاء پانی" کے اخراجات میں تین ہزار ماہوار تھے جو شاہی خزانے سے دیے جاتے تھے۔

شاہان اودھ اگرچہ تمام امکانی امور میں مغل شاہنشاہوں کی تقلید کرتے تھے لیکن ان کی طرح کبھی روزانہ دربار کے پابند نہیں ہوئے۔ ان کے یہاں دربار عام دربار خاص کا کوئی طریقہ نہ تھا اور وزیر اعظم یا دیگر اعلیٰ افسران سلطنت صرف شاہی محل میں باریابی حاصل کر کے امور سلطنت کے متعلق گفت و شنید کرتے تھے۔ محل میں بادشاہ ایک طلائی پلنگڑی پر جلوہ افروز ہوتے تھے جو بہت قیمتی جواہرات سے مرصع ہوتی تھی۔ پلنگڑی کے چار کونوں پر چار بڑی تھیلیاں رکھی رہتی تھیں جن میں سے ایک میں روپیہ بھرا ہوتا تھا، دوسری میں اشرفیاں، تیسری میں جواہرات، اور چوتھی تھیلی میں سونے کے کڑے۔ جب بادشاہ کسی پر مہربان ہوتے تھے تو ان تھیلیوں میں سے جن کے منہ کھلے ہوتے تھے مٹھی بھر کے روپیہ، اشرفی، یا جواہرات دیدیتے تھے۔ سونے کے کڑے صرف خدمت گاروں کے لیے تھے جو ذرا ذرا سی بات پر انعام پاتے تھے۔

تاہم سال میں چند مرتبہ بڑے بڑے دربار ہوتے تھے خصوصاً عید، بقرعید اور نوروز کو نہایت تزک و احتشام سے دربار ہوتا تھا۔ محرم کے اختتام پر بھی ایک دربار لازمی تھا۔ خاص خاص تقریبات پر بھی عظیم الشان دربار ہوا کرتے تھے۔ [illegible] کا دربار بالکل رسمی طور پر ہوتا تھا جس میں رزیڈنٹ اور [illegible] صاحبان، وزرائے سلطنت شریک ہوتے تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ہر بادشاہ کے انتقال پر چند دعویدار سلطنت اٹھ کھڑے ہوتے تھے، لہذا جسے بادشاہ بنانا منظور ہوتا تھا اسے بعجلت تمام تخت پر بٹھا کر نذر دیدی جاتی تھی۔

اور توپوں کی سلامی شہر میں اعلان کر دیتی تھی کہ بادشاہ تخت نشین ہوگیا۔ ایک وجہ اس سادہ دربار کی یہ بھی تھی کہ شاہ متوفی کی لاش اُس وقت تک محل میں موجود ہوتی تھی اور اُس کی موجودگی میں زیادہ دھوم دھام خلاف تہذیب تھی۔ جب نیا بادشاہ تخت نشین ہولیتا تھا تو وزرا و امرا دست بستہ عرض کرتے تھے کہ "ایک غریب الوطن مسافر کا اس شہر میں انتقال ہوگیا ہے، جہاں پناہ اس کی تجہیز و تکفین میں امداد فرمائیں،، اس پر بادشاہ خزانۂ عامرہ سے ایک خاص رقم دلواتا تھا اور شاہ متوفی کی لاش محل کے چور دروازے نکالی جاتی تھی۔

بہرکیف شاہان اودھ میں نواب غازی الدین حیدر کے سوا کسی کی تخت نشینی کی رسم غیر معمولی تزک و احتشام سے نہیں ادا ہوئی۔ خاندان اودھ میں یہ پہلے شخص تھے جنھیں وزارت یا صوبہ داری کے درجہ سے بادشاہ کے مرتبے پر پہونچا دیا گیا تھا۔ چونکہ یہ ایک غیر معمولی عزت تھی جو اس خاندان کو پہلی مرتبہ حاصل ہوئی تھی لہذا اس موقع پر شاہانہ تزک و احتشام کی کوئی انتہا نہ تھی)۔ خزانہ اس بیشمار دولت سے لبریز تھا جو نواب سعادت علیخاں اپنی کفایت شعاری سے جمع کر گئے تھے اور جس میں بائیس کرور روپیہ نقد تھا۔ زر و جواہر کے انبار اس کے علاوہ تھے۔ بادشاہ کے لیے نیا تاج و تخت تیار کیا گیا تھا جو مکلل اور مرصع تھا۔ تمام سامان جلوس کی تیاری میں ایک کرور روپیہ صرف ہوا تھا۔ تمام شہر میں آئینہ بندی کی گئی تھی اور شاہی عمارات تکلف سے آراستہ ہوئی تھیں خصوصاً تخت گاہ (لال بارہ دری) کی آراستگی نہایت زور پر تھی جس میں جلوس کا دربار ہوا تھا۔ بادشاہ کئی کرور کے جواہرات زیب تن کیے ہوئے تھے۔ اہل دربار کی پوشاکیں نہایت زرق برق تھیں۔ جان منٹن صاحب رزیڈنٹ بھی درباری لباس پہنے ہوئے تھے زربفت کا جامہ پہنے ... زردار پالکی میں تشریف لائے تھے

ہوئے تھے اور سر پر شملہ معرق مع جیغہ و سرپیچ و گوشوارہ تھا۔ ان کے خاص خاص انگریز مصاحب بھی پر تکلف ہندوستانی لباس زیب تن کئے ہوئے تھے۔ تمام اقربائے شاہی و ارکان دولت و اہلکاران رزیڈنسی کو خلعت فاخرہ عطا کیے گئے تھے۔ نواب معتمد الدولہ کو خلعت وزارت اور خطاب وزیر اعظم دیا گیا۔ راجہ دیا کرشن کو دیوانی عطا ہوئی۔ سبحان علیخاں نے سکّہ شاہی کا شعر پیش کیا۔ پانچہزار روپے بطور انعام عطا ہوئے۔

سکہ زد بر سیم و زر از فضل رب ذو المنن
غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

دربار میں رزیڈنٹ کے سوا کسیکو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ تاجپوشی کے وقت مجتہد العصر نے تاج کو سونے کی کشتی سے اٹھا کر رزیڈنٹ کے حوالہ کیا اور انہوں نے بادشاہ کے فرق مبارک پر رکھ کے نذر دی۔ فوراً مبارک سلامت کے شور سے ساری عمارت گونج اٹھی شاہی توپخانے سے سلامیاں دغنے لگیں اور سارے شہر میں غلغلہ پڑ گیا۔ بادشاہ کے فرق مبارک پر سے جواہرات تصدق کر کے حاضرین دربار پر پھینکے گئے اور خاندان شاہی و ارکان دولت کی نذریں گذریں اس کے بعد شاہ برآمدے میں تشریف لائے۔ زیر ظل خلقت کا انبوہ تھا۔ یہاں بھی روپے اشرفی کی بارش ہوئی۔ ارباب نشاط نے گانا شروع کیا اور طرح طرح کے تماشے ہونے لگے +

مسٹر ابرلش نے اپنی دلچسپ تصنیف سین اینڈ کیرکٹرس میں شاہ نصیر الدین حیدر کے ایک دربار کا نقشہ دکھایا ہے جو خالی از لطف نہیں :-

"اورنگ شاہی ایک مربع تخت ہے جو زمین سے دو فیٹ بلند ہے، اور
"جس کے تین جانب کٹہرے لگے ہوئے ہیں۔ اس کے اوپر ایک تاج"

"شامیانہ ہے جس کی چوبوں پر خالص سونے کے پتر منڈھے کے نہایت بیش"
"قیمت جواہرات جڑے گئے ہیں۔ شامیانہ قرمزی رنگ کی کاشانی"
"مخمل کا ہے جس پر زردوزی کا نہایت نفیس کام ہے اور چاروں طرف"
"موتیوں کی بہت دبیز جھالر لگی ہوئی ہے جس مسند پر بادشاہ رونق"
"افروز ہیں وہ بھی اسی قسم کی مخمل کی ہے اور اسپر بھی زردوزی کا نہایت"
"عمدہ اور بھاری کام بنایا گیا ہے۔ نیز چتر شاہی بھی اسی کا ہے اور اسکے"
"گرد بھی خوش آب موتیوں کی دبیز جھالر ہے۔ خود بادشاہ سلامت بھی"
"سر سے پانوں تک بیش بہا جواہرات میں غرق ہیں خصوصاً گردن"
"سے کمر تک الماس، یاقوت اور زمرد وغیرہ کے مالے ہی مالے"
"نظر آتے ہیں۔ تاج شاہی بھی جواہرات کا تا استدل ہے جس کے"
"بالائی حصے میں بہشت کی چسٹریا (ہما) کے پر لگے ہوئے ہیں تخت"
"کے دونوں جانب دو اعلیٰ عمدہ دار مور کے پروں کی مورچھلیں ہلا"
"رہے ہیں جن کے دستے طلائی ہیں تخت کے داہنے جانب دو"
"طلائی کرسیاں بچھی ہوئی ہیں جو رزیڈنٹ اور اُن کی بیوی کے"
"لیے مخصوص ہیں۔ ان کرسیوں کے عقب میں اُن انگریزوں کی"
"جگہ ہے جو رزیڈنسی سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن کرسیوں کے"
"دونوں پہلوؤں میں رزیڈنسی کے شاہی ملازم استادہ ہیں جنکی"
"پوشاکیں نہایت زرق برق اور طلاکار ہیں تخت کے بائیں طرف"
"دیسی امرا اور اعیان دولت کی جگہ ہے جن کے درباری لباس نہایت"
"فوق البھڑک اور قیمتی ہیں"
"بادشاہ کے قدموں کے پاس وزیر اعظم کھڑا ہوا ہے جو نذریں پیش"

"کرتا ہے۔ نذروں کی تعداد کبھی اشرفیوں سے لیکر چند روپیوں تک"
"محدود ہے اور یہ نذر دینے والے کی حیثیت اور مرتبے سے تعلق رکھتی"
"ہے۔ نذر پیش کرتے وقت لوگ تخت کی جانب بڑھتے ہیں اور ہر"
"زینے پر باقاعدہ آداب بجالاتے ہیں۔ حتٰی کہ بادشاہ کے قریب"
"پہونچکر اپنی نذر کو ایک تہ کئے ہوئے رومال پر رکھکے پیش کرتے"
"ہیں اور بادشاہ اُسے قبول کرنے کے انداز سے ہاتھ لگا دیتے ہیں۔"
"بعد ازاں یہ رقم وزیر اعظم کو دیدی جاتی ہے جو اُسے لیکر اُس ڈھیر"
"میں شامل کر دیتا ہے جو اُس کے پہلو میں لگا ہوا ہے۔ اس تقریب"
"کے بعد بادشاہ اور رزیڈنٹ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بادشاہ ایک"
"شخص کے ہاتھ سے جو اسی خدمت پر مامور ہوتا ہے گوٹے کے ہار"
"لیتا ہے اور خاص اپنے ہاتھ سے رزیڈنٹ کے گلے میں ڈالتا"
"ہے۔ بعد ازاں رزیڈنٹ بادشاہ سے رخصت ہوتا ہے اور بادشاہ"
"اس کے ساتھ دروازے تک آتا ہے جہاں ایک مختصر جملہ خدا حافظ"
"کہتا ہے اور تھوڑا عطر رزیڈنٹ کے ہاتھ پر اونڈیل دیتا ہے۔ اگر"
"رزیڈنٹ سے زیادہ موافقت ہوتی ہے تو یہ رسم ان انگریزوں کے"
"ساتھ بھی ادا کیجاتی ہے جو شریک دربار ہوتے ہیں"+

"ان درباروں میں خلعت، انعامات، اور خطابات بھی عطا ہوتے"
"ہیں۔ انعامات میں بیشتر ہاتھی مع ہودج یا گھوڑا مع زین و ساز، یا پالکی"
"جھالردار ہوتی ہے۔ اس موقع پر نذر انعامات کی مناسبت سے"
"پیش کیجاتی ہے حتٰی کہ بڑے بڑے عہدے اور جاگیریں پانے"
"والوں کی نذر بعض اوقات ایک لاکھ روپیہ سے کم نہیں ہوتی۔"

"۔ رقم ریشم کی ایک سو تھیلیوں میں لیجائی جاتی ہے، جن کے منہ نقرئی "
" ڈوریوں سے بندھے ہوتے ہیں "

اسی کتاب میں شاہی سواری کے ایک جلوس کی کیفیت حسب ذیل قلمبند کی گئی ہے جب شاہ موصوف بتقریب کے موقع پر عیدگاہ تشریف لے گئے تھے:۔

"شاہی جلوس کے آگے آگے پچاس ہاتھی تھے جو شاہی نشان اور"
"شاہی مراتب وغیرہ لیے ہوئے تھے۔ ہر ہاتھی پر ایک فیلبان اور"
"دو بندوقچی سوار تھے جن کی وردیاں سفید تھیں۔ اور پگڑیاں اور"
"کمربند سرخ و سبز بانات کے تھے۔ ان کے بعد توپخانہ کی ایک"
"جماعت تھی جس کے گولنداز دں کی وردی نیلی تھی۔ اس کے"
"بعد سواروں کے دو رسالے تھے جن کی وردیاں گلنار تھیں اور"
"سیاہ ٹوپیاں دیے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے پیدل فوج"
"کا ایک دستہ تھا جس کے ساتھ فوجی ڈنکا بجتا جاتا تھا۔ اس کے"
"سپاہی گھٹنوں تک کا پائجامہ اور اونچی اونچی سرخ کرتیاں پہنے"
"ہوئے تھے اور سر پر چھوٹی چھوٹی پگڑیاں باندھے ہوئے تھے"
"جلوس کے سب سے زیادہ شاندار حصے میں بادشاہ کی "فیل گاڑی" تھی"
"جس کے آگے آگے نجیبوں کا ایک زبردست غول تھا۔ اس نقرئی"
"گاڑی میں بادشاہ ایک فاتحانہ انداز سے تخت پر بیٹھے ہوئے"
"تھے جو ان کے دربار کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھی۔ گاڑی میں چار"
"ہاتھی جتے ہوئے تھے جو رنگ روپ اور قد و قامت میں بالکل"
"یکساں تھے۔ اس کے پیچھے پیچھے ندیمان شاہی اور ارکان دولت"
"کی گاڑیاں تھیں جن میں صرف دو دو ہاتھی جتے ہوئے تھے لیکن"

"سب کی سب طلائی و نقرئی پتروں سے منڈھی ہوئی تھیں۔ جو نمک"
"خواران شاہی ان گاڑیوں میں سوار تھے وہ سر سے پاؤں تک جواہرات"
"اور زربفت میں جگمگا رہے تھے۔ ان کے شملوں میں نہایت قیمتی"
"جواہرات کی کلغیاں لگی ہوئی تھیں۔ اور بیش قیمت موتی اور جواہر"
"کے طرے، بازوبند، بدھیاں اور انگوٹھیاں وغیرہ پہنے ہوئے"
"تھے۔ اِن کے پاؤں میں گھیتلے جوتے تھے جو مرصع بجواہر تھے"
"اور زر دوزی کپڑے یا قیمتی شال سے بنائے گئے تھے۔ ان گاڑیوں"
"کے ارد گرد چوبداروں، خواصوں، ہرکاروں اور دیگر شاہی ملازموں"
"کے غول تھے، جن میں بعض ننگی تلواریں چمکاتے جاتے تھے،"
"بعض چنوریاں ہلا رہے تھے۔ اور بعض بہ آواز بلند ان عالی مرتبت"
"اُمرا کے نام و خطاب پکارتے جاتے تھے جن کی سواریوں کے"
"وہ ہمراہ تھے۔ ان کے دونوں پہلوؤں میں بے قاعدہ سواروں کا"
ایک زبردست ہجوم تھا جو نیزہ بازی اور دوسرے فوجی کرتب"
"دکھا رہے تھے۔ ان کے بعد بادشاہ کے کوتل گھوڑوں کی قطار"
"تھی جو مرصع ساز و یراق سے آراستہ تھے اور جن کے سائیسوں کی"
"وردیاں نہایت زرق برق تھیں۔ ان کے پیچھے شاہی پالکی راہ"
"میانہ تھا۔ یہ دیسی سواریاں نہایت شاندار وضع رکھتی ہیں جو خاص"
"سونے کے پتروں سے منڈھی ہوئی تھیں۔ ان کے کہاروں کی"
"لمبی وردیاں گلنار تھیں جن پر سنہری کارچوب کا کام تھا اور"
"ان کی پگڑیوں میں طلائی مچھلیاں اور شاہی مار کے لگے ہوئے"
"تھے۔ جلوس کے اس حصے میں ایک انگریزی ساخت کی بگھی تھی"

" خاص شان رکھتی تھی جس میں مشکی گھوڑے جتے ہوئے تھے اور "
" جسے ایک یوروپین کوچبان گلنار وردی پہنے ہوئے ہنکار رہا تھا "
" بادشاہ کے انگریز مصاحب بھی درباری لباس پہنے ہوئے ہاتھیوں "
" پر سوار تھے، اور اُن کے پیچھے دیسی اُمرا کے ہاتھیوں کی ایک "
" لمبی قطار تھی۔ سب سے آخر میں سوار اور پیدل سپاہیوں کے دستے تھے "
" ان میں جو پلٹنیں ایسٹ انڈیا کمپنی سے تعلق رکھتی تھیں اُن کے "
" قومی جھنڈے کھلے ہوئے تھے اور فوجی باجہ بجتا جاتا تھا۔ ان کے "
" علاوہ تمام جلوس میں ہزاروں کارچوبی بیرقیں اور جھنڈیاں ہر جگہ "
" ہوا میں لہرا رہی تھیں "۔
" باوجود اس کمی انتظام اور بے قاعدگی کے جو ایسے عظیم الشان جلوس کے لیے "
" جلوس کے لیے لازمی ہے، تمام جلوس بغیر کسی خاص ہنگامے کے "
" جس میں فوجوں کی سلح شوری نے بہت کچھ اضافہ کر دیا تھا، منزل "
" مقصود تک پہونچ گیا۔ اس موقع پر یوروپین باجوں کے لیے دیسی "
" قرنا اور ڈھول وغیرہ کے شور کی ہمسری بالکل فضول تھی۔ جلوس "
" کے عیدگاہ تک پہونچنے پر محتشم العصر نے نماز وغیرہ مذہبی رسوم "
" ادا کیے اور بادشاہ کے ہاتھ میں ایک چھری دی جسے انہوں نے "
" کلمہ تکبیر پڑھتے ہوئے ایک اونٹ کی گردن میں پیوست کر دیا جو "
" قربانی کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ توپخانے کے گولنداز اسی وقت "
" کے منتظر تھے اور انہوں نے اشارہ پاتے ہی توپیں داغنا "
" شروع کر دیں جن کی گھن گرج آوازوں سے تمام شہر گونجنے "
" لگا اور سب کو اطلاع ہو گئی کہ بادشاہ قربانی کی رسم ادا کر چکے "۔

لکھنؤ کے پرانے سین دکھاتے ہوئے ہم ایک شادی کا ذکر کیئے بغیر نہیں رہ سکتے یہ نواب آصف الدولہ بہادر کے نام نہاد پسر اور ولیعہد سلطنت میرزا وزیر علیخاں کی شادی تھی جس کی نسبت مورخین کا بیان ہے کہ خاندان مغلیہ کے زوال کے بعد سے ہندوستان کو پھر کبھی ایسی دھوم دھام دیکھنا نصیب نہیں ہوئی صاحب قیصر التواریخ لکھتے ہیں کہ: "۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷۹۴ء شادی میرزا وزیر علی خاں کی ہوئی جس میں تیس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ جتنے صاحبان عالیشان اور امراے عالیقدر دور نزدیک کے تھے سب شریک ہوئے تھے۔ صحبت مجلس عیش باغ وچار باغ میں ہوئی۔ اس خاندان میں اس تکلف کی کسیکی شادی نہیں ہوئی اور نہ اس قدر روپیہ صرف ہوا۔ اب اس کا احوال مثل کہانی خیالی کے ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ شاہجہاں آباد میں بھی دو شادیاں یادگار زمانہ ہوئیں۔ ایک نواب شجاع الدولہ بہادر کی دوسری جوگل کشور کی۔ میرزا وزیر علی خاں کی شادی کا شمہ یہ ہے کہ پانسو چوگھڑا فقط چاندی کا تھا۔ حضرت خلد منزل (آصف الدولہ) نے فرح بخش میں نہر کے دونوں طرف "قصر فلک" بنوایا تھا۔ ظفر الدولہ (داروغہ خزانہ) نے کوٹھے (خزانہ) سے بھی چاندی کے گھڑے دیے تھے۔"

اس شادی کی کسیقدر تفصیلی کیفیت مسٹر فوربس کی نفیس کتاب "مشرقی کہانیاں" میں درج ہے جو اس شادی میں بہ نفس نفیس شریک تھے اور جنکا بیان البتہ زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

"آصف الدولہ نے شہر کے قریب ایک میدان میں اپنے"
"خیمے نصب کیے تھے۔ ان میں دو بہت عظیم الشان خیمے تھے"
"یہ بہت مضبوط سوتی کپڑے کے تھے جن میں اعلیٰ قسم کی انگریزی"

"بانات کی رنگ برنگ کی دھاریاں دی گئی تھیں۔ ان کی ڈوریاں"
"بھی ریشمی تھیں۔ ان میں ہر خیمے کی لاگت ساٹھ ہزار پاونڈ اسٹرلنگ"
"کے قریب تھی۔ ان کی دیواروں کی قناتیں دس فیٹ اونچی تھیں"
"اور چلمنوں کے ذریعے سے دونوں خیموں میں الحاق قایم کیا گیا"
"تھا تاکہ پردہ نشین بیگمات محفل کا نظارہ کر سکیں۔ شادی کے"
"روز نواب آصف الدولہ دو ملین اسٹرلنگ کے قیمتی جواہرات"
"پہنے ہوئے تھے محفل والے خیمے میں دو سو نفیس جھاڑ دو سو"
"ہانڈیاں اور کئی ہزار کنول روشن تھے۔ ایک سو طائفوں کا"
"ناچ تھا جن کی پشوازیں نہایت زرق برق تھیں اور جو ہندی"
"فارسی مخلوط زبان میں گاتے اور ناچتے تھے۔"
"دولھا جس کی عمر تیرہ سال کی تھی سر سے پاؤں تک اس قدر"
"جواہرات میں لدا ہوا تھا کہ مشکل سے جنبش کر سکتا تھا۔ دلہن"
"کی عمر دس سال کی تھی اور وہ اسیطرح جواہر کے دریا میں غرق تھی"
"سات بجے شام کو دونوں جدا جدا ہاتھیوں پر ایک حیرت انگیز"
"باغ میں لائے گئے جو ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ برات"
"کے جلوس میں صرف بارہ سو ہاتھی تھے جو زربفت کی جھولوں"
"اور قیمتی زیورات سے آراستہ تھے۔ ان میں ایک سو ہاتھیوں پر"
"چاندی کے ہودے رکھے ہوئے تھے سب کے بیچ میں آصف الدولہ"
"کا ہاتھی تھا جس کا قد و قامت نہایت غیر معمولی تھا۔ اس پر"
"جو ہودہ رکھا ہوا تھا وہ خالص سونے کا تھا اور اس میں"
"بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کی جھول"

معزز تھی اور تمام زیورات نہایت بیش قیمت تھے۔ نواب کے
دائیں پہلو میں ہمارے رزیڈنٹ مسٹر بانسٹن بیٹھے ہوئے
تھے اور بائیں جانب دولھا متمکن تھا"

خیموں سے باغ تک سڑک کے دونوں جانب روشنی اور آتشبازی
ہو رہی تھی اور ہاتھی سے ہر قدم پر ہمارے سامنے کی [illegible]
چمک اٹھتی تھی۔ ہزاروں ہوائیاں ہوا میں بلند ہو کر آسمان تک کو منور
کر دیتی تھیں اور ان پر مہتابیوں کی روشنی کے اضافہ سے تاریک رات
روز روشن معلوم ہوتی تھی۔ ساری رات میں مشعلوں اور پنچشاخوں کے علاوہ
صرف تین ہزار کنول روشن تھے جنھیں خدمتگار لیے ہوئے تھے
اس شاہانہ تزک و احتشام سے ہم لوگ باغ تک پہنچے اور ہاتھیوں سے اتر کے
اس میں داخل ہوئے۔ باغ میں مختلف رنگ کی بیشمار قندیلیں روشن
تھیں جو درختوں کی شاخوں میں آویزاں لٹکی تھیں۔ اس کے وسط میں
ایک عظیم الشان عمارت تھی جس کے زینے پر چڑھ کے ہم ایک وسیع
مہمان خانہ میں داخل ہوئے جو نہایت نفاست سے آراستہ کیا گیا تھا
اسمیں انگریزی ساخت کے جھاڑ کنول لگے ہوئے تھے جن میں مومی
شمعیں روشن تھیں۔ یہاں ہمارے سامنے ولایتی اور دیسی قسموں میں نہایت
نفاست کے ساتھ کھانا چنا گیا۔ ساتھ ہی تقریباً ایک سو طائفے اپنی
سریلی آوازوں میں گانے اور اپنا دیسی ناچ دکھانے لگے صبح صادق
تک یہی پرلطف جلسہ رہا۔ اس کے بعد ہم لوگ اپنے گھروں کو واپس ہوئے
اس تقریب کے تمام اخراجات جسمیں تین راتوں تک متواتر ایسے ہی جلسے
ہوتے رہے تین لاکھ پونڈ (پینتالیس لاکھ روپیہ) سے زائد تھی۔

عذر تقصیر

میں گنہگار ہوں بندہ ترا اے ربِّ قدیر جرم وہ میں نے کیے ہیں کہ نہیں جن کی نظیر
سوچتا ہوں تو نکلتی نہیں کوئی تدبیر تا کہ ہو روزِ جزا کچھ نہ سزائے تقصیر

یوں تو ہو گر یہ بہت بیمِ قیامت سے مجھے
نا اُمیدی نہیں لیکن تری رحمت سے مجھے

صاف ظاہر ہے کہ میں عفو کے قابل ہی نہیں عذر بے جا ہے مرے کچھ مجھے حاصل ہی نہیں
یہ تو کس طرح کہوں میں کہ تو عادل ہی نہیں ہاں ۔ مگر رحم جو آ جائے ۔ تو مشکل ہی نہیں

کام دشوار سے دشوار بھی آساں ہو جائے
یک قلم محو مرا دفترِ عصیاں ہو جائے

تجھکو معلوم ہے کوئی بھی نہیں میرا کفیل کم بضاعت ہوں میں سرمایۂ نیکی ہے قلیل
دل کو میرے ہے یہی فکر خداوندِ جلیل کہیں محشر میں نہ ہو جاؤں میں رسوا و ذلیل

آبرو کا ہوں طلب گار وہ انساں ہوں میں
تجھ سے بحرِ کرم فیض کا خواہاں ہوں میں

یوں تو دولت بھی زمانے میں عجب نعمت ہے باعثِ عیش و نشاط و طرب و عشرت ہے
اس سے مفلس کو بھی زردار کو بھی الفت ہے جمع کرنا مگر اس چیز کا اک آفت ہے

سببِ جاہ و حشم کچھ زر و دولت ہی نہیں
آبرو جس کی نہیں اس کی کچھ عزت ہی نہیں

بس اگر ہے بھی تو یا رب مجھے عزت کا خیال دوسرا کوئی نہ اندیشہ نہ غم ہے نہ ملال ۔
کون ہے تیرے سوا اور مرا واقفِ حال تجھکو اے صاحبِ قدرت نہیں کچھ امرِ محال

میری جانب نظر شافعِ محشر ہو جائے
آبرو ذرّہ کی خورشید سے بڑھکر ہو جائے

دستگیری کو مری جب ہوں محبوبِ خدا　　اور فرمائیں کہ اے بندۂ عاصی اٹھ آ۔
چل شفاعت کے لیے ہوتا ہوں ضامن تیرا　　کیوں ہراساں ہے؟ محمدؐ سا جو ہے راہنما!

بحرِ عصیاں سے کہیں وہ۔ کہ نکالا ہیں سے
تو یہ فرمائے کہ بخشا اسے بخشا ہیں سے

جب کہیں وہ کہ تھی ہر چیز سے نفرت اس کو　　تھی نہ دنیا سے دلی سے بھی محبت اس کو
مجھ سے تھی یا میری اولاد سے الفت اسکو　　حکم صادر ہو ترا بخشدو جنت اس کو

جائے کوثر پہ۔ یہ ہے عاشقِ اولادِ رسولؐ
عذرِ تقصیر کو (اللہ!) کیا ہم نے قبول

آغا غلام حسین ارشد

غزل

بادہ کشِ الست ہوئے ہوشیار کب　　قالو بلا کہے سے بھی اترا خمار کب
تو ہی نہ ہوتا گل میں جو جلوہ نما تو پھر　　یوں چیخ چیخ جان کو کھوتا ہزار کب
ہر ہر قدم پہ تیرے قیامت بپا ہوئی　　فتنہ نے تیری چال سے پایا قرار کب
جنت میں اس کے ملنے کی ہوتی نہ گر امید　　کرتے پسند مے کو بھلا بادہ خوار کب
ہوکر کے نیم بسملِ تیرِ نگاہِ شوخ　　تڑپا نہ مثلِ مرغ دلِ بیقرار کب
یہ بیخودی شوق میں کیا ہوکے رہ گیا　　دستِ خیال چھٹ گیا دامانِ یار کب

دن رات زلف و رخ کا چھٹا ان کے کب خیال
خورشید سے جنوں میں چھٹے غمگسار کب

جعفر نبیل

رسم و رواج اور انسان کی فطرت

اِس امر سے شاید کسیکو بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ بھلائی اور بُرائی کے جانچنے کا معیار خود انسان کی فطرت ہے۔ دنیا کی ہر شے ہماری ذات کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رکھتی ہے۔ گو وہ تعلق عام طور پر ایک ساں نہیں ہوتا۔ بعض چیزوں کے ساتھ ایسا تعلق ہوتا ہے جسے ہم خوشگوار کہتے ہیں۔ اور بعضوں کے ساتھ ایسا جسے ناگوار سمجھتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ دراصل خوشگواری یا ناگواری کیا ہے۔ ہم اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ گلاب کا پھول دیکھنے میں اچھا سا معلوم ہوتا ہے اور خوشبو بھی ہے۔ برعکس اس کے کسی بدبودار شے (فرض کیجئے ہینگ) سے ہمیں ایک قسم کی نفرت سی پیدا ہوتی ہے اُس کی بُو سے ہمارا دم ناک میں آتا ہے۔ یہی خوشگوار یا ناگوار تعلق کا احساس جو ہمارے اور دنیا کی ہر شے کے ساتھ وابستہ ہے اُس فطرت کا پتہ دیتا ہے جو صانع مطلق نے ہماری تخلیق میں ملحوظ رکھی ہے فطرت انسان کو محض اُن محسوسات اور کیفیات سے تعلق ہے جو حواس ظاہری و باطنی کا نتیجہ ہیں ہم کسی چیز کو دیکھ کر یا سنکر سونگھ کر چھُو کر یا چکھ کر کیوں محظوظ یا منغص ہوتے ہیں؟ صرف اس وجہ سے کہ ہمارے حواس خمسہ اوسی طور کی شہادت دیتے ہیں۔ دنیا میں ہر شے کے جانچنے کا آلہ یہی حواس خمسہ ہیں اور ہماری فطرت انہیں حواس خمسہ کی ماتحت ہے۔

ہمیں دنیا میں ایک خوشگوار زندگی بسر کرنے کے لیے خود ہماری فطرت ایک بہترین رہنما ہے۔ نیچر کے سارے کارخانے ایک مستقل اصول کے پابند ہیں جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتے۔ ہماری فطرت کا مقتضا بھی یہی ہے کہ

ہمارے سارے کام اسی اصول پر منضبط ہوں - اگر ہم اس غیبی رہنما (یعنی فطرت)
کے نقش قدم پر چلتے چلیں تو کبھی راہ راست سے بھٹک نہیں سکتے - یہ غیر ممکن
ہے کہ ہم اس سچے راہ نما یعنے اصول فطرت کی مخالفت کرکے راہ سے گمراہ
چلیں اور پھر منزل مقصود تک پہونچ بھی جائیں - ہم ہزار اس کی مخالفت کریں مگر
اس پر کبھی فتح نہیں پا سکتے - ہم ہزار اس سے انحراف کریں مگر اس کی استحکام میں
کبھی فرق نہیں آسکتا قطب نما کی صداقت سے اگر ہم انحراف کریں تو خود
منزل مقصود سے کوسوں بھٹک جائیں گے - لارڈ بیکن کا قول ہے کہ نیچر پر ہم
کسی طرح فتح نہیں پا سکتے سوائے اس کے کہ ہم اس کی متابعت کریں - اور اسی
مضمون کو لارڈ ٹینی سن نے یوں ادا کیا ہے کہ ہم نیچر کی (قوتوں کی) متابعت
کرکے اس پر حکمرانی کرتے ہیں - علاوہ ان حکما کے حکیم علی الاطلاق خداوند
جل شانہٗ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے "لا تبدیل لفطرت اللہ" یعنے فطرت نہیں
بدلتی اور یہ بھی فرمایا ہے "فطرت اللہ فطرت الناس" یعنے یہ وہی فطرت ہے جس کے
مطابق انسان کی تخلیق واقع ہوئی ہے - پس جب فطرت کے قوانین ایک ایسے
مستحکم اصول پر ہیں کہ ان سے انحراف یا چشم پوشی یا بے پروائی کرکے سوائے
خجلت یا پشیمانی یا ہلاکت کے اور کچھ نہیں ہاتھ آتا اور نہ ہماری مخالفت سے
ان میں کوئی تغیر پیدا ہو سکتا ہے تو انحراف ہمارا (خواہ وہ ہماری معاشرت کے
متعلق ہو یا ہمارے سوسائٹی یا قومی اور ملکی ضروریات یا زندگی کے اور کسی امور
کے متعلق ہو) خود ہماری تباہی اور ہلاکت کا باعث ہوگا - اور دشوار اور پیچیدہ
مرحلوں میں پھنسا کر منزل مقصود سے ہمکو بہت دور بھٹکا دیگا اور اگر اسیکو مذہبی
رخ سے دیکھئے تو ایک گناہ بھی ہے - لہذا فطرت کی مطابقت کا حق یہ ہے
کہ اسکی جو ہدایت جہاں پر ہو اس پر کاربند ہو اور جہاں جس امر سے یہ روکے

اُس سے اجتناب کرے۔

جب یہ امر یقینی ہے کہ دنیا میں رہ کر اصول فطرت سے انحراف کرنے والا ہمیشہ نادم اور پشیمان ذلیل و خوار رہے گا۔ تو شاید ہی کوئی شخص ایسا جاہل ہوگا جو دانستہ منشا رفطرت کی مخالفت کرکے اپنے تئیں مورد بلا بنانا پسند کرے گا۔

مگر افسوس اور ہزار افسوس اس امر کا ہے کہ بدقسمتی سے انسان میں خلاف فطرت و مضر صحت چند ایسے رسم و رواج جاری ہو گئے ہیں جو بالکل مقتضائے فطرت کے منافی ہیں عقل کا منشا اور ہادی فطرت کی ہدایت تو یہ تھی اور ہمیشہ رہے گی کہ رسم و رواج عین فطرت کے مطابق ہوتے مگر کسی نہ کسی وجہ سے اکثر اقوام میں ایسی ایسی رسمیں جاری ہوگئیں جو بالکل ناپسندیدہ اور خلاف عقل ہیں میں اُن سب رسم و رواج کا یہاں پر نام لینا نہیں چاہتا کہ وہ کون کون سے اور کہاں کہاں ہیں۔ فقط اس قدر دکھانا منظور ہے کہ اندھی تقلید میں انسان نے کیا کیا ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اگر مذہبی حیثیت سے بھی ہم دیکھیں تو ظاہر ہے کہ اصول فطرت کو ایک مستحکم بنیاد پر خدا ہی نے قائم کیا اور گویا اُس کی مخالفت عین خدا کی مخالفت ہے۔ کیسی سچے دین کے احکام کبھی فطرت کے خلاف نہیں پائے جائیں گے۔ پھر کس قدر تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ ہم بعض رسم و رواج کی اندھی تقلید کے پیچھے نہ حکم خدا پر نظر رکھتے ہیں اور نہ فطرت کے منشار پر غور کرتے ہیں اور گو اس کے بُرے نتیجے بھگتنے بھی پڑتے ہیں مگر اُن رسم و رواج قبیح کو نہیں چھوڑتے +

منشا رفطرت کے خلاف عمل پیرا ہونے کی ایک عمدہ مثال رومن کیتھولک فرقہ کے عیسائیوں میں "مونک" اور "نن" بنانے کا دستور ہے۔ مونک اُن پادریوں کو کہتے ہیں جو تمام عمر شادی نہیں کرتے۔ اسیطرح "نن" اون عورتوں کو کہتے ہیں

تمام عمر کنواری بیٹھی رہتی ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی ایک یہ رسم جاری ہے کہ جو لڑکیاں کمسنی میں بیوہ ہو جاتی ہیں اُن کا عقد ثانی نہیں کرتے اور خدا جانے کیونکہ وہ لوگ اپنی زندگیاں بسر کرتے ہیں۔

اب یہ امر قابل غور ہے کہ انسان فطرت کے تقاضوں سے منہ پھیر کر اور بے پروائی کر کے کہاں تک اور کب تک تندرست اور کامیاب ہو سکتا ہے۔ اور جو کچھ [illegible] اس قسم کے مخالفت فطرت سے پیدا ہو سکتے ہیں وہ ذیل میں مختصراً بیان کریں۔

ظاہر ہے کہ جب ہم کو بھوک لگتی ہے تو کھانا کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں۔ پیاس لگتی ہے تو پانی پی لیتے ہیں۔ [illegible] جسم کے تحفظ کے لیے اور گرمیوں میں لُو سے بچنے کے لیے سامان ضروری کر لیتے ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر ان تقاضائے فطرت سے ہم بے پروائی کریں گے تو نتیجہ ہمارے ہی حق میں مُضر اور تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ غرض باوجودیکہ ہم ان فطرت کے نتائج کی نسبت عین الیقین رکھتے ہیں پھر بھی بعض رسم و رواج کے پیچھے ان نتیجوں کو برداشت کرتے ہیں۔

ہم کو جاننا چاہیے کہ فطرت کی متابعت ہی میں ہماری فتح ہے اور اُس سے جنگ کرنے میں خود ہماری شکست اور ہلاکت ہے۔ نتیجہ اس بحث کا یہ ہے رسم و رواج جو اصول فطرت کے بالکل مطابق ہیں اور کسی طور سے مضر صحت مخرب اخلاق نہیں ہیں وہ ہی قابل معاونت کرنے کے ہیں اور جو رسم و رواج فطرت کے خلاف ہیں اُن کا سوسائٹی سے بالکل نکال دینا لازم ہے [illegible] توجہ نہیں کریں گے [illegible] رواج خلاف فطرت [illegible] جاری ہیں بس ایک یہی [illegible]۔

[illegible]

[illegible]

مدینہ کی ایک مغنیہ (عزۃ المیلا)

طویس مغنی

گذشتہ سے پیوستہ

کھانا کھاتے کھاتے بھی سمیہ ان مناظر لطیف کو آنکھ اٹھا اٹھا کر دیکھتی جاتی تھی، کہ عزہ نے اُس سے پھر سوال کیا کیوں سمیہ؟ تم نے مجھے ابتک اس کا جواب نہ دیا؟ تم پر اس خاموشی کیوں چھا گئی ہے [illegible] عزہ [illegible] کہ سمیہ نے ان مغربی مناظر کو دیکھا، تو حیرت سے اس کی پتلیاں اس طرف جم گئیں منہ کا لقمہ وہ چبانا بھول گئی، اور ہاتھ کا لقمہ ہاتھ ہی میں رہا۔

عزہ نے پھر مکرر سوال کیا، اور حیرت کی وجہ پوچھی، اس پر وہ کھانے میں مشغول ہوکر بولی مجھے یہ درخت متحرک سے معلوم ہو رہے ہیں، خدا جانے کیوں؟ میری نظر ایسی غلطی کھا رہی ہے؟ اب عزہ نے بھی ادھر دیکھا، اور ذرا آنکھ جما کر دیکھنے سے اسے اس کی کنہ معلوم ہوئی، درختوں کے نیچے دو شتر سوار جا رہے ہیں، اور ان کی رفتار سے درخت بھی متحرک نظر آتے ہیں، پھر اس نے سمیہ کے شک کو اس خیال سے رفع کیا، سمیہ بھی مان گئی، اور اس نے کہا، کہ اسی طرح دو شتر سوار پانی کے اندر بھی نظر آتے ہیں، جس پر عزہ ہنسنے لگی۔ اور خوش طبعی سے اپنا ہاتھ اس کے گال پر آہستہ سے طمانچہ مار کر بولی "بھولی لڑکی پانی میں جو شتر سوار نظر آتے ہیں، وہ ان سواروں کا جو تالاب کے کنارہ جا رہے ہیں عکس ہے،

بلکہ ان کے پیچھے ایک ایک تیسرا سوار بھی دو درختوں کے جھنڈ سے نکل رہا ہے اتنے میں وہ سوار درختوں کے سایہ میں پہونچکر نظر سے اوجھل ہو گئے۔ عزہ نے سمیہ سے کہا فکر کی کوئی بات نہیں، اس راستہ سے دمشق کی آمد و رفت لگی ہی رہتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ بھی کوئی دمشق ہی کے مسافر ہونگے" لو اب کھانا کھاؤ ہوا میں خنکی آچلی ہے، اس لیے یہاں اب زیادہ تر ٹھہرنا مناسب نہیں، ہاں! میں آج تمھیں ایک ایسی عمدہ خوش آیند راگنی سنانے والی ہوں، جس سے تم بہت محظوظ ہوگی، اور جسے میری شفیق معلمہ نے مجھے بڑی محنت سے بتایا تھا، اور میں نے بھی خون جگر پی پی کے اُسے سیکھا تھا"

اس کے بعد پھر وہ دونوں کھانے میں مشغول ہوگئیں، ہنوز فراغت نہو ئی تھی کہ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے شمع خاموش کردی، عزہ نے فوراً دستک دی، اور نیچے سے ایک خوش قطع شخص صاف ستھرے لباس میں، اوپر آیا، جسے آتا ہوا دیکھکر سمیہ نے اپنا چہرہ نقاب سے چھپایا، عزہ کو اسپر ہنسی آگئی، اور کہنے لگی "سمیہ! کیا تم مخنث سے بھی پردہ کرتی ہو" بات یہ تھی کہ سمیہ تاریکی شب سے اس کی تمیز نہ کرسکی کہ یہ آنے والا شخص مرد ہے یا مخنث[1]،

---

[1] مدینہ میں ان مخنثوں کی ایک جماعت کثیرہ تھی، جو بے تکلف عورتوں میں آتے جاتے، اور اُن سے ملتے جلتے تھے۔ مشاطہ گری کا کام بھی زیادہ تر ان سے انجام پاتا تھا، جس کا طریقہ یہ تھا، کہ جب کوئی نوجوان شادی کرنا چاہتا، تو ان میں سے کسی ایک سے مشورہ کرتا، یہ خواتین کے اصلی اوصاف اور خوبیوں کا مرقع اپنی جادو تقریر سے اُس کے سامنے کھینچ دیتے، جس سے انتخاب میں ایک گونہ سہولت ہوتی

یہ مخنث جب آکر سامنے کھڑا ہو گیا، تو عزہ نے اُس سے پوچھا،

عزہ:۔ طویس! کیوں آئے ہو؟

طویس کا نام سنکر سمیہ نے تعجب سے سوال کیا، کیا طویس یہی ہے؟ عزہ نے جواب دیا "ہاں یہی ہے، اور اس کا ہمارے پاس اس وقت بلا اطلاع چلا آنا کوئی نئی بات نہیں، بلکہ یہ پہلے سے اس طرح بے تکلف آنے جانے کا عادی ہے"۔

طویس سے خطاب کر کے "اچھا طویس! باندی سے کہو شمع روشن کر جائے"

طویس:۔ میں ایک شرط سے بولوں گا،

عزہ:۔ کیا شرط؟"

طویس:۔ اس شرط سے کہ مجھے ایک شعر ہزج[1] میں سناؤ،

عزہ۔ مجھ سے ہزج میں شعر سننا چاہتا ہے، حالانکہ تو خود ہزج الناس ہے ہاں اگر ثقیل یا رمل میں سننا ہو، تو میں سناؤں گی،

طویس۔ اچھا تمھاری جیسی خوشی ہو، مجھے تو شعر سننے سے مطلب ہے

عزہ۔ اچھا سناؤں گی، مگر مجھے تیری صورت سے اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کیونکہ تیری نحوست اور شوم زبان زد ہے،

بقیہ نوٹ صفحہ ۵۲) انتخاب کے بعد اگر بحث مرحلہ بھی ان کے ذمہ کیا جاتا تو وہ اسی بھی بحسن اسلوب انجام دیتے۔ عزہ کے یہاں ان لوگوں کی آمد و رفت زیادہ تر اس بنا پر تھی، کہ یہ اس کے پاس اپنا تقرب جاتے۔ اور وقتاً فوقتاً موسیقی کے کچھ نئے گر اس سے حاصل کر جاتے، سب میں طویس عزہ کا زیادہ سر چڑھا تھا۔ ۱۲

[1] یہ عربی بحروں کے نام ہیں ۱۲-

طولیس:- مجھ سے بڑھکر شوم کون ہوگا، میں ماں کے پیٹ سے اُس روز پیدا ہوا جس روز نبی کریم (صلعم) نے وفات پائی، یعنی جو ذات باعث تخلیق عالم تھی اُس کے وجود کی تجلی اہل عالم کی نظر سے جس روز پوشیدہ ہوئی، میری دودھ بڑھائی اس روز ہوئی جس روز صدیق اکبرؓ نے انتقال کیا یعنی صحبت برار اور ہمنشینان رسول اللہ کے ایک فرد اعظم کے حادثہ ارتحال سے دنیائے اسلام پر غم و الم کی گھٹا چھائی تھی، پھر بلوغ کو میں اس روز پہونچا یعنی دستور دنیا کے مطابق اعتبار کا ایک جزو مجھے قدرت سے اُس روز عطا ہوا، جس دن عمر ابن خطابؓ کی شہادت کا قیامت خیز واقعہ وقوع میں آیا، آج کل جس چیز کے ساتھ میری منسوبہ کا روز وہ تھا جو شہادت عثمانؓ کا روز ہے اور میرے یہاں ولادت فرزند علی شیرؓ خدا کے شہادت کے روز ہوئی۔

عزہ اس صاف گوئی، اقرار نحوست، اور تطبیق واقعات پر متعجب ہوئی۔ اور اُس نے ہنسکر کہا "خدا کے لیے اپنی اس نحوست کو کہیں آج ہم پر ختم نہ کرنا تمھاری فرمایش بہرحال پوری کیجائے گی"

اجنبی مہمان شب

اس گفتگو کے بعد طولیس نیچے اُتر آیا، اور پھر چند لحظوں کے بعد عزہ اور سمیہ بھی نیچے آگئیں، اور مہمانوں کے کمرہ میں جا بیٹھیں، عزہ زانو پر تکیہ جما، اُس سے سہارا دے کر صدر نشست میں بیٹھ گئی، اور سمیہ اُس کے بازو میں جا بیٹھی، اور اپنے خیالستان میں تخیل کی پرواز سے پہونچ گئی، طولیس یہاں موجود تھا، اُٹھا، اور جھٹ سے دیوار و منبر جھاڑے ہوئے

آلات موسیقی، اور مزامیر میں سے ایک، دَف لاکر عزہ کے سامنے رکھدیا، اور کہنے لگا "اب کچھ چھیڑیئے"

عزہ "بندۂ خدا ذرا صبر کر، ابھی کھانا کھایا ہے، آرام بھی سے لینے دیگا؟"

یہ بات چیت ہو ہی رہی تھی کہ باغ کے قریب کچھ اونٹوں کی آواز معلوم ہوئی جسے سُنکر عزہ نے کہا "طویس ذرا دیکھ تو اس رات میں کون آنے والا ہے، خدا خیر کرے تیرے قدم کی برکت کیا بلا نازل کرتی ہے" اتنے میں سمیہ بول اُٹھی

سمیہ "ہمیں کسی بات کا ڈر نہیں، ہم یہاں بالکل امن میں ہیں" اتنا کہہ کر پھر ذرا دھیمی آواز سے بولی "نہیں ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم امن میں ہیں، جبکہ امیر وقت انواع و اقسام کے مصائب میں گرفتار ہے، اور دانہ پانی اسپر بند ہے

اچھا طویس جا کر خبر تو لا، کہ کون آیا ہے؟

طویس ایک عجیب انداز سے جوتہ پہن، اور اٹھکھیلیاں کھاتا ہوا چلا، اور دروازہ پر پہونچکر ایک پٹ کھولا اور سر نکالکر دیکھا تو دو اونٹ باہر کھڑے تھے، جن کی مہاریں دو شخصوں کے ہاتھ میں تھیں، جس میں سے ایک طویل القامت تھا اور معزز معلوم ہوتا تھا، جس کا چہرہ چہرہ بند کوفیوں کی طرح چھپا ہوا تھا، اور عبا زیب بر تھی، دوسرا اس کی بہ نسبت کوتاہ قامت تھا، اور قرینے سے پہلے شخص کا خادم معلوم ہوتا تھا، طویس نے پوچھا "آپ کون ہیں اور کہاں سے اور کیوں تشریف لائے"؟ طویل نے آواز بنا کر جواب دیا، "ہمارا علم غالباً اس معاملہ میں ہمیں غلط ہدایت نہیں کرتا کہ یہ مکان عزہ بنت جمیلہ کا ہے"

طویس "بے شک یہ عزہ کا مکان ہے، آپ کی غرض کیا ہے؟"

طویل۔ میری غرض مکان میں آنے، اور صاحب مکان سے ملاقات

کرنی کی ہے،

طویس - کیا اپنی تعریف آپ مجھے بتائیں گے؟"

طویل - نہیں، کیونکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں،

طویس - مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کی اطلاع کروں،

یہ کہہ کر طویس اندر چلا گیا، اور عزہ کو اس شخص کے آنے کی اطلاع کی، جس کے ساتھ ہی سمیہ نے کہا " مجھے تو اب اجازت دیجئے، کیونکہ مجھے آئے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا، علی الخصوص ایسی حالت میں میرا ٹھہرنا یہاں اور بھی غیر مناسب ہے، جبکہ کچھ اجنبی مہمان یہاں آگئے ہیں"۔

عزہ - جیسی تمہاری خوشی، میں ایسے موقعہ پر روکنا بھی مناسب نہیں خیال کرتی

اس کے بعد سمیہ رخصت ہوئی، عزہ نے چند قدم اس کی مشایعت کی، اور ایک مخصوص پشت کے دروازہ سے اُسے راستہ بتاکر واپس ہوئی۔

واپس ہوئی تو عزہ نے طویس سے کہا کہ جاکر یا تو اس آنے والے کا چہرہ دیکھ " یا کچھ نام و نشان پوچھ کر آ۔

طویس گیا اور چند لمحہ کے بعد واپس آیا، اور کہا " آنے والا شخص اہل بادیہ سے ہے، اور محض آپ کے گانے کا شوق اُسے یہاں کھینچ لایا ہے، نام نہیں بتاتا مگر میرے اصرار پر اُس نے صرف اتنا پتہ دیا، کہ ان دو بیتوں کا قائل میں ہی ہوں"۔

وذی حاجة قلنا له لا تبح بها[۱] فلیس الیها ما حییت سبیل
لنا صاحب[۲] لا ینبغی ان نخونه وانت لاخری صاحب وخلیل

---

۱ اور بہت سے خواہشمند ہیں، میں نے اُن سے کہا کہ: تحیہ سلام کرو اسکو، کیونکہ اس تک تحیہ کی رسائی ہی نہیں

۲ میرا ایک دوست ہے کہ جس کی امانت میں مجھ خیانت نہیں، اور ایسے ہی تو دوسرے کا یار اور دوست بن گیا ہے

لیلی الاخیلیہ

عزہ نے طویس سے جب یہ سنا، وہ اپنی جگہ پر خوشی سے اچھل پڑی، اور اگر اس کی قربی اسے اجازت دیتی تو ضرور دروازہ تک اس مہمان کے استقبال کو جا پہونچتی۔ طویس نے اس کی اس بے اختیاری پر تعجب سے پوچھا "کیوں آپ ایسی خوش کیوں ہوئیں"

عزہ۔ "طویس کیا تجھے نہیں معلوم کہ آنے والا شخص کون ہے؟

طویس۔ "میں نہیں واقف ہوں۔

عزہ۔ اگر میں اس کی زبان سے کسی غیر کا کلام بھی سنتی، تو باتوں ہی باتوں میں اسے پہچان لیتی، کیا تو نے خیال نہیں کیا کہ اس نے حرف مضارع کو مکسور ادا کیا ہوگا مثل اہل بہرا کے۔

طویس۔ "کچھ خیال تو مجھے پڑتا ہے کہ اس نے ایسا کیا، اگرچہ میں نے زیادہ توجہ اسپر نہ کی۔

عزہ۔ ہمارا مہمان شب لیلیٰ الاخیلیہ مشہور شاعرہ ہے، جس کے یہ شعر ہیں؛

طویس۔ "(خوش ہوکر) عجب حسن اتفاق ہے، اب تو میرے ذوقِ سماعت کی بن آئی اس کی زبان سے شعر بھی سنوں گا اور اس کے ساتھ توبہ ابن حمیر کے عشق کا دلکش فسانہ بھی، اس موقعہ پر اس تذکرہ کی چھیڑ کچھ بے محل اور لیلیٰ کے برخلاف مزاج تو نہ ہوگی،

عزہ۔ "ہرگز نہیں، لیلی کو تو یہاں نہایت بے تکلف پائے گا۔ باوجود اہل بادیہ ہونے کے جو بلا ضرورت آبادی میں آنا برا جانتے ہیں، وہ کبھی کبھی یہاں آجاتی ہے۔

اس کے بعد طوبیس اپنے بوڑھے غمزہ دکھاتا ہوا پھر دروازہ پر پہونچا، اور عزہ کی جانب سے تاخیر پر معذرت، اور عمدہ الفاظ میں مشتاقانہ خیر مقدم کیا، پھر تینوں باغ میں داخل ہوئے طوبیس لیلیٰ کے پیچھے تھا، اور اس کی کشیدہ قامتی اور حسن رفتار کو حیرت سے دیکھتا جاتا تھا، کیونکہ عرب خواتین میں لیلیٰ کی طوالت صفت نادرہ تھی، اور اس کا انداز خرام نرالا، مگر دلکش،

تھوڑی دور جا کر لیلیٰ نے خادم کو اشارہ کیا کہ اونٹوں کو وہ عرش و زختوں سے بنے ہوئے مسقف مقام میں لیجائے۔ یہ حکم دے کر وہ چلی گئی، اور جونہی عزہ کے سامنے پہونچی، عزہ بڑے تپاک اور گرمجوشی، سے اس کے استقبال کو یہ کہتی ہوئی بڑھی" مرحبا بلیلیٰ- اھلا بلت یا حبیبہ- لقد بالغت فی الاختفاء حتی اسأنا معاملتت۔ واخرناک" اور نہایت اعزاز و اخلاص سے اسے صدر میں تکیہ کے سامنے لیجا کر بٹھایا، لیلیٰ نے (بھاری اور مردانی آواز سے مشابہ آواز میں) جواب دیا،

کچھ مضائقہ نہیں، مری ہی غلطی تھی، میرا خیال تھا کہ لب و لہجہ اور آواز سے میں آسانی کے ساتھ پہچانی جا سکوں گی"

طوبیس دروازہ سے لگا ہوا اس اشتیاق میں کھڑا باتیں سن رہا تھا کہ کاش! لیلیٰ چہرہ کھولدیتی، تو اس کے رخ زیبا کی زیارت بھی کر لیتا، لیلیٰ کے دل میں یہ تھا، کہ" یہ کمبخت یہاں سے ٹلتا، تو میں فراغت کے ساتھ سامان سفر اور اشیاء تبدیل ہیئت سے ہلکی ہو کر عزہ سے کچھ باتیں کرتی، اتنے میں عزہ اس کے دلی خیال کو خود تاڑ کر بول اٹھی" پیاری لیلیٰ! یہ مخنث ہے پردہ کی چیز نہیں، اور اس سے زیادہ اس کی تعریف یہ ہے، کہ طوبیس مغنی بھی ہے" لیلیٰ یہ سنکر ہنسنے لگی، اور چہرہ بند وغیرہ اتار دیا، اور کہنے لگی"

دہی طوِیس جس کی نحوست اور شوم نے اُسے مشہور کر رکھا ہے؟ میں اسے دیکھکر بہت خوش ہوئی۔"

مگر لیلیٰ کا چہرہ کھلتے ہی طُویس اُس کے حُسن سے مرعوب ہوگیا، اسکی چشم غزالاں نے جادو ڈالا، دانتوں کی آب و تاب بہا عقل کو لے اُڑی، چہرہ کی رونق اور شگفتگی نے (جو بادیہ نشینوں کے چہرہ سے خاص کر جھلکتی ہے، ہوش و حواس لے لیے اور بیچارہ طویس مبہت نبکر رہ گیا، مگر لیلیٰ کی باتوں میں جو اُس نے بوئے اُنس پائی، تو خوشی سے پھول گیا، اور یہ کہتا ہوا بقصد قربت مسند کیطرف جسپر لیلیٰ بیٹھی تھی، بڑھا، مجھے آج اپنی خوش بختی اور یاوری طالع پر ناز کرنے کا بجا حق حاصل ہے کہ عرب کی قابل فخر شاعرہ بارعہ کی ملاقات مجھے نصیب ہوئی، اور اُس حسن قدرت کی تصویر مجسم نے لطف فرمائی سے ایک خادم کی ذرہ نوازی بھی فرمائی، تیرے عشق میں توبہ ابن حمیر کے گداز کا واقعہ اور اُس کا پُر تاثیر کلام جب کوئی مجھے سُناتا تھا، تو میں اُسے سنتا تھا، اور حیرت کرتا تھا، کہ تو ایک شوہر دار عورت ہے، بجبہ سے اُس کا شغف اُس کی صحت دماغ کا کرشمہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا، مگر آج اس چہرہ نے جس میں صبح درخشاں کی چمک اور دلربائی کی صفت ہے میری اس حیرت کو زائل کردیا، اور حسن میں جو کان ملاحت اور رعنائی، ہے، ضرور وہ کشش ہے جس نے توبہ ابن حمیر کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔"

لیلیٰ نے جب توبہ کا نام سُنا تو اُس کے چہرہ پر ایک قسم کی سُرخی دوڑ گئی، اور انفعال سے اُس کی نظر نیچی ہوگئی پھر اُس نے نظر اُٹھا کر طویس سے کہا، کیا تم نے توبہ کے کچھ ایسے اشعار سُنے ہیں؟

طویس: ہاں میں نے اُس کا اکثر کلام، اس رنگ کا سُنا ہے، جس میں سے آپ کو اس وقت چند شعر سُناتا بھی ہوں، وَھُوَ ھٰذا

ولو ان لیلی الاخیلیة سلمت علیّ ودونی جندل وصفائح
لسلمت تسلیم البشاشة او زقی الیها صدیً من جانب القبر صائح
واغبط من لیلیٰ بما لا انا لہ الا کل ما قرت بہ العین صالح

اشعار سنتے سنتے لیلیٰ کا چہرہ زرد ہوگیا۔ عزہ نے اسے محسوس کیا، اور اس ذکر کو ٹالنے کیلئے کہنے لگی "مناسب ہوگا کہ اب اُٹھکر آپ غسل فرمائیں اس کے بعد خاصہ طیار رہے تناول کریں" لیلیٰ نے جواب دیا "ان امور کا آپ اہتمام نکریں، میں اسوقت محض آپ سے ملاقات کرنے آئی ہوں" اور کچھ خاص باتیں اور گانے وغیرہ کی صحبت کے بعد واپس جاؤں گی"

عزہ:- کیا آپ اسوقت شام سے آتی ہیں؟

لیلیٰ:- ہاں! ابھی تھوڑی دیر پہلے مدینہ میں ہم داخل ہوئے، میرے ساتھ ایک رفیق سفر اور بھی ہے، جسے ایک دوسری جگہ ٹھرا کر میں یہاں آئی ہوں اور اسی وجہ سے جلد واپس جاؤنگی،

اسوقت عزہ کے دلمیں خیال آیا، کہ کہیں وہ لوگ جو تمیمہ کو اسوقت کنارۂ آب نظر آئے تھے یہی تو نہ تھے اور اس نے لیلیٰ سے پوچھا "میں سمجھتی ہوں کہ بعد الغروب ہم نے درختوں کے پاس شام کے راستہ سے آتے ہوئے آپ ہی لوگوں کو دیکھا تھا"،

لیلیٰ نے کہا "ہم تین آدمی تھے۔ اور بیشک بعد الغروب ہم صواحی مدینہ میں اپنے اونٹوں پر سوار پہونچ گئے تھے"

"خالِغالی"

لہ لیلیٰ اخیلیہ اگر مجھے تحفہ سلام بھیجے اگرچہ میرے اس کے درمیان ٹیلہ اور چٹانیں پہاڑ حائل ہیں،
لہ تو میں بھی اگر زندہ رہا تو اس کو دلی جوش کے ساتھ سلام بھیجوں گا، (اگر مرگیا تو) قبر سے میری صدا ایک چیخ کی صورت میں اس کے کانوں تک جائے گی۔
لہ غبطہ کرتا ہوں میں لیلیٰ کی آن بان پر جن کا تعلق مجھے نصیب نہیں، اور جن اداؤں کا نقشہ آنکھوں میں کھنچا ہے، اُن کی دلفریبی کا کیا پوچھنا،

سرمستی آلام

میرا پہلو آہ وقفِ بسترِ غم ہو چلا قلب میرا آشنائے دردِ پیہم ہو چلا
زیرِ سر بالش مرا اشکوں سے پُر نم ہو چلا آنکھ اور محنتِ جگر سے ربطِ باہم ہو چلا

چھن گیا آرام میرا لُٹ گئی راحت مری
پھر ہوا مجھکو جنوں پھر آگئی شامت مری

ہوگئے شبہائے عشرت کے فسانے اک خیال محو دل سے ہو چلا ہے لطفِ ہجرانِ وصال
اب تو یہ فرطِ تپش سے ہوگیا ہے اپنا حال بیٹھ جاؤں چین سے میں اک جگہ بالکل محال

کھائے جاتا ہے مجھے فرقت کا نالہ دل کا درد
حدتِ غم سے ہوئی جاتی ہیں نبضیں میری سرد

ہجر میں جس کے تڑپتا ہوں وہ مجھ سے دور ہے میں یہاں بے چین وہ عشرت میں اپنی چور ہے
کرب ہے یاں قلب اُس کا عیش سے معمور ہے کیا خبر اسکو کہ کیا حالِ دلِ مہجور ہے

ہوکے افتادہ، ہیں ہم آغوش گردِ راہ کے
کیا اُٹھیں گے اب سہارے سے عصائے آہ کے

جب میں تھا نکہت رُبائے زلفِ مشکینِ حبیب اوج پر طالع تھا جب میرا ترقی پر نصیب
چارۂ دردِ جگر کو پاس تھا اپنے طبیب میں قریبِ یار رہتا اور یار رہتا مجھ سے قریب

میں تو اُس دم بھی حریصِ دردِ حسن و عشق تھا
تھا مسیحا پاس رہتا تھا مگر بیمار سا

جب نگاہ بے محابا سے میں لذت یاب تھا جب شعاعِ حسنِ سیمیں سے زبس سیراب تھا
دستِ نازک جب مرے سینہ پہ وجہِ خواب تھا ہائے یہ کمبخت دل اُسوقت بھی بیتاب تھا

حسن تھا میرے قریں لیکن مٹا جاتا تھا میں
آتشِ ہجراں نہ تھی لیکن پھکا جاتا تھا میں

اب کہ میں ہجراں کشِ تسکینِ وصلِ یار ہوں
اب کہ تیغِ تیزِ فرقت سے میں دل افگار ہوں
آتشِ دوریِ جاناں سے میں شعلہ بار ہوں
ہے تپش اب بھی وہی ویسا ہی اب بھی زار ہوں

فرق اتنا ہے کہ جب تھا دردِ وصلِ حسنِ یار
تنگیِ فرقت میں اب ہے روحِ لرزاں کو فشار

کرب و بےچینی یہ مانا ہم نے، ہیں پیغامِ ہجر
یہ مسلّم ہے، مٹا دیں گے ہمیں آلامِ ہجر
درد و غم کو ہم سمجھتے ہیں، کہ ہیں آرامِ ہجر
یہ مگر ہوگا نہ ہم سے تجھکو سمجھیں شامِ ہجر

رازِ دل میرا نہاں ہے تیرے خلوت خانے میں
جوش کھاتی ہے میری صہبا ترے پیمانے میں

ہمدمو آخر نتیجہ کیا مرے سمجھانے کا
کیوں گلا تمکو کسی سے ہو مرے تڑپانے کا
پہلے یہ سمجھو مجھے کیوں شوق ہے مٹ جانیکا
کیا مگر تم جان لوگے مرتبہ دیوانے کا؟

میری کروٹ اضطرارِ شوق کی تصویر ہے
میری بیتابی کتابِ حسن کی تحریر ہے

دم ذرا لے لوں محبت میں، مجھے فرصت کہاں
سانس لینے کی جبابِ بحر کو جرأت کہاں
درد ہو لذت کشِ تسکین کب، راحت کہاں
واقفِ صبر و سکوں ہوں، یہ میری قسمت کہاں

میں ربابِ زندگی کا نغمۂ پُر درد ہوں
کاروانِ حسن کے رفتار کی میں گرد ہوں

میرے غم کو دیکھکر عشرت نہ ہووے بدگماں
گل فشاں ہے فی الحقیقت میری چشمِ خونچکاں
ہے تپش میری پر پروازِ حسنِ دلستاں
بیقراری میں مری ہے جلوۂ ہستی نہاں
ہے شکستِ رنگ میری گو وہ سازِ عشق کا
میری رسوائی ہے اک افسانہ رازِ عشق کا

ہیں نمودِ نظمِ ہستی عشق کی ناکامیاں || خوابِ راحت ہوگئی ہیں ہجر کی بیداریاں || ہیں قرارِ قلبِ مضطر دل عشق کی بیتابیاں || حسن کی دشواریاں مجھکو ہوئیں آسانیاں || دردِ دل میرا گدازِ شمعِ ہستی ہوگیا
شعلۂ الفت کو کیفِ رقصِ مستی ہوگیا

[illegible]

تمدن کی پہلی سالگرہ اور بزم احباب

شکریہ قبول کر، فانی دنیا! ان زندہ آنکھوں کا، جو تیری ناپائدار بے طاہر رنگ برنگ کے جلوے دیکھ رہی ہیں، حوصلہ بڑھا رہی ہے تیری دورنگی ان تماشائیوں کا بھی جو اپنی کوششوں میں ناکام اور آرزوؤں میں مایوس ہو چکے اُس بےبسی اور بےکسی کے میدان میں جہاں ہر طرف تفکرات کے کانٹے بچھے ہوتے ہیں تو اس دیوی کا جلوہ دکھا کر دل موہ لیتی ہے جس کے سر پر امید کا تاج شاہی ارمانوں کے موتیوں سے جگمگا رہا ہے یہی گنگا جمنی سماں دیکھتے دیکھتے عمریں ختم ہو گئیں، زمانہ کہیں کا کہیں پہنچا، جو کل بچے تھے وہ آج سیانے اور جو نئے تھے وہ اسوقت پرانے ہو گئے،

کل کی بات ہے کہ تمدن دنیائے ادب میں نمودار ہوا۔ اور آج کا پرچہ اس کا پہلا سال ختم کر رہا ہے جن ہاتھوں نے چند روز پہلے اس کا پروسپکٹس تیار کیا وہ اسوقت اس کے ابتدائی سال پر ریویو کر رہے ہیں جس دماغ میں اجرائے تمدن کی خواہشیں مارچ سنہ ۱۹۱۱ء میں زور شور سے پیدا ہوئی تھیں وہی دماغ مارچ سنہ ۱۹۱۲ء میں اپنی خواہشوں کے انجام پر نظر ڈال رہا ہے جو دل آج سے ایک سال پہلے بہت سی حسرتوں سے لبریز اور ارمانوں سے بھرا ہوا تھا اب یہ دیکھتا ہے کہ کتنے ارمان پورے ہوئے اور کتنی حسرتیں خاک میں مل گئیں۔ تمدن جو ایک چھوڑ دو دو دعوے ساتھ لیکر نکلا تھا اور جس کی بہت سی امیدیں دوسروں سے وابستہ تھیں اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ہوا۔ اور اس کی امیدیں کہاں تک پوری ہوئیں

جس طرح چشم بینا عمر کی منزلیں طے کرتی ہوئی کبھی بار آور درخت اور کھلے ہوئے پھولوں سے آشنا اور کبھی ان مرجھائی ہوئی کلیوں سے دوچار ہو کر جو باد سموم کے جھونکوں سے فنا ہو چکیں اس نتیجہ پر پہونچتی ہے کہ اے اعنصر خاکی، خیالات پریشان کو دماغ سے نکال پیوند زمین کر، سر اٹھا، آنکھ کھول، اور اسامنے دیکھ! ملک کا میابی کی شاہانہ سواری چلی آرہی ہے۔ اسی طرح یہ تین برس بیٹھہ روز تمدن کے بسر ہوئے اہل وطن کی خموشی ہمیشہ حوصلے پست اور ہمتیں توڑتی رہی مگر ان احباب کی قدر دانی نے جو خلوص کا سر لگائے محبت کی آنکھوں سے تمدن کو دیکھ رہے تھے امیدوں کو ہمیشہ کامیابی کے لباس میں پیش نظر رکھا اور یہی صورتیں آج مایوس دماغ اور افسردہ دل سے یہ چند سطریں لکھوا رہی ہیں وضع کے پابند آن پر جان دینے والے وہ اگلے لوگ جن کے نام آج فانی دنیا آنکھوں سے لگا رہی ہے مدتیں ہوئیں کہ مرکھپ گئے گو آسمان و زمین دونو یقین کر چلے کہ اب تاریخ ان پاک ناموں سے محروم ہو چکی مگر تمدن نے بتا دیا کہ ابھی ایسی صورتیں دنیا میں موجود ہیں جو کونے کھدروں میں پڑے لوگوں کو بھی وقعت سے دیکھ رہی ہیں۔

رفتار زمانہ متقاضی تھی اور ضرورت کے فرشتے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ تعلقات کا دائرہ وسعت کا محتاج ہے۔ دوسروں کے نقش قدم پیش نظر ہیں مگر وہ دل وحشی جو عمر بھر قید تنہائی کا عادی رہا جسکو دربار کے دنوں میں بھی گھر سے نکلنا قسم تھا جس کی آنکھیں ویرانہ میں آبادی کا لطف دیکھ رہی ہیں اپنا رنگ تبدیل نہ کر سکا۔

کج خلقی جس کی جبلیں بے مروتی جس کی انیس تنہائی جس کی محرم، وحشت جس کی ہمدم۔ اسکو حق کیا ہے کہ کسی کی بے اعتنائی کا شکوہ کرے

مگر ہاں تمدن کا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس نے اردو علم ادب کو اُن جواہرات سے مالا مال کیا جو ضرورت زمانہ، ناقدری یا عدیم الفرصتی کی وجہ سے علیحدہ پڑے ہوئے تھے مگر اُن کی آب و تاب کا سکہ ملک اور قوم دونوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا، اور جن کی چمک دمک تمدن کے سوا دوسری جگہ نظر آنی مشکل تھی کفران نعمت ہے اگر اس موقعہ پر تمدن شمس العلما ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب ایل ایل۔ ڈی۔ سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے۔ میرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے۔ مولوی سید اشرف حسین صاحب بی۔ اے۔ ڈاکٹر محمد شرف الحق صاحب۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مشتاق احمد صاحب زاہدی۔ بی اے۔ جیسے حضرات کا جو لٹریچر کے واسطے مایۂ ناز ہیں ذکر نہ کرے

جو عقدہ کامل ایک سال تک الجھا رہا آج سلجھتا ہے۔ تمدن کے دسترخوان سے بعض مہمان ناقدری کا الزام لگا کر کھڑے ہو گئے اس کا فیصلہ ناظرین تمدن کریں گے کہ جن پردیسیوں کا تمدن کے سوا کوئی ٹھکانا نہ تھا اُن کے قدم سر آنکھوں پر لینے میں تمدن کس جرم کا مرتکب ہوا۔

آنکھ کے سامنے ہیں وہ مقدس صورتیں جنھوں نے محض اس وجہ سے تمدن کی مخالفت کی کہ حقوق نسواں کی بحث تضیع اوقات ہے مگر،

عزیزو! دوستو! انصاف کی آنکھوں پر خودغرضی کی پٹی نہ باندھو! زندگی بے ثبات اور حیات ناپائدار ہے، عمر عزیز کی کل کائنات ایک رات کی صحبت ہے۔ اس جلسہ کے شریک دور دور سے تمھارا نام سنکر آئے ہیں وہ کام نہ کرو کہ صبح صادق کے وقت جب یہ پیاری صورتیں دھندلی سی تصویر رہ جائینگی، ماہتاب جس سے بارہ گھنٹے تمھارا ساتھ دیا پھیکا پڑ چکا ہوگا خوشرنگ پھول جو رات بھر چہکے، رقیب بچھے ہونگے شمع کافوری دم توڑ رہی ہوگی، دنیا تمھارے

اعمال پر ٹھٹے لگائے۔

دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھنا، بیٹیاں آگے بہنوں کے بھائی اور ماؤں کے بیٹے ہو، کیا قدرت نے انہیں اسی لیے بنایا تھا کہ یہ تمھاری خدمت کریں اور پیٹ میں ٹکڑا ڈال لیں۔

خیال بھی تھا توقع بھی تھی اور یقین بھی تھا کہ فرقۂ نسواں اور حامیان حقوق نسواں تمدن کی اس کوشش میں ہاتھ بٹائیں گے مگر اللہ اللہ خواتین میں سے بنت نذر الباقر صاحبہ۔ نواب نظیری بیگم صاحبہ۔ بیگم عطاء اللہ صاحب۔ اے بیگم صاحبہ۔ خجستہ صاحبزادہ عبد الحمید خاں صاحب بیگم منشی عزیز الدین صاحب۔ ز۔ رخ ش صاحبہ ان چار پانچ کے سوا کسی نے اسطرف خیال بھی نہ کیا البتہ لاہور کے ایک کرمفرما کی عنایت خصوصیت سے قابل ذکر ہے جنھوں نے اس شرط پر سو پرچے خریدنے کی درخواست کی کہ تمدن حقوق نسواں پر بحث نہ کرے۔

ظاہری ٹیپ ٹاپ جسمیں کثرت تصاویر بھی شامل ہے روپیہ کا کھیل تھا مگر ضمانت ہی تمدن کے واسطے ایسا کاری زخم تھا جس نے آجتک نہ پنپنے دیا اسپر خبط الرجال، یا حامیان حقوق نسواں کا کال رہی سہی امیدیں بھی خاک میں مل گئیں لیکن اس یاس و ناامیدی میں جہاں خدا کے سوا کوئی مددگار نہ تھا یا مخالف کشتی تمدن کو ڈبوئے پھرتی تھی۔ چند ایسی صورتیں بھی کنارے پر نظر آئیں جو سلامتی کے واسطے دست بدعا تھیں ان کی حسن صورت حسن سیرت محبت دل وحشی کو مسخر کر گئی افسوس اس کا ہے کہ انمیں سے بعض صورتیں دیکھنے سے پہلے آنکھیں ہمیشہ کو بند ہو جائینگی۔ مگر اسوقت کہ رات کے دو بج چکے ہیں تمدن یہ پیغام اُن پیاروں تک پہونچا دیگا جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی ہیں اور ترسیں گی۔

یا دش بخیر لطیف الدین احمد نہیں فقط لطیف اور میاں حامد حسن نہیں صرف حامد (عزیزوں معاف کرنا) دہارادی اور پور قاضی کی عزت جو کچھ بھی ہو خدا زیادہ کرے زندہ رہو اور خوش رہو۔ مولوی نور احمد صاحب سید تصدیق احمد صاحب منشی عبد الرزاق صاحب بسمل شکریہ کے محتاج نہ ہوں مگر انکی عنایتیں فراموش نہیں ہو سکتیں،

سرزمین دکن جو قدر دانی وجوہر شناسی میں سدا مشہور رہی یلبرگہ سے خان عالی و سید سخاوت خاص حیدر آباد سے میر مہدی علی صاحب شہید نے جو کچھ کیا دل اب تک اس کے مزے لے رہا ہے۔

بھوپال کا خیال آتے ہی سید ناصر و منشی جمیل احمد کی تصویر آنکھ کے سامنے پھر گئی اور میاں ارشد کی یاد کہیں سے کہیں لے گئی، اچھا بھائی! یار زندہ صحبت باقی! کبھی تو ملو ہی گے،

کیسی اچھی محفل جمی ہوئی ہے! عالم خیال اسوقت وہ صورتیں دیکھ رہا ہے جنکی بدولت تمدن نے دلی کی لاج رکھ لی، آؤ، آؤ میرے محسنو، آؤ، تمھارے قدم سر آنکھوں پر، اجڑے ہوئے شاہجہاں آباد کی مقدس خاک کا ہر ذرہ تمھارے استقبال کو تیار ہے، تمھاری محبت بھرے دل اور بزرگوں کی وضعداری کا پتہ دینے والی آنکھیں اسی بستی میں رنگ برنگ کے تماشے دیکھیں گی رات آدھی سے زیادہ گذر چکی، چاند مدھم پڑا اور تارے چھٹکنے شروع ہوگئے یہ تمام بہار صبح صادق تک ہے پھر تم کہاں اور یہ تمدن کی محفل کہاں اذان کے ساتھ یہ سماں درہم برہم ہے مدتوں کے بچھڑے ایک جا جمع ہوئے ہیں غنیمت ہے یہ صحبت جس کا لطف مدتوں آنکھوں میں سمایا رہے گا۔ آنکھیں ترسیں گی اور روئیں گی۔ دل تڑپے گا اور ڈھونڈھیگا

مگر بعض صورتیں دوبارہ نظر نہ آئیں گی پردیسی مسافر! دیکھنا دیکھنا! کیسے کیسے لوگ تم سے ملنے آئے ہیں انکی ظاہری صورتوں پر نہ جاؤ، ان کی حیثیت اور حالت پر نظر نہ ڈالو ان کے پہلو میں دل ہیں ان کے دلوں میں درد ہے یہ وہ ہیں جنھوں نے دنوں کے رستے اور مہینوں کی منزلیں گھڑیوں میں طے کیں محبت کے پروں سے اُڑے اور قدردانی کی فضا میں جھومتے جھامتے شاہجہاں آباد پہونچے۔ عزیزم سید ابو القاسم خاں شوکت کی طرح سو جانے کی سہی نہیں ہے راتیں بہت سی آئیں گی مگر یہ سماں نظر نہ آئیگا جوش کی طرح بزم تمدن کی شرم رکھ لو۔ منشی لیاقت علی خانصاحب اودھ سے آئے ہیں ایسا نہ ہو دلی پر نام رکھیں۔ مولوی سیف الدین شباب کو ساتھ لو اور محفل کا چکر لگا لو۔

ٹھیر جا! ٹھیر جا! اے شب وصل، خدارا دراز ہو اور پیاروں کی صورت دل بھر کر دیکھ لینے دے، بھائی رضا حیدر! دلی اب وہ دلی نہیں رہی اکبر آباد پہونچکر شکایت نہ کرنا، پھر بھی اس وقت کو غنیمت سمجھو آنے والے لوگ ان باتوں کو بھی ترسیں گے، پیارے لطیف! تئیس برس کے بعد صورت دکھائی ہے آرسی کی باتیں کہانیاں کردیں سُلطان پور کی منصفی نے وہ بیفکری خاک میں ملادی، کبھی ملاقات ہو تو اوسط کو سلام پہونچا دینا۔

آہ! آہ! اے ساعت فراق کس دل سے سر پر آپہونچی، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سماں درہم برہم کردیا، اُٹھو! اُٹھو! بدیسی مسافر و تمدن سے رخصت ہو پھلور سے تشریف لانے والے بزرگو آغا غلام حسین صاحب آزاد اور منشی مظفر خاں صاحب مدارات میں کوئی کمی ہوئی ہو تو مولوی محمد عبد العزیز صاحب کورٹ انسپکٹر کی طرح معاف کردینا،

صبح صادق کا پیغام لانے والی جبرئیل للہ رحم کرو سید ظفر احسن صاحب سبزواری شیخ علی اختر حزیں، ڈاکٹر سلیمان خاں، عزیزم محمد محسن سید حشمت علی۔ صاحبزادہ وحید احمد صاحب فاروقی۔ مولوی محمود حسن سید حسن عسکری منشی عبدالعزیز شیخ غوث محمد جیسے دوستوں سے دُعائیں کرلیجئے دو،

معزز ناظرین تمدن! سمع خراشی معاف مؤذن اذان دے رہا ہے، نسیم پیغام صبح لے آئی۔ جلسہ ختم اور آنے والے مہمان ایک ایک کرکے رخصت ہوئے رات گئی اور رات کے ساتھ وہ بات البتہ اس صحبت کی یادگار پہلو میں وہ دل مجروح ہے جو محبت کی آنکھوں سے ایک ایک کی صورت کو تکتا رہا، اور شب فراق کے مزے لے رہا ہے۔ مرجھائے ہوئے پھول جلی ہوئی شمع وہ سماں یاد دلا رہی ہے جو آنکھ سے اوجھل ہوگیا،

پیارو چشم ظاہر سے دور ہوجاؤ مگر دل تمھاری یاد سے خالی نہیں سچے دوستو کامل ایک سال کے بعد (بشرط حیات) ملاقات ہوگی خدا تمھارا نگہبان ہے میرا شکریہ قبول کرو زندہ رہا تو شریک بزم ہوکر میری عزت بڑھانا مرگیا تو فاتحہ کے پھولوں سے یاد کرنا،

تمدن اب دوسرے سال میں قدم رکھتا ہے قدردانی کے ہاتھ اس کے سر پر رکھو شفقت بزرگانہ سے اسکی غلطیاں معاف کرنا اور اسکو اپنا خدمتگذار یقین کرنا قصد ہے کہ اپریل کا پرچہ غیر معمولی حجم متعدد تصاویر و منتخب اہل قلم کے مضامین کے ساتھ تمھارے متبرک ہاتھوں میں پہنچے دعا ہے کہ ناظرین تمدن کو دوسرا سال مبارک ہو اور آرزو ہے کہ خاک شاہجہاں آباد کا یہ خشک پودہ اپنے سرپرستوں کے فیض سے سرسبز و شاداب ہوکر لہلہاتا رہے۔

ناشکری ہوگی اگر تمدن اس موقعہ پر ان مہربانوں کا شکر بھری محفل میں نہ ادا کرے جنھوں نے حقوق نسواں جیسی سنگلاخ زمین کو خون جگر سے سینچکر گلزار تمدن کو لالہ زار کیا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے مشہور ادیب منشی نوبت رائے صاحب نظر کا اسم گرامی ہے۔ منشی صاحب کی قابلیت ہماری تعریف کی محتاج نہیں، انکی توجہ کا ایک کرشمہ انڈین پریس کا رسالہ "ادیب" ہے، باوجود افکار و حوادث کے جنمیں اکلوتے بچے کی موت بھی شامل ہے حضرت نظر نے تمدن کو فراموش نہ کیا۔ مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی مولوی رضا علی صاحب وحشت، مولوی نیاز محمد خانصاحب نیاز فتحپوری۔ میرزا مہدی خانصاحب کوکب حضرت محوی۔ مولوی میرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی، مولوی محمد مسلم صاحب عظیم آبادی خصوصیت کے ساتھ شکریہ کے مستحق ہیں، اہل قلم کی وہ جماعت جس کے مضامین سے قوم اور ملک کا کوئی پرچہ محروم نہیں اور جس کے مضامین تمدن نے شکریہ سے واپس کیے ضرور تمدن سے ناخوش ہوگی مگر تمدن ان سے معافی کا خواستگار ہے

اپریل کے پرچے کے متعلق جو قصد او پر ظاہر ہوا اسکی تکمیل محض قدردانان تمدن کی توجہ پر منحصر ہے گو اس قسم کی خواہش ایک قسم کی سبکی ہے مگر موجودہ مالی حالت پر نظر ڈالتے ہوئے ہم صرف ان چند احباب کو جن کی ذات سے ہمیں توقع ہے کہ وہ ہماری درخواست کو ضائع نہ کریں گے اور جن کی بابت یہ یقین ہے کہ انکی ادبی توجہ اس مقصد کو پورا کرے گی ہم "وی-پی" کارڈ روانہ کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہمارے کرمفرما "وی-پی" خریدار عطا فرماکر اس سال تمدن کی ضخامت اور تصویریں میں اضافہ کریں گے۔

ایڈیٹر

غزلیں

یاں سے بھی محروم و مشتاق لقا جاتا ہوں میں
جو خوشی تیری رضا بالقضا جاتا ہوں میں

تا نہ میری پیری سی خاک ہو جائے کوئی
کوئی جاناں سی مٹا کر نقش پا جاتا ہوں میں

یار کیا آتا ہی گھر میرے کہ آتی ہے بہار
صورت گل فرط شادی سے کھلا جاتا ہوں میں

روز یہ عمر گراں مایہ ہوئی جاتی ہے کم
دن دہاڑے عین بستی میں لٹا جاتا ہوں میں

شعبۂ راہ محبت میں ہزار اندر ہزار
ساتھ ہوں سب کے مگر سب سے جدا جاتا ہوں میں

مضمحل ہے جسم خاکی کے تعلق سے یہ روح
پیرہن بھاری جو پہنا ہے دبا جاتا ہوں میں

بحر مواج قضا میں کیا ٹھکانا کاہ کا
پھینک دیتی ہیں جدھر موجیں بہا جاتا ہوں میں

ساز و سامان کی ضرورت کیا عدم کو کوچ میں
مطمئن ہے دل کہ پیش آشنا جاتا ہوں میں

ہست و بود اپنی ہے لے آباد مثل نقش پا
خود نفس کی آمد و شد سے مٹا جاتا ہوں میں

از جناب … عظیم آبادی

نگہ صاف کام اپنا کر جائے گی
یہ برچھی مگر تا جگر جائے گی

وہ زلف رسا گر بکھر جائے گی
تو پھر یہ بلا کس کے گھر جائے گی

وہ آئیں گے جبتک مجھے دیکھنے
یہاں موت کام اپنا کر جائے گی

نہ آئے تو کل کیطرح یہ بھی شب
تڑپتے تڑپتے گذر جائے گی

نہ پوچھیگا بلبل ترا حال گل
تڑپتے تڑپتے ہی مر جائے گی

تری غیر و دشمن میں طالب ہوں موت
ادھر آئے گی یا ادھر جائے گی

یہ دھڑکا عبث ہے تمہیں اے شہید
گذرنی جو ہوگی گذر جائے گی

حضرت شہید

نخلِ امید ہے گریہ کا شجر پانی میں
یاس ہے نالۂ بیدل کا ثمر پانی میں
پرتوِ عارضِ جاناں سے ہیں روشن دونوں
نظر آتے ہیں جو شمس و قمر پانی میں
حیف گریہ سے ہوا سوختہ نخلِ امید
کیا تماشا ہے ہوا خشک شجر پانی میں
عکسِ خالِ رخِ جاناں ہے سیاہی مہتاب
زلفِ پیچاں کا نمونہ ہے بھنور پانی میں
دلِ بیتاب کی گریہ سے نہ حالت پوچھو
آہ بہ جاتا ہے یہ لختِ جگر پانی میں
کس کی تقدیر کے چکر کا نمونہ ہے ذکی
کیوں پڑا کرتا ہے دن رات بھنور پانی میں

تجمل حسین ذکی

کلام ربّانی کے اکثر ترجمے ملک میں شائع ہوئے مگر جو قبولیت مولٰنا شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی مولانائے مرحوم کی علمی قابلیت نے دنیائے اسلام پر ایسا احسان کیا ہے کہ اسکا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا اور نفس الامر یہ ہے کہ مولانا ہی کی ذات بابرکات اس اہم کام کی اہل بھی تھی۔

یہ کلام اللہ جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ جو مطلب ترجمہ سے حل نہیں ہوتا اس کی تصریح حاشیہ پر نہایت عمدگی سے خود قابل مترجم نے کر دی ہے۔

حروف اس قدر جلی ہیں کہ بچے اور بڈھے باسانی مطالعہ کر سکتے ہیں اور ترجمہ بھی اس قدر کشادہ کہ پڑھنے میں مطلق دقت نہیں ہوتی باوجود ان تمام خوبیوں کے مجلد کپڑے کی جلد رسمی کاغذ کی قیمت عہ حنائی عہ

میرزا صاحب ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ اس کلام ربانی کی قیمت میں سے ایک چوتھائی رقم وہ طرابلس فنڈ میں دیں گے اور چونکہ اس کلام ربانی کی خریداری ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ناظرین تمدن ضرور اسطرف توجہ کریں گے۔

درخواستیں بنام ابوظفر منشی حامد میرزا صاحب کوچہ روح اللہ خاں دہلی آنی چاہییں

بہ تقریب تاج پوشی قیصر ہند۔ ہر دو حصہ بجائے (عہ) کے ایک روپیہ کو ملیں گے

وصل حبیب

ناول نہیں دلچسپ اداؤں کی ہے تصویر | رنگ اس میں کسی شوخ طبیعت کا بھرا ہے

حسن تو ہی جہاں میں ہیرا فسانہ کیسا
کہتی ہے مجھکو خلق خدا غائبانہ کیا

(۱) مولوی سید محمد صاحب ارشد تھانوی سابق بھوپال۔ امید سے کہیں زیادہ اچھا لکھا گیا ہے۔

(۲) پیر جی شبیر علی صاحب۔ از جھنجھانہ۔ الحمد للہ کہ وصل حبیب کا حصہ اول حسب مراد زیور طبع سے آراستہ ہو کر نور افزائے چشم مشتاقین ہوا۔ داد کی ضرورت نہیں۔ کہ آپ میں قابلیت خداداد ہے حصہ دوم ابھی تک کیوں مستور ہے اوس کا اشتیاق موفور ہے۔

(۳) مسٹر فدا حسین صاحب سوداگر از ملتان۔ آپکا ناول وصل حبیب نہایت پسند آیا۔

(۴) قاضی عبدالشکور صاحب از دبائی ضلع بلند شہر۔ وصل حبیب کو دیکھکر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔ درحقیقت آپنے اسکو نہایت خوبی کے ساتھ تکمیل کو پہونچایا ہے۔

(۵) مولوی فصیح الدین صاحب از مسل مراد آباد۔ وصل حبیب دیکھا۔ ماشاء اللہ آپنے اپنا عزیز وقت صرف کر کے دماغ سے خوب کام لیا ہے جس کی میں داد دیتا ہوں۔

(۶) بابو سری کشن داس صاحب سندر داس از دہلی۔ آپکا وصل حبیب حصہ دوم بھی پہونچا۔ بیشک ناول بہت عمدہ ہے۔

(۷) بابو منس گوپال صاحب کمندان از حیدر آباد دکن۔ آپکے مرسلہ ناول وصل حبیب کے ہر حصہ کو واقعی نہایت عمدہ طرز پر لکھا گیا ہے۔

(۸) مولوی محمد شعیب صاحب مہر محرر کو تو بیالہ از آرہ۔ کتاب (وصل حبیب) کو ترکیہ امید سے زیادہ لطف اوٹھایا۔ عبارت کی سادگی قصہ کی صداقت کا پتہ دیتی ہے چھوٹے چھوٹے نگارشات پر معنے جملے مصنف کی لیاقت کی شہادت دے رہے ہیں۔ عبارت کا زور اشعار کی ترتیب۔ جملوں کی ترکیب الفاظ کی بندش قابل تعریف ہے۔ جس سے کہ مصنف کو مشرقی علوم پر کمال عبور ہے۔ مذکورہ بالا صفات سے اس ناول میں ایک نئی روح پہونک دی ہے کہ ہر ناول کو ایک بار دیکھکر انسان آسودہ ہو جاتا ہے لیکن اس کے پڑھنے والے کو ایک بار میں کیا دس بار میں بھی سیری نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ہوس تمنائی بن جاتا ہے۔ منتہے

(۹) رسالہ اتحاد اسلام مراد آباد کے نشتر عنایت فرماتے ہیں کہ ہم مجرب اخلاق ناولوں کے کبھی مخالف نہیں۔ وصل حبیب کو ہم نے نکتہ چیں نگاہوں سے غور دیکھا۔ ہمارا خیال ہے کہ موجودہ ناولوں کی جمع پوچھی ہوگی۔ ہمیں قدر خوشی ہوئی کہ مصنف کے کل ہمارے خیال کا جواب ہی تصنیف میں دیدیا ہے۔ زبان کی سلاست نے اردو میں ایک قابل قدر جا دیا ہے۔ یعنی ناول بہ حیثیت مجموعی قابل قدر ہے۔ ایسے ہی کتابوں کی اشاعت کے ہم مویّد ہیں

(۱۰) صاحبزادی صاحبہ بشیر صاحبہ سالی ریاست کشمیر۔ سری نگر۔ قصہ وصل حبیب سے ہم کو آپ کی لیاقت کا پتہ ملا۔ آپ کی قدر کی سچی کیجیے

مہتمم کتب خانہ حمیدیہ ڈاک خانہ گوہر گنج۔ ریاست بھوپال

جلد ۳ اپریل سنہ ۱۹۱۲ء نمبر ۱۱

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی اور علمی مضامین کا مخزن

ایڈیٹر — شیخ محمد اکرام۔ محمد عبد الراشد الخیری

۔: فہرست مضامین :۔

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری

تمدن پریس دہلی میں چھپکر شایع ہوا ۱۳۳۰ھ

قیمت سالانہ قسم اول ۴ روپے قسم دوم ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۴ آنے
کتبہ احقر ابو الظفر حامد میرزا دہلوی

کتب خانہ سیفیہ ۓ ۓ

عِصمت

(دہلی)

جہاں یہ مسئلہ طے ہو چکا کہ تعلیم نسواں ترقی کا پہلا راز ہے وہاں اکثر بزرگان قوم نے یہ بھی مان لیا ہے کہ خواتین کے مطالعہ کے واسطے عصمت ایک نعمت ہے جس میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے۔ کواری لڑکیوں کے واسطے عصمت سے بہتر سہیلی عصمت سے بہتر شفیق رفیق عصمت سے بہتر ناصح صلاح کار ملنا ناممکن ہے عصمت اُن کو بتائیگا۔ کہ کوارپنے کی زندگی اُن کو کس طرح گزارنی۔ ماں۔ باپ کا ادب بہن بھائیوں کی خدمت بزرگوں کی تعظیم چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے جس نئی دنیا میں اُن کو شامل ہونا ہے اُس کے لیے انہیں کیا تیاری کرنی ہے جو جو دقتیں اُن کو پیش آئیں گی اُن کو کس طرح رفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں غرض ان کی آئندہ زندگی کو تمام خطرات سے بچا کر پُر لطف باطمینان بسر کرانے کے واسطے عصمت سے بہتر ذریعہ اور کوئی نہیں +

بیاہی ہوئی لڑکیوں کو خانہ داری۔ گھر کے حساب کتاب بال بچوں کی پرورش میں سب سے زیادہ جس چیز سے مدد مل سکتی ہے وہ عصمت ہے عصمت اُن کو بتائیگا کہ جس آمدنی کو وہ بے تامل دل کش خرچ کر رہی ہیں وہ کس محنت و مشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے اُن کے سپرد کیے ہیں اُن کی ذمہ داریاں اُن پر کیا کیا ہیں کیا طریقے ہیں جن سے یہ بچے پل بڑھ کر جب گھر بار والے ہوں گے تو عزت سے زندگی بسر کریں گے اور عمر بھر اپنی ماؤں کو دعائیں دیں گے۔ عصمت بتائیگا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کس طرح صرف کرنا ہے۔ خاندان کے ساتھ کیونکر بسر کرنی ہے۔ غرض عصمت لڑکیوں کو سچ مچ کی بیگم بنائے گا۔

ٹائیٹل پیج کی آب و تاب سنہری بیل درجہ اعلیٰ کا کاغذ۔ ہاف ٹون تصاویر تنہائی میں دل بہلانے والا۔ فرصت میں کہانیاں سنانے والا۔ مذہب کی وقعت بتانے والا عصمت سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوگا۔ عصمت کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے۔ ۴۸ سے (۶۴) صفحے کا رسالہ کوڑیوں کے مول ملتی ہیں۔ سالانہ قیمت (۳ روپے)

منیجر عصمت و تمدن

(دہلی)

GOD SAVE [illegible]



The Empress Mary.

The C[illegible] P[illegible] BARODA.

تمدن

زبان اُردو کی ماہیت

فصل اوّل - وجہ تسمیہ

ہمارے محترم مولوی محمد اسمٰعیل صاحب آجکل زبان اُردو کی ایک مفصل تاریخ تحریر فرما رہے ہیں۔ ہماری درخواست پر مولانائے محترم نے اس کا یہ حصہ تمدن کو عطا فرمایا ہے۔ جو ہم نہایت شکریہ سے درج کرتے ہیں۔

چونکہ ترکی زبان میں اُردو کے معنی لشکر یا چھاؤنی کے ہیں اس لیے سلاطین مغلیہ کا لشکر تعظیماً اُردوئے معلی کہلاتا تھا۔ جب شاہجہانی لشکر میں اس زبان نے زیادہ رواج پایا تو اس کا نام زبان اُردوئے معلّٰی مشہور ہوا جس کو کثرت استعمال نے آخر کار محض اُردو بنا دیا۔

رفتہ رفتہ تمام اہل شہر اور امراء و شرفا بھی یہی بولی بولنے لگے لیکن انہوں نے اپنی زبان کو لشکر سے منسوب کرنا کسر شان سمجھا اور امتیاز کے لیے

اُس کا دوسرا نام ریختہ رکھا جو ریختن سے مشتق ہے اور جس کے حقیقی معنی بکھری یا جھڑی ہوئی چیز کے ہیں مگر اہل فارس کی اصلاح میں اُس زبان کو ریختہ کہتے ہیں جس میں مختلف زبانوں کے الفاظ مخلوط ہوں۔

اِن دونوں ناموں میں سے پہلے ہی کو شہرت نصیب ہوئی اور وہی مستحق تھا کیونکہ اِس زبان کے مقام رواج کو ہمیشہ یادولاتا رہیگا۔

دوسرا نام یعنے ریختہ عرف عام نہ ہوا بلکہ خاص لوگوں کی اصلاح رہا البتہ زمرہ شعرا میں لفظ اُردو کی بہ نسبت ریختہ کو زیادہ اعزاز حاصل ہوا ہے ریختہ کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالب کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

دد جو کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

فصل دوم - اُردو کی پیدایش

اگرچہ عام شہرت نے اُردو کے جنم پترہ پر عہد شاہجہانی کی مہر لگادی ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ دفعتہً ایسا انقلاب زبان میں ہوا بلکہ جس زمانہ سے شاہان غور کی سلطنت کا جھنڈا ہندوستان میں بلند ہوا اور مسلمانوں کی حکومت وہمسایگی نے ہندوؤں پر اثر ڈالا اُسی وقت سے ہندی بھاشا میں فارسی کا پیوند لگنا شروع ہوگیا تھا۔

چنانچہ راے پتھورا کے زمانہ کا کبیر چند کوی۔ عہد بلبن کا ملک الشعرا امیر خسرو۔ لودیوں کے وقت دیدانتی کبیر داس۔ اور دور اکبری کے سخنور بابا تلسی داس۔ سور داس ان سب کے ہندی اشعار میں۔ عربی۔ فارسی۔ الفاظ کی پیوندکاری کی گئی ہے +

عام باشندوں کی زبان میں تو نہایت آہستگی کے ساتھ ایک تغیر ہو رہا تھا لیکن اس کے برخلاف بادشاہی لشکروں میں جو نہایت متانت کا بیڑا تھا - جلد جلد زبان کروٹ بدلتی جاتی تھی - ترکی و فارسی بولنے والے سپاہی اور ہندوستانی سودا سلف بیچنے والے دونوں ایک دوسرے کے الفاظ استعمال کرنے لگے اور ایک ایسی بولی پیدا ہوگئی جس میں ہندی افعال کے ساتھ سب زبانوں کے اسمار کا بولنا جائز تھا -

تاریخ سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ اس زمانہ کے مسلمان بادشاہ زبان ہندی جانتے تھے خواہ بضرورت کاروبار سلطنت - خواہ اس وجہ سے کہ انھوں نے ہندوؤں کی آبادیوں میں بود و باش اختیار کی تھی - خواہ اس وجہ سے کہ بعض کے اہل عیال بھی ہندی تھے سلطان علاء الدین اور کولا دیوی کا رشتہ - شہزادہ خضر خاں اور دیول دیوی کا پیوند اس امر کی دلیل ہے کہ شاہی خاندان بھی ہندی زبان سے خالی نہ تھا -

۱۳۴۲ء کے اندر ابن بطوطہ افریقی جس نے تمام ایشیا کی سیاحی کا افتخار حاصل کیا ہے - محمد تغلق کے دربار میں آیا تھا - وہ لکھتا ہے کہ جب سلطان نے اس کو عہدۂ قضا پر مقرر کرنا چاہا تو اس نے ہندی نہ جاننے کا عذر پیش کیا تھا - گو مسلمان ہندی جانتے تھے مگر اس میں شک نہیں کہ بارھویں سے پندرھویں صدی عیسوی تک کوئی بڑا تغیر زبان میں نہیں ہوا جو اس کا رنگ ڈھنگ بدلتا اور ایک نئے لقب کا مستحق بناتا -

اس کو سبب یہ کہ جب تک ہندوؤں نے فارسی زبان کی تحصیل پر رغبت نہیں کی اور شاہان ... محمود تغلق سے حکمران تک نہ پہنچا اس وقت تک ہندی زبان میں فارسی الفاظ کی میل جول نہیں ہوتی -

فارسی زبان پر ہندوؤں کی توجہ کا زمانہ لودیوں کا عہد سلطنت کہا گیا ہے پھر شہنشاہ اکبر کے دور دورہ میں تو ایسی ترقی ہوئی کہ ہندو بھی فارسی دانی کو اپنے عروج کا ذریعہ سمجھنے لگے +

اکبر نے ایسے مدارس کی ترقی میں بڑی کوشش کی تھی جن میں ہندو مسلمانوں کے علم پڑھائے جاتے تھے - اور ہر شخص کی تعلیم اس کی حالت اور منشا کے موافق ہوتی تھی فیضی کی نگرانی میں ایک دفتر سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرنے کے لیے قایم کیا گیا تھا - شاہی محلات کو ہندوانیوں سے زیب و زینت حاصل تھی - اکثر مہمات میں راجپوت سورماؤں کے دستے افواج شاہی کے جدو و ہمقدم رہتے تھے - چنانچہ عہد شاہجہانی میں بہادر راجپوت کوہ ہندوکش کی گھاٹیوں اور ممالک بلخ و بدخشاں پر حملہ آور ہوئے ہیں +

یہ مغلیہ سلطنت اس نظر سے بھی ایک نیا زمانہ تھا کہ اس کو مغربی سرحد کے مسلمان قوموں سے چنداں تعلق نہ تھا اور اس لیے نئے گروہوں کی آمد جو ہند ہی سے ناآشنا محض ہوتے تھے اب بہت کم ہو گئی تھی -

ادھر تو مسلمان خاندانوں میں فارسی وقعت بڑھی ادھر ہندوؤں میں اسکی دھوم دھام بڑھی - اس طرح پر دونوں زبانوں کا امتزاج بہت تیزی سے ہونے لگا اور جو بات کئی صدی میں نہ ہوئی تھی وہ اس ایک صدی میں نمایاں ہوئی کہ عہد شاہجہانی کا ڈھانچ اتنا بدل گیا کہ اس کو اردوی معلّی کا خطاب مل گیا - اور اسی طور سے جہاں جہاں سلطنت کے صدر مقام تھے وہاں ہی اس تغیر کا اثر پہنچا -

---

فصل سوم۔ اُردو کے عناصر

اس زبان میں اطراف ہند مغربی ایشیا اور وسط ایشیا کی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ اور اسی رنگا رنگی نے اس کو ایک نئی زبان بنا دیا ہے۔

اگر تم اُردو کو ایک درخت فرض کرلو تو ہندی کو اس کی جڑ پاؤ گے اور عربی فارسی ترکی کو اس کے شاخ و برگ اور پھل پھول سمجھو گے جن سے یہ نونہال ہرا بھرا نظر آتا ہے۔

پس اس کے بڑے عناصر چار ہیں۔ ہندی۔ فارسی۔ عربی۔ ترکی اور آخر کار انگریزی بھی اس کا پانچواں عنصر بنا چاہتی ہے۔

ان کے علاوہ زبانوں کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں مثلاً پنجابی۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ فرانسیسی۔ پرتگالی۔ وغیرہ اور بعض مجہول النسل الفاظ بھی آملے ہیں جن کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ کس کیست سے تجھوے ہیں۔ مگر عناصر خمسہ کے سوا باقی کی تعداد اتنی قلیل ہے کہ وہ کسی شمار قطار میں نہیں ہیں البتہ ان کو اُردو کی بہیر سمجھنا کچھ بے جا نہ ہوگا÷

اب طالب علموں کے لیے زیادہ مفید یہ بات ہے کہ وہ ہر ایک عنصر کا حسب نسب معلوم کریں اور یہ بات جانیں کہ وہ زبان کے کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور زمانہ کی گردش نے ان کو کہاں سے کہاں پہنچایا ہے اور ان میں باہم کیا کیا رشتہ اور قرابت ہے÷

(۱) برج بھاشا یہ کوئی خالص زبان نہ تھی بلکہ پراکرت ہندی۔ اور سنسکرت سے مل کر بنی تھی۔ بہت سے سالم اور بگڑے ہوئے الفاظ سنسکرت کے اس میں شامل ہیں÷

سنسکرت	برج بھاشا	سنسکرت	برج بھاشا
گرہ	گھر	مستک	ماتھا
گرام	گانوں	ہست	ہاتھ
ہستی	ہاتھی		

قدیم زمانہ میں تحریری زبان سنسکرت تھی پنڈتوں کی تمام تصنیفات اُسی زبان میں تھیں مگر جب سے کرشن جی کے پوجنے والوں نے ان کی مدح ثنا کے لیے اپنی عام بھاشا کو منتخب کیا۔ اُس وقت سے اس زبان کو کتابوں میں لکھے جانے کی عزت حاصل ہوئی اور نیز گرو رامانند کے چیلوں کبیر وغیرہ نے عوام الناس کی تعلیم و تلقین کے لیے جو عارفانہ مضامین کے موتی پروئے۔ وہ بھی اس زبان کے فروغ میں بڑے مددگار ہوئے اور اس کو تحریری زبان بنانے میں کرشن جی کے مدح خوانوں سے کم کام نہیں کیا

سنسکرت۔ یہ ہندوستان کے آریوں کی زبان تھی جو شمال و مغرب سے آن کر یہاں آباد ہوئے تھے۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ زبان عالمانہ تصنیفات کے لیے مخصوص تھی یا کبھی ہند میں عام طور پر بولی بھی گئی۔ بہر کیف اب تو مدت سے کتب خانوں میں ہے اور ایک مردہ زبان سمجھی جاتی ہے۔ مگر اس کی اولاد بنگالی۔ ہندی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ وغیرہ موجود ہے۔

فارسی۔ یہ آریہ نسل کی اس شاخ سے علاقہ رکھتی ہے جو ایران میں آباد ہوئی تھی اور ژند۔ پارسی۔ اوستا۔ وغیرہ اس کی بہنیں ہیں جو ایرانی خاندان کی زبانیں تھیں۔ فارسی اور سنسکرت میں بہت ہی قریب کا رشتہ ہے کیونکہ ایرانی۔ آریا۔ ہندی آریا۔ اصل میں ایک ہی سرزمین کے باشندے اور ایک ہی زبان کے بولنے والے تھے چنانچہ اب بھی فارسی اور سنسکرت میں

صدہا ایسے لفظ پائے جاتے ہیں جن کی اصل ایک ہے گو ان کے ہجوں اور تلفظ میں کچھ فرق ہو گیا ہے +

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
بوم	بھوم	استان	استھان	استن یا تون	استم	چرم	چرم
چتر	شتر	شیر	کھیر	اشتر	اشٹ	داماد	یاماتر

عربی - اس کو آرین زبانوں سے کچھ تعلق نہیں بلکہ وہ سیمٹک خاندان یعنی اولاد سام سے علاقہ رکھتی ہے۔ اور اس کا رشتہ ناتہ سریانی و عبرانی زبانوں سے ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ عربی اور عبرانی میں ایسا ہی کم فرق ہے جیسا کہ ان دو لفظوں میں۔

عربی بلا واسطہ ہندوستان میں نہیں آئی بلکہ وہ فارسی میں اس وقت سے شامل ہو چکی تھی جب سے اہل عرب نے ایران کو فتح کیا تھا۔ گو عرب کی فتحمندی نے دونوں زبانوں کو شیر و شکر کر دیا تھا مگر ان میں خاندانی تعلق ایسا نہ تھا جیسا کہ فارسی اور سنسکرت میں تھا عربی کو فارسی خواہ اردو میں فضیلت و فوقیت صرف اسی وجہ سے حاصل نہیں ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی علوم کا سرچشمہ تھی۔ بلکہ وہ آخر زمانہ میں تمام دنیا کے علوم کی جائے پناہ تھی اور دنیا کی مہذب زبانوں میں ایک معزز زبان ہو گئی تھی اور نیز برخلاف آرین زبانوں کے اس کے اشتقاق و تصریف میں غایت درجہ کا اختصار بھی ہے جس کا بیان آئندہ باب میں کیا جائے گا۔ عربی کے ساتھ ساتھ بعض یونانی الفاظ بھی آ گئے ہیں کیونکہ یونانی علوم کا ترجمہ عربی میں بہت کچھ کیا گیا تھا +

ترکی - اس کو نہ تو آرین زبانوں سے تعلق نہ سیمٹک سے ربط۔

یہ ایک تیسرے خاندان تورانی سے متعلق ہے جس کی شاخیں ہنگری تامل۔ تلیگو۔ جاپانی۔ چینی۔ تبتی۔ اور جنوبی افریقہ کی زبانیں ہیں۔

جب تاتاریوں نے عرب کی ایرانی سلطنت کو دبا لیا تو فارسی میں ترکی الفاظ بھی شامل ہو گئے خصوصاً ہندوستان میں تو ترکی ہی خاندان کے بادشاہوں نے سلطنت جمائی۔ اور انہیں کے خاندان پر ختم ہو گئی لیکن ترکی الفاظ کی افراط اس وجہ سے نہ ہوئی کہ ترکوں کے عہد میں درباری زبان ہمیشہ فارسی ہی رہی۔

انگریزی۔ یہ بھی مثل فارسی یا اردو کے مرکب زبان ہے جس میں بعض یونانی۔ لاطینی۔ الفاظ شامل ہیں جس طرح فارسی میں عربی یا ہندی میں سنسکرت مگر ہمارے طالب علموں کو صرف اس قدر جان لینا کافی ہے کہ اس کا تعلق آرین خاندان سے ہے۔ اور جو رشتہ فارسی کو سنسکرت کے ساتھ تھا وہی انگریزی کو ہے علمائے زبان نے ایک بڑی تعداد ان الفاظ کی دریافت کی ہے جو تمام آرین زبانوں میں مشترک پائے جاتے ہیں۔ اور نہ صرف الفاظ ہی میں اتحاد و اشتراک پا گیا بلکہ آرین زبانوں کے جملوں کی ساخت اور اجزا ر جملہ کی ترکیب و ترتیب میں بھی مطابقت ثابت ہوئی ہے۔

ذیل میں چند ایسے الفاظ نقل کیے جاتے ہیں جن سے معلوم ہو گا کہ سنسکرت۔ فارسی۔ اور انگریزی۔ یہ تینوں ایک ہی کھیت کے گھوڑے اور ایک ہی باٹ کے روڑے ہیں جن کو وطن کے اختلاف اور زمانہ کے انقلاب نے اجنبی بنا دیا ہے۔

سنسکرت	فارسی	انگریزی	سنسکرت	فارسی	انگریزی
پتر	پدر	فادر	بدھوا	بیوہ	وڈو
دوہتر	دختر	ڈاٹر	استھا	استاد	اسٹینڈ
ود	وَد	وِٹ = دانشمند	یوگ	یوغ	یوگ = جوا
بھراتر	برادر	برادر	شرکرا	شکر	شُگر
نوین	نوا	نیو	۔	نام	نیم

انگریزی کا میل اُردو زبان میں بالکل فارسی و ہندی کی تقلید پر شروع ہوا ہے لیکن انگریزی کے رواج کو انگریزی قوم کی تجارت سے۔ گورنمنٹ کے صیغۂ تعلیم سے اور نیز چھاپہ اور اخبارات سے ایسی زبردست مدد ملی جو فارسی کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔

متفرقات۔ اب ہم باقی الفاظ کو جو اُردو میں شامل متفرقات میں شمار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی تعداد قلیل ہے۔ ان میں سے بعض تو ہندوستان ہی کی دوسری زبانوں کے ہیں۔ مثلاً **پنجابی بنگالی** وغیرہ اور بعض یورپ کی زبانوں کے ہیں اور یہ ان قوموں کی یادگار ہیں جنھوں نے مثل انگریزوں کے ہندوستان کی تجارت شروع کی تھی۔ اور حکومت حاصل کرنے میں بھی زور لگایا تھا +

لفظ	نام زبان	لفظ	نام زبان	لفظ	نام زبان
نیلام		پادری		گرجا	
تولیہ		بسو		پاگل	

فصل (۴) اُردو کی ترقی

(۱) اُردو تحریری زبان بن گئی

اگرچہ عہد شاہجہانی یا کچھ پیشتر سے شہروں میں اُردو زبان کا روزمرہ ہوگیا تھا مگر نہ تو سرکاری دفتروں میں نہ عام خط وکتابت میں اس کو جگہ ملی البتہ شعراء نے جو اس زمانہ کا ایک عالمگیر مرض تھا پہلے پہلے اس زبان پر توجہ کی نظر ڈالی اور جو کچھ شاعروں نے نظم کیا اس کو محفوظ رکھنے کی غرض سے بیاض وسفینہ میں لکھ لیا۔ تذکرہ نویسوں نے ولی گجراتی کو جو عہد عالمگیری میں تھا سب سے پہلا شاعر اُردو قرار دیا ہے غالباً اس شہرت کی یہ وجہ ہے کہ اوّل اسی شاعر نے اُردو غزلیات کا دیوان مرتب کیا تھا۔ رفتہ رفتہ قصے افسانے اور مذہبی۔ اخلاقی۔ ادبی۔ اور فقہ کے رسائل بھی اس میں تصنیف وتالیف ہونے لگے یہاں تک کہ قرآن مجید اور حدیث وتفسیر کی کتابیں بھی ترجمہ ہوئیں۔

(۲) اُردو درباری زبان بن گئی

۱۸۳۴ء سے سرکار انگریزی نے تمام عدالتوں میں بجائے فارسی کے اُردو کو قایم کیا۔ اور ادنےٰ درجہ کی تعلیم کے مدارس جو گورنمنٹ کی طرف سے جاری کئے گئے۔ ان میں بھی تعلیمی زبان اسی کو قرار دیا۔ اور اس ذریعہ سے ان علوم وفنون کی کتابیں تالیف وترجمہ ہوئیں جو داخل درس سمجھے گئے۔

فصل ۵۔ اُردو کا طرز انشا بدل گیا

۱۸۵۷ء کے بعد ایک نیا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں شروع ہوتا ہے

جس نے بہت جلد کایا پلٹ دی ہے۔

گورنمنٹ کا صیغہ تعلیم ترقی پا رہا ہے۔ یوروپین خیالات کی گھٹا اُمڈی چلی آتی ہے پورانی تعلیم اور پورانے خیالات روز بروز دلوں سے دھلتے جاتے ہیں +

دلّی اور لکھنؤ کے وہ دونوں گھر برباد ہو چکے ہیں جو نازک خیال اور شیریں مقال مدحت شعار و خوشامد نگار شاعروں کے لیے کعبۂ امن و امان تھے اب نہ وہ سر ہے نہ وہ سودا۔ نہ وہ راگ ہے نہ وہ ٹھاٹ۔ عاشقانہ غزلخوانی اور جھوٹی جادو بیانی قبر میں پانو لٹکائے بیٹھی ہے۔ لیکن جس قدر اس منحوس شاعری کا زور گھٹا ہے۔ اسی قدر نثر میں جان پڑ گئی ہے۔ اردو اخباروں کی تہذیب و ترقی کے ساتھ ساتھ اُردو نثر بھی پرمعنی اور پُر زور ہوتی جاتی ہے۔

انگریزی آرٹکلوں اور کتابوں کے ترجموں نے انگریزی طرز انشا کا سایہ اُردو پر ڈال دیا ہے۔ اب اخباروں اور قصے کہانیوں میں وہ بیہودہ قافیہ بندی جو لکھنؤ والوں کا خمیر تھا اور جس کے شکنجہ میں محاورے اور مضمون کی مشکیں خونی مجرم کی طرح کسی باقی تھیں۔ خود اسی کا قافیہ تنگ ہے۔ بیدل اور ظہوری کی تقلید کرنے والے کوچ کر گئے ہیں۔ میرزا سرور کے فسانۂ عجائب پر مکھیاں بھنکنے لگی ہیں سرکاری مراسلت اور باہمی خط و کتابت کے بیہودہ فقرے غلامانہ القاب و آداب کی بیڑیاں کٹ گئیں۔ توسن خامہ اور شب دیز قلم کو اگاڑی پچھاڑی لگا دی گئی ہے۔ اب وہ پہلے زمانہ کی سی کوہ پیمائی نہیں کرتے +

اب سادہ سلیس اور معنی خیز عبارت کا رواج ترقی کر رہا ہے۔ وہ خیالی تشبیہیں اور مبالغے جن کا سبھنا لنا پنجاب کے عامہ اور لکھنؤ کے پاجامہ کی

طرح سخت دشوار تھا اس زمانہ کی انشا سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ اگرچہ بہت کچھ ہوا اور ہو رہا ہے مگر ہمارے علم ادب کو ابھی بہت سی منزلیں تہذیب و ترقی کی طے کرنی باقی ہیں +

سنسکرت	فارسی	یونانی	لاطینی	جرمن	انگریزی	اردو
پِتر	پدر	پُتِر	پِتَر	وتر	فادر	باپ
استہا	اِستاد	استمی	اِستو	استہی	اسٹینڈ	کھڑا
یوگ	یوغ	زگیس	جوگم	جوچ	یوک	جُوا
وِد	وَد	فیڈو	وڈو	وسی	وٹ	دانشمند
	تندر				تھنڈر	
	نرسک				فزیشن	
براتر	برادر				برادر	
بدہوا	بیوہ				ورڈو	
	مادر				مدر	
دُہتر	دختر				ڈاٹر	
شراکرا	شکر				سگر	
اشٹ	ہشت				ایٹ	
اشٹ	اشتر					
بھوم	بوم					
نویں	نو				نیو	
	نام				نیم	

چونکہ مختلف ضرورتوں سے مختلف گروہوں نے نثر کو ترقی دی ہے

اس لیے ہر فرقہ کی تحریر میں اس کی جداگانہ کیفیت ہے اس لیے ہم اسکی قسمیں قرار دے کر ہر قسم کا حال جدا جدا بیان کرنا چاہتے ہیں -

۱- مولویوں کی نثر -
۲- سرکاری دفتروں کی نثر
۳- قصے کہانیوں کی شاعرانہ نثر
۴- سررشتہ تعلیم کی نثر -
۵- اخباروں کی نثر

ہمارے مولویوں کی اردو بیشتر بے محاورہ ہوتی ہے وہ شاید اس زبان کے اصول کیطرف توجہ کرنا کسرشان سمجھتے ہیں اکثر ان کے جملوں کی بناوٹ عربی سے مشابہ ہوتی ہے صرف مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی کا مشہور ترجمہ قرآن مجید البتہ اس سے مستثنیٰ ہے - خیر ترجمہ کرنے والے تو کسی قدر معذور خیال کیے جا سکتے ہیں مگر بعض بزرگوار تو اپنی تالیف و تصنیف میں بھی یہی غضب ڈھاتے ہیں -

سرکاری دفتروں کی اردو بھی کسی قدر بے ڈھنگی ہوتی ہے -

محمد اسمٰعیل - میرٹھی

لڑکیوں کی انشا - حامیان تعلیم نسواں کی عرصے سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمد عبدالراشد صاحب الخیری کی قلم سے نکلے بلطف زبان کے واسطے کچھ لکھنا بیسود ہے - ہر خط ایسا موثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گڑتا ہے - قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول ڈاک - ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھ آنہ - (۸ر)

منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجئے

شبنم

برگِ صافِ گُل پہ عکسِ خوشۂ پرویں ہے تو — سچ بتا یا چاکِ گُل کا تکمۂ سیمیں ہے تو
ہے حبابِ شیشہ یا ہیرے کا کوئی ریزہ ہے — یا کسی معشوق کے تو کان کا آویزہ ہے
بیچ میں تجھکو لیے ہے برگِ غنچہ کی حریم — یا شوالہ میں ہے اک رکھا ہوا ناقوسِ سیم
دامنِ نرگس میں تیرے گوہرِ شہوار ہیں — یا میانِ صحنِ میخانہ لوٹے میخوار ہیں
شاہدِ گُل کی انگوٹھی کا نگینہ ہے کوئی — یا کفِ ساقیِ گُل پر آبگینہ ہے کوئی
تو کوئی نقطہ ہے تحریرِ کتابِ حسن کا — یا شرارہ ہے کوئی تو برقِ تابِ حسن کا
فصلِ گل میں بزمِ گل کا تو کوئی پیمانہ ہے — سچ بتا یا خرمنِ مہ کا تو کوئی دانہ ہے
شاہدِ گُل کی جبیں کا قشقۂ افشاں ہے تو — کشتیِ غنچہ کا یا اک گوہرِ رخشاں ہے تو
ہے جوانانِ چمن کا خندۂ دنداں نما — بزمِ گل میں یا ہے آویزان بلوری قمقمہ
کودکِ غنچہ کے سر پر رکھی ہے بانکی کلاہ — نصب ہے شبگیر کے واسطے یا میلِ راہ
سچ بتا آویزۂ غنچہ میں ہیرے ہیں جڑے — یا کسی معشوق کے آنچل میں موتی ہیں جڑے
جوش زن سیلِ بہاری ہے اور اس کا کف ہے تو — سچ بتا یا مطربِ بلبل کا کوئی دف ہے تو
آتشِ گل پر ہوا سیماب کا کیونکر قیام — تو یہ گل میں ہے شاید یہ گدازِ سیمِ خام
کرمکِ شبتاب یا سنبل نے کھینچے جال میں — یا کسی معشوق نے موتی پروئے بال میں
گر پڑا ہے موتیوں کا کوئی مالا ٹوٹ کر — دستِ ساقی سے گرا یا کوئی ساغر چھوٹ کر
تجھ میں پنہاں رازِ سازِ عشرتِ دیرینہ ہے — برگِ گل آئینہ اور تو جوہرِ آئینہ ہے

کون ہے تو؟ اور ہے تیرا حیّزِ اصلی کہاں ؟
کھینچ لایا آب و دانہ کس طرح تجھ کو یہاں ؟

بیکس و مظلوم و فریادی ہمہ سرتا پا ہوں میں
ہمہ تن آبلہ ہوں، منجمد اک آہ ہوں

ہوں میں شب کی صحبتِ برہم کا جامِ واژگوں
گریہ مجبور ہوں، پایا ہے بختِ سرنگوں

ڈالدے مجھکو جہاں چاہے دستِ تقدیر کی
بند میں پڑ جائے پیروں میں کڑی زنجیر کی

کیا خبر میں ہوں شکستہ حال یا راحت نصیب
اس قدر میں جانتا ہوں عقدۂ مشکل ہوں میں

ہے مری ہستی فنائے عیش و عشرت کی دلیل
ہم وطن گل کا مجھ کو جانتے کوئی جلیل

تم سمجھتے ہو کہ ڈالی گل سے میں بیریدہ ہوں
دیکھو آنکھیں کھولکر ہیں دیدۂ پرآب ہوں

چاند نے ہنس کے کہا سورج نے تو رلا لیا
سمجھے لوگو کہ بازی ہوں میں ہر ذرہ کا

گل کی بو سر میں ہوس نے کچھ چمن کی فکر ہے
دستِ پا کا ہوش ہے مجھ کو نہ تن کی فکر ہے

سلسلۂ نجیبوں کا میری ہستی کی دلیل
زاری گمشدہ ہوں بس، اک بیقراری ہوں طویل

نیاز فتحپوری

یاسمین۔ پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب ایم۔اے مصنف خواب ہستی کی یہ لاجواب نتیجہ خیز ناول اور تمدن ایجنسی کی پہلی کتاب جس کا عرصے ملک کو انتظار تھا تیار ہو گئی ہے۔ یہ کتاب جو درحقیقت حسن و محبت کی زندہ تصویر ہے۔ قابل مصنف نے خصوصیت سے نوجوان طلبا کے واسطے لکھی ہے اور مختلف مضامین پر اس قابلیت سے بحث کی ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یاسمین جو اس تمام قصہ کی جان ہے ایک نوجوان لڑکی ایک مشہور نازنین ہے اسکی زندگی کا ہر ورق فلسفۂ حیات کے پیچیدہ مسئلہ کو نہایت خوبی سے حل کر رہا ہے۔ قابل مصنف کا اسم گرامی کتاب کے لاجواب ہونے کی کافی ضمانت ہے۔ قیمت (عمر) منیجر عصمت و تمدن دھلی سے طلب کیجیے۔

تمدن اسلام

[illegible]

(۴)

جن قوموں کے حالات آپ نے ابتک ملاحظہ فرمائے ان کے سوا دنیا کی اور بھی اکثر قوموں نے اسلام کی [illegible] مثلاً [illegible] آرمنی اہل سسلی، اہل روم، وغیرہ کا شمار [illegible] کی مفتوحیت کو [illegible] کسی نے جانا [illegible] ان ممالک کے اقوام جب [illegible] بیگانہ تھے تو [illegible] انہیں جہان اور خوب طرح پہچان کے سلطنت اسلام نے انہیں دنیا کے [illegible] ترقی کے رنگ دکھائے، تمدن کے ڈھنگ بتائے [illegible] ان [illegible] نے ان کے دل و دماغ کے ساتھ ایسا کام کیا جیسے ایک پتلے آدمی سے دو ایک شخص طبع رفیق ہی آملیں رات ہو جاتی اور وہ بھی ٹھنڈی ٹھنڈی تو کھلا ہوا میدان اور مرغزار دیکھ کر اُن کا دل خواہ مخواہ مچل ہی اُٹھے گا کہ کچھ چلت پھرت ہو۔ یہی مواقع اُن مفتوحہ اقوام کو بھی حاصل تھے۔ لہذا خواہش پرواز ہر دل میں لہریں لینے لگی۔ اور ہر شخص اپنے بازوؤں کی طاقت بھر آسمان پر جانے لگا۔ بالآخر اس کوشش اور سعی کے عام مذاق نے (جو پہلے تو مقابلہ کے جوش اور دیکھا دیکھی سے پیدا ہوا تھا مگر پھر وہی رنگِ طبیعت طبیعت بن گیا) اُن کی حالت میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔

اُن کی نیچرل استعداد پر اس باب کی مساعدت نے وہ رنگ و روغن دیا

کہ اُن کی اگلی اور پچھلی حالتیں خود کفر و اسلام کے فرق کا معیار بن گئیں،

اُن کے مساعی مشکور، اور اُن کے خرابے معمور ہونے کی چند تاریخی نظائر پیش کرنے کی ہم ناظرین سے معافی چاہتے ہیں، اور بنظر سہولت انہیں ذیل کے نقشہ میں دکھاتے ہیں،

سلسلہ	نام	ابتدائی حالت	درجہ ترقی	کیفیت
۱	ملک الافضل	معمولی درجہ کا ایک آرمنی شخص تھا،	تدریجاً کمانڈر انچیف افواج کے درجہ تک پہونچا	
۲	بدر	خلیفہ مستنصر باللہ کا غلام تھا	فیلڈ مارشل کے درجہ پر فائز ہوا۔	مزید براں یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ فوجی نشانوں کے پھریروں، اور سرکاری فوجی اسلحہ پر اسی کے نام کا معرکہ ہوتا تھا،
۳	صلاح الدین	اس نے قوم کرد میں جنم لیا۔ فوج میں آکر نوکر ہوا	پھر ایک فوجی سپاہی سے بڑھتے بڑھتے۔ سلطان صلاح الدین بن گیا۔	یورپ کی تمام متحدہ طاقتوں سے بیت المقدس کے لیے ایک عرصہ تک ہنگامہ آرا رہا۔ مسلمان تو مسلمان ہیں یورپ میں عیسائیوں کا بچہ بچہ سلطان صلاح الدین کے نام سے واقف ہے

نمبر شمار	نام	ابتدائی حالت	درجہ ترقی	کیفیت
[illegible]	بجکم	کسی خلیفہ بغداد کا غلام تھا	امیر الامرا کے درجہ پر فائز ہوا تھا۔	یہ درجہ دولت عباسیہ کے اعلیٰ ترین باری عہدوں سے تھا
۵	جوہر	ایک رومی غلام تھا	فاطمیین مصر کا نامور سپہ سالار تھا	اس نے مصر میں فاطمیین کی سلطنت قایم کی، اور چوتھی صدی ہجری کے وسط میں قاہرہ کی نیو ڈالی، خلیفہ معز کی اولاد نے اس کا یہاں تک اعزاز کیا کہ جب فتح مصر کے ارادہ سے خلیفہ وارد مصر ہوا تو انہوں نے پیادہ دور تک جا کر اس کا استقبال کیا،
۶	کافور الاخشیدی	حبشی غلام تھا	مصر میں بادشاہی و حکومت اس نے کی	۳۵۶ھ ہجری میں اس کی حکومت کا سلسلہ ختم ہوا ہے،
۷	منکتمر	کسی مسلمان بادشاہ کے خدام میں سے تھا۔	خود مختار والی ملک بنا دیا گیا	کاروبار سلطنت میں ابتداءً اس کا دماغ خوب کام دیتا تھا، انتظامی قوت و سیاسی قابلیت نے کام بڑھا دیا، اور خود مختاری حکومت مل گئی
۸	برجوان	ایک معمولی شخص تھا	خلیفہ عزیز باللہ و حاکم بامر اللہ فاطمی کے عہد میں	فاطمیین مصر کے وزیر تھے پہلا خطاب یا نیو الالہی ہے۔

سلسلہ	نام	ابتدائی حالت	درجہ ترقی	کیفیت
			منصب وزارت سے گرانقدر کیا گیا، او امین الدولہ کا خطاب ملا۔	
۹	قراقرش الطواشس	ایک معمولی شخص تھا	وزیر صلاح الدین ایوبی	x
۱۰	عمید الملک	"	ترکوں کا ایک بڑا نامور جنرل	x
۱۱	سشقیر	کسی کا خادم تھا	بنی طولون کے عہد میں مصر و شام کے ڈاکخانہ جات کا افسر اعلیٰ ہوا۔	x
۱۲	موتمن الخلافۃ	"	دولت فاطمیہ کا مشہور وزیر تھا۔	x

یہ اور اس قسم کی بے شمار مثالیں ادنیٰ حالت سے ترقی کر کے اعلیٰ درجہ پر پہونچنے کی خلافت اندلس۔ عہد سلاجقہ اور دیگر دول اسلام کی پیش کی جا سکتی ہیں تاریخ جن سے بھری پڑی ہے +

اسلام کا مشن ان تمدنی حالات سے اگر تھوڑی دیر کے لیے قطع نظر کر لی جائے، اور اجتماعی (سوشل حالات پر تاریخی وثائق کی امداد سے نظر ڈالی جائے تو اسلام کی زبردست روحانی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے جسکی وجہ سے مغلطات باطلہ کو شکست اور تحقیق کو رواج ہوا۔

سب سے پہلے اسلام نے مسئلہ "ذات باری تعالیٰ" اور "واجب الوجود" کی تحقیق کی، کیونکہ دنیا اس منزل کی تلاش میں بہت ٹھوکریں کھا چکی تھی اور پھر بھی ایسے غلط راستہ پر جا رہی تھی کہ ماسوی اللہ عالم کا ہر ہر ذرہ اُس کا معبود اور مرجع انقیاد وعبادت بنا ہوا تھا، اس نے ان گم گشتوں کو اِس آواز غیب سے خبردار کیا،

وہ یکذات واحد عبادت کے لائق — زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اُسی کے ہیں فرمان اطاعت کے لائق — اُسی کی ہے سرکار عبادت کے لائق

جھکاؤ تو سر اوس کے آگے جھکاؤ
لگاؤ تو بس لو اُسی سے لگاؤ

یہ اور اسیطرح مسئلہ رسالت اور پھر آخرت وغیرہ کی کنہ سمجھائی، اور دین کے ساتھ ساتھ دنیا کا انتظام بھی بتایا،

غرض دنیاوی امور میں اُس کے عقلی فیصلے، اور مذہبی مسائل میں اُس کے سہل اور آسان شرائع ایک عالم کی نظر میں ایسے سہانے کہ

ہوا کعبہ آباد سب گھر اُجڑ کر
جمے ایک جا سارے ذنگل بچھڑ کر

طریق اشاعت دنیا میں کسی مذہب یا کسی فرقہ کے خیالات کی اشاعت کے عموماً دو طریقہ رائج تھے بزور شمشیر اشاعت ہوتی تھی یا مشنریوں کی

فریب کاریوں سے۔ مگر دراصل ان دونوں طریقوں سے شائع کیے ہوئے خیالات اور مذاہب اپنے متبعین کی راسخ الاعتقادی کے ذمہ دار ہرگز نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ خود مذہب یا اُس خیال میں کوئی الہامی طاقت یا ارتقائی رُوح نہو۔ کیونکہ جس فریب اور عارضی اثر کی سطح پر اُس کا پایہ قایم ہوگا اُس کے زائل ہوتے ہی عمارت بھی اُکھڑ جائے گی۔

چنانچہ اسلام نے اپنے دوسرے زرین اصولوں کی طرح طریق اشاعت میں بھی ان جبری اصولوں سے کہیں کام نہیں لیا، (اگرچہ اس مقام پر دہ صورت معترضین کی نگاہ میں کھٹکے گی جو مفتوحہ ممالک میں "بطریق مالفہ الخلق" قبول اسلام کی پیش کیجاتی ہے مگر یہ یاد رہے کہ اُس مارشل لا کے ذمہ دار سیاسی مصالح ہیں نہ مذہب،

اسلام کی اشاعت برفرد اسلام کے خود طرزِ عمل نے کی، مسلمان اپنے دنیاوی کاروبار، علمی تحقیق و تلاش، اور فتوحات کے لیے جدہر نکل گئے اپنے کام کے ساتھ اپنے پاک مذہب کی اشاعت بھی کر آئے، اس کے لیے اُن کے پاس چلتے ہوئے منتر محض اُن کے مذہب کا تعلیم کیا ہوا اخلاق، اُن کا بے نظیر تمدن، اور اُن کی معاشرت تھی، اس کے سوا نہ کوئی مشنری تھی، نہ ابلہ فریب داعی اور وکلا رہتے،

مگر صد حسرت اُن پاک اور مقدس جادۂ صداقت کی راہ پیما، اور روشن ضمیر مسلمانوں کی نیک اخلاق اور نیک اعمال پر کہ اُن کی مساعی کا وہ حصہ

سلہ اسلام اپنے مفتوحہ اقوام کے سامنے تین باتیں پیش کرتا ہے۔ اسلام لاؤ۔ جزیہ دو ورنہ جنگ کرو؟ مگر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس "الٹیمیٹم" میں بھی کس قدر آزاد شرائط پر حصر کیا جاتا ہے، جو اسلامی احکام کی ایک عام خصوصیت ہے ۱۲۔

جس کا تعلق قلب اور ضمیر سے تھا اب تک بھی لہلہا رہا ہے۔ اور اقطاع عالم مثلاً مصر، شام، عراق، جزیرہ عرب، فارس، ہند، جزائر بحر محیط ملاکا، بورنیو، وسط افریقہ، افریقہ شرقی، زنجبار، ترکستان، افغانستان، چین، امریکہ، آسٹریلیا، اسپین، وغیرہ میں مسلمان باوجود مخالفانہ کوششوں اور سازشوں کے آج بھی اپنا ایک مستقل، اور اقوام عالم پر گراں گزرنے والا وجود رکھتے ہیں، جو انکی روحانیت کا آفتاب سے زیادہ روشن کرشمہ ہے

مگر کیا اس شعار اور اس روحانیت پر جو آج محض مسلمانوں کی اعتقادی کفالت کر رہی ہے، قناعت کر لینے سے مسلمان سچے برگزیدہ اور نامور اسلاف کے خلف، اور اپنے تہذیب و ترقی سے باقی مذہب کے تبع ٹھہر گئے؟ جبکہ اس شعار اور ایمان کی صحیح مثال یہ ہے کہ

طاؤس را بنقش و نگارے کہ ہست خلق
تحسیں کنند و او خجل از زشت پائے خویش

ہرگز نہیں! مسلمان مسلمان جبھی ہیں کہ وہ علم و حکمت، تہذیب و ترقی، تمدن و اخلاق کے جامع ہوں، کیونکہ اسلام انہیں اجزاء کے مجموعہ کا نام ہے۔ نشاۃ جدیدہ کے کارناموں سے واقف و ماہر ہوں، کیونکہ اسلام تحقیق و تلاش استدراک و استنباط کا حامی اور معلم ہے ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ"

خان عالی

لہ اسلامی دنیا کی مردم شماری عیسائی کانفرنس منعقدہ قاہرہ نے تیس کروڑ سے کچھ زیادہ شمار کی ہے ۱۲

خلاصۂ نظم اقبال

(جو انجمن حمایت الاسلام لاہور کے جلسہ میں پڑھی گئی)

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے؟
راہ تو رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا؟
ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو

دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی
قیس تو لیلا بھی تو صحرا بھی تو محمل بھی تو

وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا!
مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایّام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

اب تلک شاہد ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت
اے تغافل پیشہ تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

دل کی کیفیت ہے پیدا پردۂ تقریر میں
کسوتِ مینا میں ہے مستور بھی عریاں بھی ہے

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے
اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی۔

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
یعنی گُل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی

دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

پھر دلوں کو یاد آجائیگا پیغامِ سجود
ہر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اقبال

"ہندوستان کا قدیم ترین شہر"

اُجّین

ہندوستان کے تمام شہروں میں بہ لحاظ قدامت جو امتیازی خصوصیت اُجین سے وابستہ ہے وہ اُسے موجودہ گئی گذری حالت کے باوجود شائقین یادگار قدیمہ کی نظر میں خاص طور پر موثر اور قابل وقعت بنائے ہوئے ہے۔ زمانہ کے تغیرات کے ساتھ ہندوستان کی آبادی بھی انقلاب کے لازمی اور جبری قانون کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکی لیکن مالوہ کا قدیم دارالسلطنت۔ راجہ بکرماجیت ایسے علم دوست اور اُلوالعزم فرماں روا کا مستقر حکومت اور کالیداس ایسے زندہ جاوید شاعر کا مولد و مسکن حادثات دنیاوی اور نیرنگیٔ زمانہ کا شکار ہونے کے باوصف اپنی ٹوٹی پھوٹی دیواروں اور خراب خستہ عمارات سے اب بھی گوناگوں دلچسپیوں کا مجموعہ بنا ہوا ہے اس میں شک نہیں کہ زمانے کے دستبرد سے اُس کی شان و شوکت اور عظمت و جلال کی پہلی سی دلآویز کیفیت باقی نہیں رہی لیکن آثار قدیمہ کے جوہریوں کو اب بھی اُس کے کھنڈرات میں وہ بیش بہا جواہر مل سکتے ہیں جن کی آب و تاب اور چمک دمک سے کسی زمانے میں "عروس مالوہ" کا سہاگ قایم تھا۔ انقلاب کے زبردست ہاتھ نے گو اس کی حالت وحیثیت میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہی اُجین جو آجکل رنڈاپے کی صعب انگیز زندگی بسر کر رہا ہے کسی وقت میں تمام ہندوستان کی آبادی میں اس درجہ ممتاز تھا جیسے

سُہاگن کے زیوروں میں ناک کی نتھ۔

اُن خصوصیات سے قطع نظر کرکے دیکھئے تو تاریخ اور قومی روایات کے بموجب اس کی آبادی ہندوستان کی قدیم ترین آبادی ثابت ہوتی ہے اور شاید صرف یہی ایک خصوصیت اُسے تاریخ عالم میں نمایاں درجہ دلانے کے لیے کافی وجہ سمجھی جاسکتی ہے۔ یہ کہنا دشوار امر ہے کہ اُجین کب آباد ہُوا۔ تاریخ اس سوال کا جواب دینے سے ساکت ہے۔ البتہ ہنود کے عام یقین کی بنیاد پر اگر اندازہ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ جب سے دنیا قایم ہے اُس وقت سے اُجین آباد ہے۔ یا یوں کہئے کہ دنیا کا سب سے پہلا شہر یہی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس خیال سے جس میں واقعیت سے زیادہ حُسن عقیدت کا رنگ پایا جاتا ہے اتفاق کیا جائے لیکن اس سے کم از کم اس کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی کے کثیر حصّہ کا اس قدیم ومقدس شہر کی مدت قیام کے متعلق کیا رجحان ہے جس سے لازمی طور سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اگر اُجین کی عمر اس قدر نہیں جتنی کہ بتائی جاتی ہے تاہم ہندوستان میں اُس کی آبادی بہت پُرانی ہے۔

اُجین جس زمانہ میں واقعی اُجین تھا اُس وقت اس کی شہرت اور عظمت جو رہی ہوگی اُس کا معمولی سا اندازہ اُن تحریروں سے ہوسکتا ہے جو اسلامی ویورپین مبصّرین کی سیاحت ہند کی دلفریب داستان کی صورت میں آج بھی علمی دنیا میں کافی طور پر قدر وقیمت کی چیز سمجھی جاتی ہیں۔ اسلامی سیّاحوں میں البیرونی اور ابن بطوطہ نے مجمل طور سے اس شہر کی عظمت واقتدار کا ذکر کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ زمانہ بھی اُجین کے عروج کا اصلی زمانہ نہ تھا۔ لیکن اس میں شک نہیں

کہ اُس وقت بھی یہ شہر آبادی ۔ تجارت اور اکثر تمدنی و معاشرتی فضائل کے لحاظ سے قابل ذکر چیز تھا ۔

اُجینؔ کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شروع سے آخر تک انقلابات کا گہوارہ بنا رہا ہے حضرت عیسےٰ (علیہ السلام) سے تین صدی قبل تک اس کے متعلق کوئی قابل اعتبار روایت نہیں ملتی ۔ البتہ اُس کے بعد جبکہ ہندوستان میں موریوں کا دور دورہ تھا اور اُجینؔ بھی اُن کی وسیع و زرخیز سلطنت کے ایک حصّہ کے طور پر اُن کی حکومت میں شامل تھا اُس وقت سے بعض مستند باتیں ہم پہونچتی ہیں ۔ موریوں کے زمانہ میں اُن کا یہاں ایک نائب السلطنت رہا کرتا تھا جس کے تحت میں تمام صوبہ مالوہ سمجھا جاتا تھا ۔ اشوک اعظم جس کے مذہبی کارنامے اور جس کی انسانی ہمدردی کی دلچسپ داستانیں اس وقت بھی باخبر اصحاب کے لیے موجب دلبستگی ہوسکتی ہیں اپنے نامور باپ چندرگپت کے عہد میں یہاں کا والسرائے تھا اور اس خدمت پر وہ اُس وقت تک مامور رہا جب تک کہ چندرگپت کے انتقال کی خبر سنکر تختِ سلطنت پر متمکن ہونے کے لیے اُسے ہندوستان جانا نہ پڑا ۔

بکرماجیت کے عہد میں اُجینؔ کی شہرت و عروج کو گویا چار چاند لگ گئے بادشاہ وقت کی علمدوستی اور معارف پروری نے تمام ہندوستان کے کاملین فن کو اُجینؔ میں جمع کر دیا تھا ۔ یہی زمانہ تھا جب کالیداس جیسے دیوانِ ڈراما کا اولین معمار کہنا واقعیت کا ظاہر کرنا ہے ۔ اپنے دلپذیر نغموں سے ایک عالم کو محو حیرت بنائے ہوئے تھا ۔ پولیٹکل حیثیت سے اُجین کا جو قصہ رہا ہو اُس سے قطع نظر علمی حیثیت سے

وہ اُس زمانے میں ہندوؤں کا مستقر طبیہ یا نف ادھا۔علم پروری کا ایک دریا تھا جو بہر ہا تھا اور تشنہ کاموں کو سیراب کر رہا تھا۔اِن اُمور کی تفصیل طوالت سے خالی نہیں لیکن مستفسر تاریخ وسیر کی مستند کتابوں کی ورق گردانی سے اپنا اطمینان کر سکتا ہے۔

صوبۂ مالوہ کا صدر مقام اور علم وفن کا مسلم الثبوت مرکز ہونے کے علاوہ یہاں کی سرزمین اہل ہنود کے خیال کے مطابق مذہبی تقدس کے اعتبار سے بھی قابل تعظیم ہے۔سپرا ندی بھی جس کے کنارے یہ شہر آباد ہے مقدس سمجھی جاتی ہے۔الہ آباد اور ہردوار وغیرہ کی طرح یہاں بھی دو چار مذہبی میلے نہایت بڑے پیمانے پر منعقد ہوتے ہیں۔شیوراتری کے موقع پر ہندو زائرین کا کثیر مجمع ہوتا ہے۔ماگھ بیسا کھ اور کاتک کے مہینوں میں ہر سال بڑے میلے ہوتے ہیں۔جن میں ہندوستان کے اطراف وجوانب سے راسخ الاعتقاد ہندو مذہبی فریضہ ادا کرنے کے لیے جوق درجوق جمع ہوتے ہیں۔ہر بارہ سال پر سنہاسٹ کا میلہ ہوتا ہے جسکی نوعیت الہ آباد کے کُنبھ کے میلے سے ملتی جلتی ہے جس میں لاکھوں آدمیوں کا مجمع ہوتا ہے۔اُس وقت اجین کی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے اور اشنان کے موقع پر ندی کے کنارے نہایت پُرلطف سماں رہتا ہے +

ہندو معبد گاہوں میں مہاکال کا مندر سب سے زیادہ مشہور جو کوٹ محلّہ میں واقع ہے۔اس کی عمارت زمین کے نیچے بنائی گئی ہے۔پہلے یہاں ایک داخلہ کا پھاٹک تھا وہ اب نہیں رہا۔زمین کے نیچے اور عمارت کے اندر اُترنے کے لیے چند زینے طے کرنے پڑتے ہیں اُس کے بعد

سطح فرش کا کچھ حصّہ طے کر کے پھر زینے ملتے ہیں اور اسی طریقے سے دو تین بار سیڑھیوں پر اترنا پڑتا ہے۔ پھر ایک دروازہ نظر آتا ہے۔ جس میں داخل ہو کر چند نشیبی زینے اور طے کرنے پڑتے ہیں اور اس کے بعد مہادیو کی مورت سامنے نظر آتی ہے۔ مندر کی موجودہ عمارت رامچندر نامی دیوان پیشوا نے ۱۷۴۵ء میں بنوائی تھی۔ قدیم عمارت کی بربادی کا الزام دستور کے مطابق مسلمان بادشاہوں کے سر تھوپا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ۱۲۳۵ء میں التمش جب بھیلسہ فتح کر کے اجین پر قابض ہوا اس وقت اس نے اس مندر کو مسمار کرا دیا اور لنگم دہلی لے کر چلا گیا۔ اس قدر زمانہ گذرنے کے بعد غالباً اس قسم کے الزامات پر ردّ و قدح کرنا کوئی مفید نتیجہ مترتب نہ کر سکے گا خصوصاً اس صورت میں کہ ملک کے ایک خاص طبقے میں اسلامی حکمرانوں کا یہی شعار سمجھ لیا گیا ہو۔

جس جگہ یہ مندر واقع ہے یہاں کسی زمانہ میں نہایت مہیب ناک جنگل تھا اور اسے اب تک مہاکال بن کہتے ہیں۔ اس جنگل کی مذہبی حدود بہت دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور بیچ کی طرح ان حدود کے اندر تمام حصّے مذہبی حیثیت سے یکساں بزرگی رکھتے ہیں مہاکال بن کا اب زیادہ حصّہ کاشت میں آ گیا ہے اور معمولی طور سے جنگل بھی باقی ہے۔

اجین سے شمال رویہ تقریباً ایک میل کی مسافت پر بھیروں گڈھ کا قلعہ ہے۔ یہاں ندی کے خوشنما گھاٹ بنے ہوئے ہیں۔ بھیروں کے مندر میں جاتریوں کا مجمع رہا کرتا ہے۔ یہاں بھی بیساکھ اساڑھ اور کاتک میں مذہبی میلے ہوا کرتے ہیں۔ اس جگہ ندی کا سرسبز و شاداب کنارہ گھن دار درخت سایہ دار کنج اور دیگر قدرتی مناظر خاص دلچسپی کا سامان رکھتے ہیں۔

بھیروں گڈھ کے بالمقابل ندی کے اس کنارے اجین قدیم کے کھنڈرات ہیں۔ یہاں کالکا کا مندر قابل ذکر ہے۔ کالیداس شاعر کے بارہ میں مشہور ہے کہ جب ان کی بیوی نے انہیں کاہلانہ زندگی بسر کرنے پر سخت لعنت وملامت کی تو وہ اسی مندر میں آکر مصروف ریاضت ہوئے اور بالآخر ان کی عبادت کا صلہ دیوی کی طرف سے گویا یہ ملا کہ وہ فصیح البیان شاعر کی حیثیت سے دنیاوی اعزاز و مرتبت کے مالک بن بیٹھے۔

یہ کھنڈرات اجین کی پرانی آبادی کے نشانات ہیں۔ اس کی تباہی و بربادی کے باب میں قیاس یہ کہتا ہے کہ شاید زلزلے سے یہ سب مسمار ہوگئے۔ یا اغلب ہے کہ سپرا ندی میں کبھی ایسی طغیانی آئی ہو جس کے سیلاب میں یہ تمام آبادی دریا برد ہوگئی ہو۔ بہرکیف اب یہ حصہ بالکل ویران ہے۔ موجودہ شہر اجین یہاں سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر بجانب جنوب ہے۔ کہتے ہیں کہ اس ویرانے میں اب بھی اکثر بیش بہا جواہرات اور قدیم سکے یا سونے چاندی کی اشیا معمولی تلاش سے مل جاتی ہیں خصوصاً جب پانی برس کر نکل جاتا ہے اور سطح زمین گرد وغبار سے پاک ہوجاتی ہے تو اس قسم کی چیزیں بکثرت ہاتھ آجاتی ہیں جو آثار قدیمہ ہونے کے اعتبار سے مستقل قدر و قیمت کی مستحق سمجھی جاسکتی ہیں میرے ایک ہندو عنایت فرما مجھ سے کہتے تھے کہ اگر کوئی شخص خدا پر بھروسہ کرکے یہاں بیٹھ جائے تو وہ کبھی بھوکا نہیں رہ سکتا۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ باقاعدہ تلاش کی جائے تو اس جگہ سے بکثرت نایاب و نادر چیزیں مل سکتی ہیں +

مالوہ کا خطہ سیکڑوں سال تک اسلامی حکمرانوں کے زیرنگیں رہ چکا ہے

اور یہاں کی مختلف حصص میں اسلامی تمدن کے آثار ابتک بکثرت موجود ہیں
اُجین بھی ان سے خالی نہیں۔ لیکن اُن کی تعداد چنداں زیادہ نہیں اور
اسکی وجہہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہندو راجاؤں کی طرح اُجین مسلمان
فرمانرواؤں کا پایۂ تخت نہیں تہا۔ جب تک مالوہ میں مسلمانوں کی جداگانہ
خود مختار سلطنت نہ قایم تھی اُس وقت اُجین محض صوبہ کا مستقر تھا۔ اور
جب سلاطین مالوہ کا زمانہ آیا تو اُنہوں نے دار الخلافہ ہونے کی عزت
دہار اور پہر شادی آباد مانڈو کو بخشی جہاں کے شاہی مکانات۔ اور
مقابر وغیرہ آج بھی اسلامی تمدن وتہذیب کی زندہ شہادت دینے کو موجود ہیں
مُسلمان بادشاہوں میں سب سے پہلے قطب الدین کے قدم اُجین میں
آسے۔ اُس کے بعد سلطان شمس الدین التمش نے اسے اپنے
قبضے میں کیا۔ ۱۲۳۱ء سے ۱۵۳۱ء تک یہ سلاطین مالوہ کے تحت نگین تہا۔
بہادر شاہ گجرات نے جب مالوہ پر دست تصرف پہیلایا تو اُجین بھی اس کے
قبضے میں آیا۔ اس درمیان میں بہادر شاہ اور ہمایوں کی معرکہ آرائیاں
شروع ہوگئی تہیں۔ اس بدامنی سے فائدہ اُٹھاکر ملّو خاں نے جو گجرات
کے اُمراء میں سے تہا اُجین کے لیے ریشہ دوانیاں شروع کیں اور
بالآخر اپنے ارادے میں وہ کامیاب ہُوا۔ اُس نے صرف شہر پر قبضہ
پا جانے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ کچہہ عرصہ تک مالوہ کا خود مختار حکمراں بن کر
قادر شاہ کے نام سے کوس لمن الملک بجاتا رہا۔
۱۵۴۲ء میں شیر شاہ سوری اس شہر کا مالک بنا اور ۱۵۶۲ء میں اکبر
نے باز بہادر کو جو سُوری حکومت کے مقرر کردہ گورنر شجاعت خاں کا
لڑکا تھا شکست دیکر اُجین کی تسخیر کی۔ اکبر کے عہد میں اُجین صوبۂ مالوہ

اور سرکار اُجین کا صدر مقام تھا۔ اور یہاں ایک صوبہ دار رہا کرتا تھا۔
اُجین سے تقریباً دو کوس کے فاصلہ پر ایک مختصر گانوں ہے
جس کا نام کالیا دیہہ ہے اُس کو چند مکانات کا مجموعہ سمجھنا چاہیئے۔
یہاں سپرا ندی پر سلاطین مالوہ ایک پُرفضا محل بنا ہوا ہے۔ اس کو
آبی محل کہتے ہیں۔ اکثر اسے غوری شاہ کا محل بھی کہتے ہیں۔ اس کی
بنا سلطان ناصر الدین بن غیاث الدین خلجی (۹۰۶ھ) کی جدت پسند
طبیعت کی شرمندۂ احسان ہے۔ کہتے ہیں کہ سلطان موصوف کے
مزاج میں پارہ کا کشتہ استعمال کرنے سے نہایت درجہ حرارت پیدا ہوگئی
تھی اس لیے اُس نے یہ محل تعمیر کرایا تھا۔ کہ اس سرد و خنک عمارت کے
قیام سے اُس کی طبیعت اعتدال پر رہے گی۔ یہ عمارت ایک چھوٹے
سے ٹاپو کی صورت میں سپرا ندی پر واقع ہے۔ عمارت کے اندر
کئی حوض ہیں جن میں نہایت سرد پانی ہر وقت موجود رہتا ہے۔ ان
حوضوں میں پانی ندی سے آتا ہے۔ لیکن یہ بات کسقدر حیرت ناک
ہے کہ خواہ ندی کا پانی گرم ہو یا سرد لیکن ان حوضوں میں پانی کبھی گرم نہیں
رہتا۔ حالانکہ ندی اور حوض ایک ہی سلسلہ میں مربوط ہیں۔

سلطان ناصر الدین کے انتقال کے متعلق ایک روایت عام ہے
کہ وہ ایک دفعہ اسی محل کے ایک حوض میں گر گیا ایک خادم نے فوراً
کود کر بچا لیا اور باہر لایا۔ سلطان نے ہوش آنے کے بعد دریافت کیا
کہ مجھے کس نے حوض سے نکالا تھا۔ نام معلوم ہونے پر اُس شخص کے
ہاتھ قطع کرا دیئے۔ اور اُس کی وجہ یہ بیان کی کہ گویا اُن ہاتھوں سے
شاہی جسم کو مس کرنا داخل بے ادبی تھا۔ کچھ دنوں بعد ایسا ہی اتفاق ہوا

کہ وہ حوض میں گر پڑا لیکن پچھلی بات خدام کو ابھی یاد تھی کسی کو نکالنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ پانی میں ڈوب کر رہ گیا ۔

اسی موضع میں ایک مسلمان بزرگ کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ آپ کا اسم گرامی مولانا فخر الدین چشتی رح ہے۔ آپ کے روضہ کو عام طور پر لوگ خواجہ صاحب کا مقبرہ کہتے ہیں یہاں ایک میلہ بھی ہوا کرتا ہے۔ آپ کے علاوہ اُجین خاص میں مولانا مغیث الدین صاحب قدس سرہ العزیز کا دربار روحانی تسکین حاصل کرنے والوں کے لیے بہترین بارگاہ ہے۔ اُجین اور اطراف میں آپ کے عقیدتمند کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

اُجین اسلامی نکتہ خیال سے یوں اور بھی دلچسپی کی جگہ ہے کہ یہاں سنہ ۱۶۵۸ء میں وہ جنگ واقع ہوئی تھی جس کی کامیابی گویا اورنگ زیب عالمگیر کے نام ہند کی حکومت کا قرعہ ڈال گئی۔ اصل میدان جنگ کا یہاں سے ۶ کوس کا بُعد ہے لیکن تاریخوں میں یہ لڑائی جنگ اُجین کے نام سے موسوم ہے فتح آباد ضلع اُجین میں ایک جاگیری موضع ہے۔ اورنگ زیب اور مُراد کی متفقہ افواج نے اسی جگہ جسونت سنگھ والی جودھپور کو جو دارا کی طرف سے میدان جنگ میں آیا تھا شکست فاش دیکر دارا کے استحقاق حکمرانی پر ہمیشہ کے لیے مُہر لگا دی تھی۔

راجہ رتن سنگھ والی رتلام جو دارا شکوہ کے معاونین میں تھا اسی لڑائی میں کام آیا اُس کی یادگار میں یہاں ایک چبوترہ بنا ہوا ہے اور اب تک رتلام کے شاہی خاندان میں دستور ہے کہ شادی کے وقت کنگن کی رسم یہاں آکر ادا کرتے ہیں اور شاید اسی واقعہ سے راٹھوروں کو اس گاؤں کی حدود میں پانی پینے کی قسم ہے۔

فتح آباد کا قدیمی نام دہرمات پور تھا لیکن اس فتح کے بعد اورنگ زیب نے اسکا نام بدل دیا یہاں شاہنشاہ موصوف کی تعمیر کردہ ایک مسجد ابتک موجود ہے۔ فتح آباد میں ریلوے جنکشن ہے اور رتلام۔ اجین اور اندور کو گاڑیاں یہاں سے ملتی ہیں۔

اجین کی طرف ایک چیز اور قابل ذکر ہے بالخصوص اس لیے کہ اس کا تعلق بالواسطہ مسلمانوں تک پہونچتا ہے۔ محمد شاہ کے عہد میں مہاراجہ سوائی جے سنگھ والی جے پور مالوہ کی گورنری پر فائز تھے۔ چنانچہ ان کے نام سے اس شہر کا ایک محلہ جے سنگھ پورہ ابتک موجود ہے۔ اسے آبادی کا حصہ غربی سمجھنا چاہیے۔ یہاں ایک قدیم رصدگاہ تھی جس کی تعمیر اور جس کی شہرت آج مہاراجہ جے سنگھ کا نام دنیا میں چمکائے ہوئے ہیں۔ بعض لوگ اس رصدگاہ کا بانی مہاراجہ بکرماجیت کو قرار دیتے ہیں لیکن شاید اول الذکر بیان زیادہ قابل اعتبار ہے۔ جے سنگھ ایک علم دوست آدمی تھا اور علمی شغف کیوجہ سے وہ ہر ایسی تجویز کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے بہ وقت تیار رہتا تھا جس سے کوئی ذہنی یا دماغی مفاد مترتب ہونے کا یقین کیا جا سکے۔ اس رصدگاہ کا صرف نام باقی ہے۔ البتہ گوالیار سٹیٹ گزیٹیر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض آلات رصد ابتک محفوظ موجود ہیں۔[1]　　سید محمد فاروق۔ (دتیا پیوسی)

---

[1] سوائی جے سنگھ جس نے اپنی تمام عمر علوم کے تحصیل میں صرف کی جس نے جنتری کی اصلاح کی اور چند نقشے مرتب کرکے اس زمانے کے حکمراں شہنشاہ کے نام سے اس کو موسوم کرکے زیچ محمد شاہی نام کیا اس کے زمانہ سے قبل اجین میں ایک دوبین مینار موجود تھا۔ اس نے اس خیال کو کہ مروجہ نقشوں کے لحاظ سے ستاروں کے مقامات کا اندازہ مشاہدہ کے خلاف واقع ہوتا ہے۔ دہلی۔ متھرا۔ اجین بنارس اور جیپور میں پانچ دوربین مینار تعمیر کرائے۔ ان میں کچھ خود اسی کے ایجاد کردہ آلات تھے جن کے ذریعہ سے خط نصف النہار کا فاصلہ یا اجرام فلکی کا عروج وزوال معلوم کیا جاتا تھا۔ (سویلیزیشن ان انشنٹ انڈیا)

قصیدہ

در نعت سرور کائنات علیہ و علی آلہ و صحبہ الف الف صلوٰۃ و سلام و تحیات

ہوا ہی جوش عین شرم میں یہ کس کی الفت کا
نکل کر آنکھ سے گوہر بنا آنسو ندامت کا

عرق شرم گنہ سے رخ پہ ہی یا پھول پر شبنم
قمر ہی شرق میں ہی کہ دل میں داغ حسرت کا

دل پر داغ یا گلدستہ گلہائے جنت ہے
ہرا چاک گریباں ہی کہ دروازہ ہی جنت کا

جلا سینے میں دل حسن مگر گل جنت کی بو آتی
دھواں اٹھا جو دل سے سر پہ چھایا ابر رحمت کا

سیہ کاری ہی میری مغفرت کا رنگ ظاہر ہے
بنا ہے نامۂ اعمال گیسو حور جنت کا

زیادہ بیم سے امید رکھنی مجھکو لازم ہے
عیاں اعداد سے ہی حال قلت اور کثرت کا

مطلع

خیال آیا ہی شاید احمد مرسل کی قامت کا
قلم کے قاف میں انداز ہی قامت قیامت کا

بجا ہی فخر کرنا مجھکو محوی اس کی الفت پر
بھرے دم خالق کون و مکاں بھی جسکی الفت کا

یہ جوش عشق تھا دنیا میں جب بھیجا محمد کو
خدا نے بہر تسکین رکھ لیا خود سایہ قامت کا

جدا کیا حق سے ہو آپ سے ہو کیا جدا امت
الف ہی ایک ہی اللہ کا احمد کا امت کا

قد موزوں کمالات دو عالم کا تھا مجموعہ
دکھایا قامت قلت میں تماشا کاف کثرت کا

بجا ہی حشر کے دن ہو گئے ہنگامہ جو سبھی
قیامت میں ہیں آغاز و انجام اونکی قامت کا

دو حرف ہر دو عالم کی طرح ہے کیونکر نہ آسائش
کہ پیدا ہی وجود پاک ہی خط ان پہ خلعت کا

گل رنگ پر ہی بلبل نخلبند گلشن قدرت
گر گن آل دانۂ خرمن ہی جسکی کشت قدرت کا

مطلع

نشانِ ربِّ عالم ہے وجودِ پاک حضرت کا — نگینہ جیسے ہوتا ہے سببِ خاتم کی زینت کا
رقم ہو وصف کیا اُس آستاں کی عزّ و رفعت کا — کہ پائیں باغ جس کے سامنے ہے باغِ جنّت کا
بنایا ذو جہت اے فخرِ کونین اس طرح تجھکو — مشدّد ہاؤ تا میں جس طرح ہو میم ہمّت کا
لبیں کیونکر نہ تیرے قدِّ بالا کو قیامت ہم — کہ انجام اسپہ دُنیا کا ہے اور ابتدا رسالت کا
دکھایا زورِ صنّاعی تری خلقت سے صانع نے — بھرا ہے ایک گل میں رنگ سارے باغِ صنعت کا
کچھ ایسا بن پڑا نقشہ ترا نقاشِ قدرت سے — کہ عالم خامۂ قدرت میں ہے انگشتِ حیرت کا
صدف آسا ہے عالم اور ہمیں گوہر ذات تیری ہے — تجھے اللہ نے حاصل بنایا بحرِ قدرت کا
جگر خامے کا شق ہے آج تک صاف اس سے ثابت ہے — بڑی محنت سے نقشہ راست آیا تیری قامت کا
نہ طالع دیا وہ حضرتِ یوسف کو خالق نے — ازل میں جو بجا تھا رنگ تیرے حسنِ طلعت کا
نہ دیں تشبیہ نقش پانے والے تو بے شبہ — ترے اک ماہ ہالہ ہو بہ نور دریائے آفت کا
عیاں شانِ تر دل کی حق ہے نطقِ والا سے — کہ حق ہے یاد اور تجھکو منصب ہے وزارت کا
شجر ہے ذات تیری ایک گل جسکا بلاغت ہے — فصاحت صیغۂ مشتق ہے مصدر فصاحت کا
دلِ مسلم کو کیا اندیشۂ قعرِ جہنّم ہو — کہ اعلیٰ جزو نامِ پاک کا ہے قلبِ اُمّت کا
بشکلِ موسیٰ سر چار دل طرف سے دُور کی ظلمت — نکالا مانگ کے مانند کیا رستہ ہدایت کا
ندامت قامتِ بالا سے یہ ہوگی کہ غالب ہے — سماں کہ آئینہ حیرت سے ہوگا دن قیامت کا
نشاں جیسے شفاعت کا الف پر مد ہوتا ہے — نظر تیری عنایت کی سبب ہے عزّ و رفعت کا
اگر تولیں خدا کی رحمت اور تیری شفاعت کو — نہ اٹھے ایک پلّہ بھی ترازوئے قیامت کا
جدا جس نقطے سے ہو حرفِ اصلی ہو وہ بے معنی — تری الفت ہے گویا رکن خالق کی عبادت کا
بشر وہ کیا ہے جو خالی ہو تیرے سوزِ الفت سے — دیا خالق نے جوہر جسمِ ضیغم کو حرارت کا
خدا کے قہر سے کیونکر بچے جو تجھ سے پھر جائے — رہے کب ہو کے محفوظ وہ گھر جو ہو بے چھت کا
نشانِ نعلِ توسن ہے مہِ نو غور سے دیکھو — تری معراج کا منکر جو طالب ہو شہادت کا

تری دسگی گدائی نے کیا ہے بسکہ مستغنی
لقب دیتی ہے مجھکو خود پسندی بدو مالت کا

وہ پہونچا منزل مقصد پہ آخر میں ہمایوں کی
بڑھا سنگ فلاخن سے بھی چکر میری قسمت کا

نہیں دولت کا میں خواہاں کہ انجام اسکا ذلت ہے
رقم ہوتا ہی بعد دال دولت ذال ذلت کا

مری قربت تلاش لذت دنیا کی مانع ہے
کہ ہے انداز تحریر ایک حاجب اور حاجت کا

رہوں محفوظ لہو و عیب و نخوت سے تکبر سے
گماں ہوتا ہے لام و عین و نون و تا سے لعنت کا

کری دنیا میں تیرا سوز الفت نامور مجھکو
پڑے جو آبلے سینے میں نقارہ ہو شہرت کا

امید و بیم سے ہونگے مشکل حرف مدغم میں
کشاکش و نون جاذب کی ثمر ہے نخل کثرت کا

خدا کاش الف سیدھے سے تو مجھکو بے نشاں کردے
کہ عالم مجھ میں ہو جائے دہان پاک حضرت کا

عطا کر خاک صحرائے مدینہ کی ہوا اس کو
مرا جسم برہنہ مجھسے ہے مشتاق خلعت کا

یہ صحرائے مدینہ کا بگولا دیکھکر سمجھوں
کہ برج شرف میں آج کوکب میری قسمت کا

پڑھونگا حشر کے دن جب میں صدقہ یا رسول اللہ
قیامت میں بپا کردونگا ہنگامہ قیامت کا

سنے نعت محمد کا صلہ یہ حکم خالق سے
کرے جاگیر میں محوی کو رضواں باغ جنت کا

خاکسار داریں محمد حسین محوی لکھنوی

ہم نہایت خوشی سے اعلان کرتے ہیں کہ ہماری محترم بہن مسز محمد الدین صاحبہ خلیقی دہلوی تمدن قسم دوم کے دو پرچے اپنی ان بی بی یا اگروالی بہاییوں کے نام جاری کرتی ہیں جن کی مالی حالت رسالہ کی خریداری برداشت نہیں کرسکتی۔ ہم اس عطیہ پر اپنی عزیز بہن کے اور بھی زیادہ مشکور ہیں کہ تمدن کی خدمات کو ہماری بہنوں نے بھی وقعت سے دیکھا۔ اور اسکی ضرورت کو اس لیے کہ اس کا مقصد اعلیٰ حقوق نسواں کی حمایت ہے محسوس کیا

خطابات شاہی

لکھنو کی جان سلطان عالم محمد واجد علیشاہ کچھ عجب زندہ دل تھے باوجود اس سلطنت و جاہ و حشمت و شباب کے اس بادشاہ میں غرور اور نخوت جس سے ہزاروں میں بھی کوئی امیر خالی نہیں ہوتا نام کو نہ تھا ؎

گر بدولت برسی مست نگردی مردی

جیسی یہ بری صفتیں تھیں ویسی ہی نخوت اور عشرت پسندی کا سبب بھی تھا مگر وہ اپنی ذات کے واسطے تھا بے عیب ذات تو خدا کی ہے۔ بخار عیش و عشرت کا یہ ہوا کہ سوائے محلات متعیانہ کے کئی بیگمیں و بیبیاں زیر متعہ و نکاح میں در آئیں ان کے سوا اور عورتیں بھی جو بوجہ ایجاد پسندی و اختراعات شاہی کے ملقب تھیں اور پریوں کے نام زد ہوئیں۔ ایک عالیشان عمارت بنائی موسوم بہ قیصر باغ کہ جس میں بیگمات بڑے بڑے سامان اور ٹھاٹھ سے بعیش و عشرت رہتی تھیں ہر ایک بیگم کا انوکھا اور نرالا خطاب لقب ہوش ربا نام دلربا تھا۔

اس سرکار میں جو ڈومنیاں عورتیں تھیں انکو سرو محفل اور جو ان کے مرد تھے ان کو بہار محفل کہتے تھے۔ ایک میلا ہوتا تھا جس کے سامان تکلفات آرایش اور چوچلے کسی طرح بیان میں نہیں آسکتے جس طرح کا بازار تھا دوکاندار اوسی رنگ کے تھے مختصر یہ کہ غریب رنگریز امیر بن گئے۔ بنا اس میلے کی یہ تھی کہ واجد علی شاہ کی چھٹی کی آرزو پر ان کی ماں نے لڑکپن میں جوگیا لباس پہنایا تھا اس کی سالگرہ اس لباس سے ہوتی تھی بادشاہ نے عہد سلطنت میں میلہ قرار دیدیا۔ اتفاقات زمانے سے جب کلکتہ موچی کھولہ ملقب بہ مٹیا برج میں قیام ہوا پہر سے تو اپنی

دلبستگی کے لیے یہاں بھی کچھ عجیب سامان دلکش مہیا کیے گو اکثر ناشناس ان سب باتوں کو باعث خلل دماغ جانتے ہیں مگر واقعی امر یہ ہے کہ ایسا دل و دماغ کا بادشاہ کم گذرا اگر مبالغہ نہ ہو تو یہ کہنا قابل اعتبار ہے کہ گزرا ہے نہ گذرے گا۔ اور یوں تو فضلنا بعضہم علی بعض۔ مٹیا برج گو قید خانہ تھا مگر یہاں بھی وہی دن عید شب شب برات جنگل میں منگل جس چیز کا شوق کیا کر کے اعلیٰ درجہ پر دکھلا دیا۔ کیوں نہ ہو ؎ جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

طرفہ رنگینی یہ کہ ہر شے کی خطاب کی رعایت ملحوظ خاطر رہی۔ بلحاظ طوالت صرف چند چیزوں پر اکتفا کیا جاتا ہے جو خالی از دلچسپی نہ ہونگی ؛

سنہ ۱۲۹۲ھ تک جانوران قفسی کو جو خطابات عنایت ہوئے قابل غور ہیں مثلاً

بلبل زیور گل - آشنائے چمن - عاشق گل - گلاب رنگ - شب گو - شب نوا - شب بیدار - شب دولت - خوشگو - شب صدا - خوش صدا - خواش نوا - شب صوت - زاہد نما - پارسا - تسبیح گو - شب گلو - شاہد چمن - آرام دل - پرصدا - راحت دل - راحت گوش - خوش داستان - بیخواب - چرخ آشیان - شب زندہ دار - مخزن الاصوات - فلک آشیان - ضوفشاں - سوز جگر - آرام قلب -

شاما - خدیو پسند - فغفور پسند - داؤد پسند - شیریں پسند - انجمن پسند - خاقان پسند

اگن - دلبر - تحفۂ دہر - خدنگ - ثنا خواں - شیریں - ستارا ؛

طوطی - زر ریز - شربت - لوز بادام - سرخ لب - لب شکریں - گلستاں - دُر ریز

مینا - کاملہ - مطربہ - مصاحبہ - محب نما -

پپیہا - مبتلا - عالی - آزاد - ترانہ خوان - عاشق -

کوئل - بادل - گیسو -

ہریل - فریفتہ - حلۂ جان - درویش - شیوہ - سبز پوش - غنچہ - لالہ رخ -

دہان پان سبز قبا۔

کبوتر۔ حور لقا۔ زلف لیلےٰ۔ قاصد صبا۔ تاج وفا۔ مہ لقا۔ مہر لقا۔

مینڈھا۔ دشمن شکن۔ مخالف شکن۔ عہد شکن۔

باغات۔ باغ دلکشا۔ ملکہ باغ۔ فلک باغ۔ سلطان۔ ہمایوں باغ۔

درخت۔ حنا راللہ بند۔ گل پوشاک۔ بصارت افزا۔ راحت افزا۔ مروارید شیریں۔ محبوب الاشجار۔ مجموعہ حسن چمن۔ قدآدم شجر امین۔ گیسو دراز۔ ہمیشہ بہار فرحت البصر۔ شگفتہ۔ ذائقہ نخبتین۔

تالابہا۔ چشمۂ سخا۔ چشمۂ عطا۔ چشمۂ شیریں۔ چشمۂ خضر۔ چشمۂ کوثر۔

مچھلی مع قوم۔ زین خطاب۔ خوش قطع۔ چہرہ مخاطب خوش وضع ستارن مخاطب پسند۔ رہو مخاطب شاہ پسند۔ بہاگن مخاطب شاہ پسند۔ بہاگن سفید چشم مخاطب شاہ پسند۔ بہا شیر مخاطب بادشاہ پسند۔

مرثیہ والیاں۔ نواب غم گسار بیگم صاحبہ۔ نواب غمخوار بیگم صاحبہ۔ نواب ماتمی بیگم صاحبہ۔ نواب ماتم دار بیگم صاحبہ۔ نواب مرثیہ خوان بیگم صاحبہ۔ نواب نوحہ خواں بیگم صاحبہ۔ نواب ذاکرہ بیگم صاحبہ۔

نقل والیاں۔ نواب الایچی بیگم صاحبہ۔ نواب دوگانہ بیگم صاحبہ۔ نواب چارکوڑی بیگم صاحبہ۔ نواب سہ گانہ بیگم صاحبہ۔ نواب پوبارہ بیگم صاحبہ۔ نواب تین تیرہ بیگم صاحبہ۔

میر امجد حسین ماہ ۔ (عظیم آبادی)

ناظرین تمدن براہ کرم خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں۔

تفریح

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک محنتی اور دوسرے کاہل۔ ایک اپنی زندگی کا حصہ جفاکشی اور استقلال کو سمجھتا ہے اور دوسرا سستی اور تلون پر مٹا ہوا ہے اول الذکر تندرست۔ قوی۔ اور دنیوی نعمتوں سے مالا مال ہے۔ دوسرا بیمار نحیف اور تنگ دست و پریشان حال۔ ایک کا اصول "ہم خرما و ہم ثواب" ہے اور دوسرا "پراگندہ روزی پراگندہ دل" کا مصداق۔

اس عیاں فرق کو دیکھتے ہوئے جو ان گروہوں میں ہے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تفریح محنتی اور جفاکش کا حق ہے نہ کہ سست اور کاہل کا تفریح کی لازمی شرط تکان ہے خواہ وہ جسم کی ہو خواہ دماغ کی۔ پس وہ شخص جو اپنی تمام قوت کو اپنی بہبودی یا نوع انسان کی ترقی میں خرچ کرتا ہے مستحق ہے کہ کچھ گھنٹے تفریح طبع میں صرف کرے۔ تفریح اس کو شگفتگی دل کو حیات بخشے گی اور روح کو تازہ اور بشاش بنا دے گی جو دوسری حالت میں مردہ ہو جاتی ہے۔

دنیا تسلیم کرتی ہے کہ ہم ہندوستانی غایت درجے کے محنتی اور جفاکش ہیں اگر ضرورت مجبور کرے جیسا کہ ٹرانسوال کے معاملہ نے ثابت کر دیا ہے لیکن ہماری محنت اور جفاکشی تھوڑے عرصہ میں ہمارے جسمانی اعضا کو ناتوان اور قوائے ذہنی کو کمزور کر دیتی ہے۔ برعکس اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ اہل یورپ کی جسمانی اور دماغی قوتیں تا حیات عمدگی اور چستی سے کام کرتی رہتی ہیں۔ کبر سنی ہمارے دماغ کو عقل سے خالی اور جسم کو درد اور

اعصاب شکنی کا شکار بنا دیتی ہے برخلاف اس کے اہل یورپ میں زیادتی عمر اُنکی کوششوں میں خاصہ اضافہ کرتی ہے اور دوسروں کی رہبری کا باعث ہوتی ہے ہندوستان کی کہاوت کہ "ساٹھا پاٹھا" ہوتا ہے اور یورپ کا مقولہ کہ "بھورے بال قابل تعظیم ہیں" ایک دوسرے کی حالت کا عمدہ فوٹو ہیں۔ اس نقص اور تنزل کا سبب صرف یہی ہے کہ ہماری تفریح طبع کے مشاغل صحیح اصول پر مبنی نہیں ہیں اور وہ ہماری قوتوں کے سچے معاون ثابت ہونے کے بجائے دشمن جانی نکلتے ہیں۔ ان مشاغل پر خامہ فرسائی کرنا تضیع اوقات سمجھکر چند مفید اور مجرب اصول پیش کرتا ہوں کہ جو ان پر عمل پیرا ہو اور گم شدہ وقار کو دوبارہ حاصل کرے

اوّل - اچھی طرح اطمینان کرلو کہ جو مشاغل تفریح تم اختیار کرنا چاہتے ہو تمہاری قوت ضمیر کے خلاف تو نہیں ہیں کیونکہ اس قسم کا گناہ شگفتگی طبع اور اطمینان قلب کو برباد کر دیتا ہے اور تفریح کا اصلی مطلب فوت ہو جاتا ہے بعض شخص حرب فیل اور جنگ مرغ کو پسند کرتے ہیں اور بعض گناہ خیال کرتے ہیں پس اس قسم کے مشاغل میں قوت ضمیر کے ارشاد پر عمل کرو۔

دوم - صبح کا وقت تفریح میں ضائع نہ کرو۔ رات بھر کا آرام کافی تفریح ہے اور وہ شخص جو تھکا نہ ہو تفریح کر سکتی نہیں ہے اس لیے صبح کا وقت تفریح میں خرچ کرنا وقت کو بیکار اور ضائع کرنا ہے۔ یاد رکھو کہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا ایسا نہو کہ تم کو اس کا عمر بھر افسوس کرنا پڑے۔

سوم - مشاغل تفریح کو تکلفات سے آزاد رکھو۔ اور عمر کی مناسبت کو فراموش نہ کرو۔ تکلفات کی زیادہ پابندی تکلیف کا باعث ہوتی ہے اس لیے اُن گھنٹوں کو جو جسم و دماغ کے تر و تازہ کرنے میں صرف

کرنا چاہتے ہو سو ہاں روح نہ بناؤ- اگر تم بچوں کا کھیل کھیلنا چاہتے ہو تو بچوں کا ڈھنگ اختیار کرو اور اگر جوانوں کا تو اوائل عمری کے حرکات سے پرہیز کرو- ایسا نہ ہو کہ ایشائے شکسپیر یعنے سعدی کا شعر-

"چہل سال عمر عزیزت گذشت مزاج تو از حال طفلی نگشت"

تپر صادق آجائے +

چہارم- اُس حصہ کو جو زیادہ تھکا ہوا ہے ضرور تر و تازہ بناؤ- اگر تمھاری زندگی بحالت گزیتی کی سی ہے تو جسم کی ورزش کرو اور اگر حرکت دینے والی اور چستی کی ہے تو دماغ کو شگفتہ بناؤ لیکن خیال رکھو کہ آخر الذکر حالت میں دماغ کو بجائے آرام دینے کے المضاعف کام اُس کے سپرد نہ کرو- اور شطرنج یا دوسرے دماغی کھیلوں کو بطور تفریح کے نہ کھیلو زیادتی ہر ایک شے کی مضر ہوتی ہے اس لیے زیادہ ورزش یا زیادہ جوشیلے کھیلوں سے بچنا بہتر ہے-

پنجم- تفریح کی بھلائی یا بُرائی کا تعلق طبیعت سے ہے اپنی حسب دلخواہ مشاغل پسند کرو- کانٹے کے ذریعہ سے مچھلی پکڑنا جس میں گھنٹوں خاموش کھڑا رہنا پڑتا ہے بعض مصیبت خیال کرتے ہیں اور بعض بحد مسرت کا ذریعہ جانتے ہیں- دوڑنا کودنا- میدانوں کے نشیب و فراز میں سیر کرنا- پہاڑوں پر چڑھنا عام طور پر پسند کئے جاتے ہیں لیکن وہ کھیل جو علاوہ فرحت بخشنے کے کوئی اور عمدہ کام کے موجب ہوں زیادہ اچھے ہیں- مثلاً گیند کا پھینکنا ہاتھ اور آنکھ دونوں کو علم ریاضی کی تعلیم دیتا ہے- پیرنا صدہا جانوں کا- جو پیراک کی عدم موجودگی میں غرق ہو جاتیں حیات کا باعث ہوا ہے- پٹہ اور جھوٹ

علاوہ تفریح کے فن جنگ کے اصول بتلاتا ہے۔

ششم لیکن تفریح کے لیے افضل ترشغل شکار کھیلنا ہے۔ کسی امیر نے ایک غریب سے کہا کہ میں شکم کی تلاش میں جاتا ہوں جو میرے لحم سے سیر ہو۔ غریب نے جواب دیا کہ میں لحم کی فکر میں ہوں کہ میرے شکم کو سیر کرے۔ یہ خوبی شکار میں پائی جاتی ہے جو دونوں کی خواہش کو بہ وجوہ احسن پورا کردیتا ہے۔ اگر آدمی بھوکا ہو تو گوشت مہیا کرتا ہے اور اگر زیادہ سیر ہو تو ہاضمہ کو درست بنا دیتا ہے۔

بذاتہ یہ اصول نہایت سادے اور ممکن العمل ہیں نہ تو ان میں کوئی سائنس کی پیچیدگی ہے اور نہ فلسفہ کی باریکی جو فہم میں نہ آسکے۔ عاقل ہو اور دیکھو کہ کس طرح یہ اصول ہمارے قلب ماہیت کا باعث ہوتے ہیں۔ یہی اصول ہیں جنہوں نے آج یورپ و امریکہ کی کایا پلٹ دی اور ان کو عاقل۔ پُر دماغ اور ہوشیار بنا دیا۔ مہذب ممالک انکی قدر کرتے ہیں اور ان کے خلاف ورزی کو اخلاقی جرم سمجھتے ہیں۔ واقعی صحیح ہے

"قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری"

مشہدی (علیگ) از کہام گاؤں

رحمت زمانی } مولوی سید احمد صاحب کی بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک نہایت سود مند کتاب ہے۔ مصنف نے از سر نو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی گئی ہے۔ بیگماتی زبان قابلو معلّی کے محاورے۔ قصّہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کیے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ قیمت ایک روپیہ (عہ) منیجر عصمت۔ و تمدن دہلی سے طلب کیجئے

مرغ اسیر

ایکدن وہ تہا کہ میں آزاد تہا مثل صبا
تحفہائے نخل و شبنم میرا آب و دانہ تہا

مانع سیر گلستاں تہی نہ مجھکو کوئی شے
بےخطر تہا حسب خواہش ہر شجر پہ بیٹھتا

نغمہائے تازہ بجتے میرے ہمیشہ دلپذیر
میری صورت دلربا تہی میرے بازو خوشنما

حسن ہو - دولت ہو عشرت ہو غرض کوئی اپنا
سب دہرے رہجاتے ہیں جسوقت آتی ہی قضا

اپنے ہوجاتے ہیں بیگانے غم اغیار کیا
دن برے دشمن کو بھی ہرگز نہ دکہلائے خدا

لاکہ سر ٹپکو کہیں تدبیر سے چلتا ہی کام
لاکہ کچہہ کیجے کہیں مٹتا ہے قسمت کا لکہا

شکل و بازو و صدا جسپر کبہی تہا مجہکو ناز
ہوئے تقدیر سب ثابت ہوئے بیفائدہ

میں ہوا عہد جوانی میں ہی پابند قفس
تہا جہاں پانی میسر اور نہ دانے کا پتا

واں بحال زار میرا طائر روح عزیز
ایکدم میں ہوگیا کنج اسیری سے رہا -

کیا خبر تہی یوں ہونگا قیدی کنج قفس
کیا خبر تہی انقلاب آسمان ہوجائیگا

آپ کی قید شدید و تنگ کا ممنون ہوں
اے مرے چہوٹے شکاری مرحبا صد مرحبا

آپ کی ہر بدسلوکی کا ادا کرتا ہوں شکر
آپکے ہر جور پر سو بار ہوں دلسے فدا

کیونکہ حضرت آپ اگر اتنا روا رکہتے نہ ظلم
مثل سابق میں ابہی تک قیدی ہوتا آپکا

(ابوالنصر - آمادی)

مہر افروز بیگم ہی یہ وہ کتاب ہے، جو ڈہونڈہے نہیں ملتی تہی اور اب عصمت ایجنسی نے نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہی قصہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دیکہنے سے تعلق رکہتی ہو - قابل مصنف مولوی سید احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے - قیمت آٹہہ آنہ (۸/) - منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجئے

دُعائے نیم شبی

آنریبل - ایم - سی - (ممبر آف دی کانسل) کچھ عرصہ سے - اُس وقت سے جبکہ وہ کونسل کے ممبر منتخب ہوکر، آنریری مجسٹریٹ کے علاوہ آنریبل اور ایم - سی - بھی ہو گئے - بلاناغہ آدھی رات کے سناٹے میں اپنے درد دل کا اظہار کچھ ایسے موثر الفاظ میں کیا کرتے ہیں جو سننے اور غور کرنے کے قابل ہیں :-

"اے پارلیمنٹ اور کونسل کے خدائے صغیر! اے وہ خدا جسکو سوائے دنیاوی ترقی کے پروردگارِ عالم سے کچھ مطلب نہیں! میں اپنے سچے دل کے ساتھ تجھ سے اور محض تجھ سے ملتجی ہوں کہ تو اپنی نگاہ لطف آمیز مجھ ناچیز پر - اپنے بندہ خاص پر - ڈال! اور رحم و مہربانی آمیز نظر کے ساتھ اُس عظیم الشان اور حیرت انگیز اتفاق کو ملاحظہ کر جس نے مجھے کونسل کے آنریبل ممبر بنجانے کا موقع دیا! اور اپنی شان عیب پوشی و بندہ نوازی کے صدقہ میں، اپنے دامانِ عنایت میں - اپنے حفاظت اور طرفداری کے وسیع دامن میں - چھپالے تاکہ میری جہالت، میری ازسرتاپا ناقابلیت، کسی عیب جو اور نکتہ چین نظر کو بھی نہ معلوم ہوسکے! قسم ہے تجھ کو اپنی قوت تکلم کی - اپنی طاقت لسانی کی مجھ بے زبان میں کم از کم اتنی تو لیاقت پیدا کر دے کہ میں اُس جرنلسٹ اور پریس رپورٹر کے پھندے سے نکل جاؤں جو میری اسپیچ اور تقریر کے لکھنے اور اصلاح کرنیکا معاوضہ - وقت آنے سے پہلے مجھے یاد کرانے اور رٹوانیکا مطالبہ - میری استطاعت سے بھی زیادہ مانگتا ہے !!

"اے مذہبی سسرتوں، سوشل گروہوں، اور پولیٹکل جماعتوں پر حکمرانی کرنے والے خدائے خاص! اپنے زرنگار چکا چوند پیدا کرنے والے جڑاؤ عرش کے صدقے میں، میرے دل و دماغ کو بذریعۂ اسپریچوئل ٹیلیگرافی یا روحانی تار برقی عام وتقبیت سے صرف اسقدر بھر دے کہ میں وقتاً فوقتاً اپنے حلقۂ رائے دہندگان کے روبرو پیش آنے والے معاملہ میں دخل درمعقولات کرسکوں اور ان بیوقوفوں کو۔ جو گورنمنٹ کی اطاعت کے محض ایسے ہی عادی ہیں جیسے ہولی کے موقعہ پر بڑا ٹری یارم کے۔ ہر مسئلہ پر اپنی جھوٹی سچی ٹانگ اڑا کے اپنا گرویدہ بنالوں! مجھے معلومات باطل اور حقوق فرضی کی ایسی عمیق تعلیم دے کہ میں اسکی بدولت اپنے گرد و پیش رہنے والے ناتراشیدہ دہقانیوں کو اپنی وسیع معلومات اور عصمت کا یقین دلاسکوں؛ اور مجھے تلقین کر کہ میں انکی سادہ لوحی کو اپنی "گندم نما جو فروشی" کی اعانت میں اپنے آرام کے لیے خاطرخواہ کام میں لاسکوں!!

"اے جاہل ہندوستان کے سوشیل مرتبہ کے خدا۔ ہر دلعزیز اور بامروت خدا! مجھے ایسے ضروری اور موزوں معلوم ہونیوالے غرور و تکبر سے ملتبس کر دے کہ میرا گستاخی آمیز پرغرور برتاؤ، اہل قلم و اہل دماغ کے ساتھہ ناقابل برداشت ہونے کی حد تک پہونچ جائے؛ مگر ساتھہ ہی مجھہ میں وہ لچکیلا، اطاعت سے بھرا ہوا، اخلاق بھی قایم رکھہ جسکی بدولت میں حکام بالا دست کی نگاہ میں چاپلوسی کرنے والے چپراسی اور خوشامدی ٹٹو سے زیادہ نہ جچوں! اور قسم سے مجھہ کو اپنے مہذب اور خاموش پالیسی کی۔ موجودہ دور کی ڈپلومیسی کی مجھے ایسی قابلیت عنایت کر کہ میں التفات آمیز سرپرستی اور ہمدردی بھری ہوئی امداد کے رنگ میں اپنے رائے دہندگان کے سر پر شفقت اور مہربانی کا

ساتھ پیر آتار رہا ہوں !!

اے جاہلوں کے مربی ؛ چھوٹی سی شان والے نکتہ نواز ! اپنی شانِ رحیمی کے طفیل میں ایسے روزِ بد سے ۔ ایسی منحوس گھڑی سے ۔ بچا ، جبکہ دوبارہ دشمنوں مجھے کونسل کے سامنے بولنے کی ضرورت پڑے ! اے ، سب کچھ جاننے والے تو جانتا ہے کہ میں کوئی لکچرار یا اسپیکر نہیں ہوں ۔ اور بفرضِ محال اگر ہوتا ، تو بھی ۔ میرے ناکارہ دماغ میں کوئی ایسا قابلِ غور خیال نہیں جس کے لیے مجھے صرف ایک واہیات سے واہیات فقرہ بھی بولنا پڑے !! اے دوربین کی امداد سے اصلیت کی تہ تک کو دیکھ لینے والے ، دانا و بینا ! تو دیکھتا ہے کہ تمام سوشیل قاعدوں کے لحاظ سے تمام قومی حقوق کے خیال سے ، میری ذاتی رائے اگر ہے تو یہی ۔ اور صرف یہ ہی ۔ کہ مرد دوزخ میں جائے یا بہشت میں ، مجھے اپنے نام کے ساتھ ۔ ایم ۔ سی لکھنے کا حق ہمیشہ ہمیشہ تک حاصل رہے !

"اے پارلیمنٹ اور کونسل کا حساب جانچنے والے ، اور ایک ایک رائے کو شمار کرنے والے ، احکم الحاکمین ! تو ضرور جانتا ہوگا کہ میں نے تیرے بہترین بندہ نے محض ۔ ایم ۔ سی ۔ لکھنے کا حق حاصل کرنے میں مبلغ دو ہزار روپے سکۂ رائج الوقت ، مناسب اوقات پر خرچ کیے ہیں ، یعنی ان دو حروف تہجی کو ۔ ایم اور سی ۔ کو بشرح ایک ہزار روپیہ فی حرف مول لیا ہے : اور اب میں ان کو محض انکو ۔ تمام سوسائٹی ، تمام قوم ، اور تمام ملک ، سے زیادہ عزیز ۔ بلکہ اپنی جان سے زیادہ عزیز ۔ رکھتا ہوں !! اے مبلغ علیہ السلام کو ستار عیوب کا سچا مرتبہ عطا فرمانے والے کروڑپتی خدا !! ان دو حروف کو اس قدر گراں مول لینے کے بعد اگر میں یہ التجا کروں کہ مجھے

کبھی کسی ضروری سے ضروری معاملہ میں بھی کیسی ایسے معاملہ میں بھی جس سے میری قوم کا فائدہ ہی وابستہ کیوں نہ ہو مجھے ایک لفظ بولنے کی بھی ضرورت نہ پڑے، ہونٹ ہلانے تک کی حاجت نہ ہو، تو کیا بیجا ہوگی ؟ نہیں نہیں تو ضرور میری التجا پر غور کرے گا۔ غور کرے گا اور منظور فرمائے گا!

اے کونسل کے معاملات پر قدرت رکھنے والے۔ چھوٹے سے ایانشی قادر مطلق! تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اس کمبخت جنرلسٹ اور پریس پوٹر کو اپنی تحریر و تقریر کی اصلاح وغیرہ کے معاوضہ میں بہت کچھ دیتا ہوں اور ساتھ ہی اُس کی علمی قابلیت اور وسیع معلومات پر مجھے پورا بھروسہ بھی ہے، لیکن میں پھر بھی اُس کی رٹوائی ہوئی اسپیچ پڑھنے سے ڈرتا ہوں ڈرتا ہوں اور محض اس خیال سے ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ کسی سوٹو ا، کی معمول سے زیادہ مقدار چڑھا جانے سے وہ کچھ کا کچھ نہ لکھ گیا ہو! کیونکہ اُس کے الفاظ کچھ ایسے مشکل، اور اُس کی عبارت کچھ ایسی پیچیدہ ہوتی ہے کہ مطلب سمجھنا تو درکنار میں اُس کو بغیر پوری محنت کے صحیح صحیح طوطے کی طرح۔ دوہرا بھی نہیں سکتا! اے حرف حرف پر پکڑنے اور نکتہ نکتہ پر چھوڑ دینے والے، ذی اقتدار نکتہ نواز! کیا اچھا ہو کہ میں تیرے سایہ عاطفت میں رہکر اس خوفناک شخص سے چھوٹ جاؤں اور کم از کم مجھ میں اسیقدر دماغ اور جرات پیدا ہو جائے کہ میں مرحوم لایق، سر برآوردہ حضرات کی یاد سے اُتر جانے والی تقریروں اور تحریروں کے وہ حصے جو میرے لیے مناسب اور موزوں ہوں رٹ لیا کروں اور بغیر جھجکے وقت ضرورت سنا دیا کروں! اس میں سب سے زیادہ اطمینان بخش یہ بات ہے، کہ مُردہ حضرات اس خیانت کا۔ اِس پوچ اور کمینہ پن کی چوری کا

دعویٰ کرنے کے لیے قبر سے اٹھ کر نہیں آ سکتے! اور تو جانتا ہے کہ آج کل ایسی چوری تحریر و تقریر کی چوری۔ شاعر، ناول نگار، لکچرار، لقار، غرض سب کے سب نہایت اطمینان کے ساتھ کر رہے ہیں! اب تو قسم ہے تجھ کو اپنی پولٹیکل مرتبہ اور اپنی ڈپلومیسی آمیز شان کی مجھے بھی اس قابل کر دے کہ میں اپنی ضروریات کے موافق اکثر حصے گمنامی میں پڑی ہوئی تصنیفات سے چھانٹ سکوں اور بعینہٖ خود لے لوں۔ بغیر یہ ظاہر کیے کہ وہ کسی اور دماغ کا نتیجہ ہیں۔ نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ کونسل کے روبرو پڑھ سکوں! یہ تو میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کونسل زیادہ تر مجھ جیسے ہی ٹھوٹ اور ناسمجھدار حضرات سے بھری ہوئی ہے، وہ خود ایسے ہی خاموش بیٹھے رہتے ہیں جیسے کہ میں، اور اگر شاذ و نادر کوئی ایک سمجھنے اور بولنے والا بھی جاتا ہے تو ہم احمقوں کی تعداد کی زیادتی اس کی کچھ پیش نہیں چلنے دیتی، اور وہ اپنی تمام علمی لیاقت اور دماغی جدت کے ساتھ بھی ہمارے گروہ حماقت و بے تمیزی کے مقابلہ میں کچھ ہستی نہیں رکھتا! اب رہے میرے رائے دہندہ، تو ان کی طرف سے مجھے یقین ہے کہ وہ مویشی چرانے والے، کھیت کاٹنے والے گنوار کسی طرح میرا ذریعۂ الہام۔ چالاکی سے بھرا ہوا اٹھائی گیرا پن۔ خود معلوم نہیں کر سکتے اور ساتھ ہی لوکل اخبار کا ایڈیٹر بھی ڈگری یافتہ نہیں جو میری اس چوری کو سمجھ سکے اور پبلک کو سمجھا سکے! اس لیے سب سے زیادہ آسان، سب سے زیادہ اطمینان بخش، سب سے زیادہ سستا، کم خرچ و بالانشین یہی طریقہ ہے کہ میں تحریر و تقریر کی چوری پر دماغی قابلیت کے آسمان پر کرانہ ہوں، بشرطیکہ تو بھی مجھے اپنی مہربانی، درد دوستی، بلکہ پروردگاری کی ہوئی امداد سے

سرفراز فرماتا رہے !!

اے تمام دنیاوی اعزاز و مرتبہ عطا فرمانے والے قاضی الحاجات! مجھے ایسی بلند اور اونچی شان۔ فریب، جھوٹ اور غرور سے بھری ہوئی شان عطا کر جس کے بدولت بیرسٹر بالوں تک غیر معمولی قابلیت اور درجہ التعظیم لیاقت کا پتلا نظر آنے لگوں، اور دو سالانہ کی رقم میں سے ... تجھ کو ... جیسے آپ کو وہ ثابت کرسکوں جو در اصل میں نہیں ہوں! اے ملک کی قسمت پر قدرت رکھنے والے فرشتوں کی کمیٹی کے صدر نشیں! اپنی تمام انتظامی فراست کے صدقہ میں میری رائے دہندگان کو میری اصل حقیقت سے ... واقف کر سکنے کے معاملہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اندھا، بہرا اور گونگا کر دے! کیونکہ انکو میری بیہودگی اور جہالت کی ذرہ برابر بھی خبر ہوئی۔ بیرا ہوئی اور یقین آ گیا۔ تو میں آئندہ الیکشن میں ضرور اپنی عزت کھو بیٹھونگا اور پھر اپنے آپ کو ایم۔ سی کبھی نہیں لکھ سکوں گا جسکو میں اپنے نام کے ساتھ اسیطرح نتھی رکھنے کا دلدادہ ہوں جس طرح ایک پولیس کا تھانیدار اپنی وردی پر تھانیداری کے چمکتے ہوئے مارک کا !!

اور تو اور، میری بیوی تعلیم یافتہ، ترقی بیوی۔ جس کا خوش رکھنا میری ہستی کا سب سے بڑا مقصد اور میری زندگی کا اکیلا فرض ہے، اس ناقابل برداشت صدمہ کی وجہ سے غصہ کے مارے بے آپے ہو جائے گی! اور تو جانتا ہے کہ اس کا غصہ تقسیم بنگالہ سے زیادہ مستحکم اور دیرپا غصہ۔ ایسی چیز ہے جو نہ خوشامد سے دبے اور نہ بندر بھبکیوں سے کم ہو، کیونکہ زمانہ کی ہوا نے اُسے آزاد حاکم اور مجھے عاجز محکوم بنا دیا ہے؛ اس لیے اسے حقوق نسواں اور آزادی نسواں کے ناپیدا کنار سمندر کے۔ ضعیا! [illegible] ! تجھے اس

سلہ یونانی [illegible] اسکے [illegible] نام [illegible]

منحوس گھڑی سے بچا جب کہ میں ۔ ایم ۔ سی ۔ لکھنے کا حق کھو بیٹھنے کی وجہ سے اپنی سرو قد بیوی کے کبھی نہ فرو ہونے والے غصہ اور نفرت کا نشانہ بنچ واں!

اس سب کے علاوہ، تو یہ بھی جانتا ہے ۔ اور خوب جانتا ہے کہ میں تیرا تابع فرمان بندہ، کبھی کسی معاملہ میں اپنے ملک کی، اپنی قوم کی یا اپنے مذہب کی بہتری کا طالب نہیں ہوں! ان تمام باتوں کی مجھے ذرا بھی پروا نہیں ۔ یقینی اثر دیر سفید کی ۔ اور اسی وجہ سے ترک و اٹلی کے جھگڑے میں یا روس و ایران کے معاملہ میں کسی قسم کی ہمدردی کا اظہار نہیں ایک نمک حلال بندہ ہوں: گو کہ ارادہ فیصلہ کرے گا وقت دو تیر رفت! میری طرف سے تمام دنیا جنت میں جائے یا جہنم میں مجھے اپنی چمکیلی شان و شوکت سے، اپنی سرو قد حکمراں بیوی کی خوشنودی سے، اور اپنے نام کے ساتھ ایم ۔ سی ۔ لکھ ۔ لینے سے، کام ہے اور بس! اے لچھمی جی کے تیر نظر کے گھائل، اے سلیغ علیہ السلام کی چھنکار پر جان دینے والے کفایت شعار رزاق! ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھے کونسل کا ممبر رہنے کا فخر عنایت کر اور ابد الآباد تک مجھے اپنی شان ابلہ نوازی کا مرجع قرار دے آمین!! ثم آمین!!!

سلطان حیدر ۔ جوش (علیگ)

ہر مجسٹی ملکہ مری کی تصویر جو زیب ورق اول ہے امید ہے کہ دلچسپی سے دیکھی جائیگی ۔ افسوس ہے کہ ہم اس تصویر کو دربار کے موقع پر علیحدہ شایع نہ کر سکے ۔ ۱۲

نالۂ جگر سوز

ہلال احمر کے شفا خانہ سے یہ نالۂ جگر سوز بلند ہو کر جب سے میرے کان تک پہونچا ہے تب سے میرے دل کی حالت تو ناگفتہ بہ ہے لیکن نہیں معلوم کہ اس کے سننے سے مسلمانان ہند کے قلب کی کیا کیفیت ہوگی جس مظلومہ کے حال نے مجھے اس نظم کے لکھنے پر مجبور کیا اسکی نہایت ہی مختصر سی روئداد اک دردناک نظارہ کے عنوان سے روزنامہ زمیندار مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۱۲ء میں بسند اخبار المؤید ۱۸ فروری چھپ چکی ہے۔

میں اپنی اس ستم رسیدہ بہن کیطرف سے جملہ اہل اسلام کی خدمت میں متذکرہ بالا نظم کو پیش کرتے ہوئے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس غریب کے لیے جو ہلال احمر کے شفا خانہ میں زیر علاج تھی اور نیز طرابلس کے دیگر زخمی بھائی بہنوں کی امداد کے لیے جس قدر چندہ ممکن ہو سکے فراہم کر کے مقررہ انجمنوں کے ذریعہ جلد بھیجنے کی کوشش فرمادیں اور اس موقعہ پر اپنی اسلامی ہمدردی کا فراخدلی کے ساتھ پورا ثبوت دیں۔

آدشل

(بندِ اول)

کہوں کیا ایک شب جو اضطرابِ دل کا ساماں تھا | بصد نشتر مرا زخمِ جگر دست و گریباں تھا
ہجومِ حسرت و غم اک طرف میں اک طرف تنہا | پریشانی پہ اپنی صورتِ آئینہ حیراں تھا
شریکِ رنج تھا کوئی نہ کوئی ہمنشیں میرا | انیسِ کنجِ تنہائی جنونِ خانہ ویراں تھا
عجب حسرت برستی تھی مرے کاشانۂ دل میں | بیاباں جلوہ گہ جو ایک دن رشکِ گلستاں تھا

بجائے اشک آنکھوں سے ٹپکتا تھا لہو ہر دم
سحابِ غم سے ہر ہر گوشۂ دامن میں پنہاں تھا
چراغ آسماں گل ہو چکا تھا نصف شب تک
دل افسردہ سوزِ غم سے شمع بزم حرماں تھا
سکوت خاموشی کا اس گھڑی اک طرفہ عالم تھا
زمانہ پیکرِ تصویر کی مانند بے جاں تھا
یکایک کان میں پہونچی کسی مظلوم کی زاری
جو ہر دم دردناک آواز سے اس طرح نالاں تھا

"فغاں میں آہ میں فریاد میں شیون میں نالہ میں"
"سناؤں دردِ دل طاقت اگر ہو سننے والے ہیں"

(بند دوم)

"مسلمانو! تمھیں کچھ پاس بھی ہے دین ملت کا
خیال آتا ہی ہے تمکو کبھی اپنی حمیت کا"
"کیا ہے آج کل کیوں ترک آئینِ وفاداری
سبق دیتا نہیں اسلام کیا تمکو اخوت کا"
"زمانہ جاگتا ہے اور تم ہو خوابِ غفلت میں
نہیں ہے کچھ تمہیں احساس ہی اپنی مصیبت کا"
"چلے جاتے ہو آخر کس لئے یوں الٹی رستے پر
پتہ ملتا نہیں کیا تمکو شاہ راہِ شریعت کا"
"برائے نام اب تو ہے زمانے میں مسلمانی
نہ تھا یہ حال پہلے احمدِ مرسل کی امت کا"
"زمانہ پھر گیا آنکھیں پھرا لیں ہم سے تم نے بھی
بھلانا دل سے اب تو تمکو نہیں شیوہ مروت کا"
"نہیں سنتا کوئی فریاد مظلوموں کی دنیا میں
الٰہی کوئی بھی واقف نہیں میری مصیبت کا"

"نہیں بنتا ہے کوئی آشنا حسرت کے ماروں کا
کوئی کیا جانتا ہے درد ہم سے دلفگاروں کا

(بند سوم)

"خوشی کیا خاک ہوگی دل کو فصلِ گل کے آنے سے
جدا ہے خانماں برباد بلبل آشیانے سے"
"پریشاں ہو گیا دم بھر میں گلدستہ جمعیت کا
چھڑایا مجھکو صیادِ ستمگر نے گھرانے سے"
"مرے بھائی بہن سب زیرِ خنجر خون میں تر ہیں
نہ کیوں تازہ لہو کی آئے بو میرے فسانے سے"
"میرے ٹوٹے ہوئے بازو کو زخمی کر گیا ظالم۔
ابھی تک خون کا فوارہ ہے جاری میرے شانے سے"

"کیا اطالوی جلادنے مجھ پر ستم ایسا
کہ جس کی یاد سے اب تک نہیں ہے دل ٹھکانے سے"
نہ کچھ تقصیر تھی میری۔ نہ کچھ میں نے خطا کی تھی
شہادت بگیناہی کی طلب کر لو زمانے سے"
ہوئی جاتی ہے اب تو دن بدن حالت بُری میری
طبیعت کو ہوئی ہے بسکہ نفرت آب و دانے سے"
ہمیں کیا حق نہیں حاصل ہے مسلم کی کمائی پر
دوا کے ہی لئے کچھ بھیجدو اپنے خزانے سے"
نہ کی جب وقت پر امداد پھر کس کام آؤ گے
کفن بنواؤ گے جب ہم گذر جائیں زمانے سے"
تمہارے دل میں گر اسلام کی کچھ بھی محبت ہو"
مسلمان ہو۔ مسلمانو! اگر کچھ بھی حمیت ہو"

(بند چہارم)

"یونہیں دنیا میں کب تک تم رہو گے بیخبر۔ آخر
کبھی تو ہوگا مظلوموں کی آہوں کا اثر آخر"
نہیں کچھ سود اس سے جب رہ حق میں کام آیا
تو پھر کس کام آئیگا تمہارا مال و زر۔ آخر"
جہاں تک ہو سکے ہمدردی ہمجنس لازم ہے
بشر ہو اور پیرو ہو امت خیر البشر۔ آخر"
حسینؑ تشنہ لب نے کربلا میں تین فاقوں سے
بچالی آبروئے دین احمدؐ دیکے سر۔ آخر"
یہ وہ تھی صاحب عصمت کہ دنیا کو بھی نہ آنی تھی
مگر دنیا کی گردش نے پھرایا در بدر۔ آخر"
نہ بھایا تھی جو یارا شنید اس قصۂ غم کا
کہوں کیا لوٹ کر ہی رہ گیا میں خاک پر۔ آخر"
کسی مرد کی صورت میں پڑا تھا خاک پر ارشد
نسیم روح پرور لائی پیغام سحر۔ آخر"
نوائے شیون مرغ سحر سے شور محشر تھا
مؤذن کی زباں پر نعرۂ اللہ اکبر تھا

——— آغا غلام حسین ارشد

اثبات واجب الوجود۔ باری تعالیٰ کے ثبوت میں وہ لاجواب کتاب جس کے ترجمہ پر پنجاب گورنمنٹ نے قابل مترجم کو انعام عطا فرمایا

منیجر عصمت۔ و تمدن قیمت (عہ ر)

دولت

دولت موضوع ہے علم اقتصاد کا۔ علم اقتصاد علم ہے اُن قوانین کا جو اُن چیزوں کی تحصیل اور تقسیم اور استعمال کو منضبط کرے جو قیمت رکھتے ہیں اور ضروری یا مرغوب ہوتے ہیں۔ دولت کی تعریف میں اگر قیمت کی قید نہ لگائی جائے فقط یہ کہا جائے کہ دولت وہ اشیا ہیں جو ضروری یا مرغوب ہیں تو غلطی ہوگی اسی سبب سے کہ ہوا اور آفتاب کی گرمی میں سب صفتیں موجود ہیں۔ ان چیزوں کا فیض عام ہونا اور کسی کے اقتدار میں نہ آنا ان کو قیمت سے بری کرتا ہے۔ لہذا وہ اس علم کے بحث نہیں ہو سکتے۔

علم اقتصاد کی غرض یہ ہے کہ آدمی کی محنت سے ضروریات اور آرام کے اشیا زیادہ پیدا ہوں۔ وہ ان مناسبتوں کا اندازہ کرے جس سے یہ دولت مختلف حصے لوگوں میں منقسم ہے اور ان طرائق کو معلوم کرے جس سے اشیا زیادہ تر منفعت سے خرچ کیے جاویں۔ دولت اسقدر ضروری چیز ہے اور اس کی خواہش ہم کو ایسی بڑی سی بڑی محنت اور مشقت پر آمادہ کرتی ہے کہ اس کا علم سیکھنا ایک لازمی امر ہوگیا ہے اور اسپر غور و فکر کرنا واجب ہے۔ کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس کے لیے یہ کہا جا سکتا ہو کہ یہ علم لاحاصل ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض کے لیے وہ زیادہ سودمند ہے اور بعض کے لیے کم مگر سب کو اس سے تعلق ہے۔ ہر قسم و ہر صنف کے اشیا کی قیمت۔ کاریگر اور تاجر کے منافع ترقیٔ پیداوار کے اصول۔ مزدور کی اجرت محصول کی آمدنی اور انکا اثر

یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ فقط علم اقتصادی اسکو معلوم اور حل کر سکتا ہے۔

دولت کا حاصل کرنا فقط اس غرض سے نہیں ہے کہ قوت کی تدبیریں معاون ہو بلکہ بغیر اس کے ہم اپنے روحانی وقوف وشعور کو نہ تربیت دے سکتے ہیں نہ ترقی جہاں دولت جمع نہیں ہوئی ہے وہاں ان لوگوں کے دل و دماغ فقط جسمانی ضروریات کے پورا کرنے میں لگے رہتے ہیں ان کی تربیت کا وقت نہیں ملتا۔ ان کے خیالات اور احساسات اور سمجھہ کوتاہ خود غرض ہو جاتے ہیں اور خود پست ہمت۔ دولت آدمی کو اپنی عقل اور سمجھہ کے ترقی دینے میں مدد دیتی ہے اور ایک بہت ہی اہم چیز قوم کی تہذیب اور آراستگی کے بڑھانے کی ہے۔ جب تک انسان کو پیٹ کے دھندے سے فرصت نہ ہو وہ ان مشاغل ترقی میں مصروف ہو ہی نہیں سکتا۔ تاہم اس علم کی طرف قدیم زمانہ میں بڑے بے پروائی رہی۔

ہر شخص کو اس کا اندازہ ضرور ہے کہ دولت کیا چیز ہے۔ مگر اس لفظ نے قدیم زمانہ میں مختلف معنی پیدا کئے بہت سے اصول پیش کئے گئے اور ان کے مدعی بہت سے لوگ اوٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک خیال اوسی زمانہ میں رائج تھا اور بہت دنوں تک ممالک کی تجارت پر اس کا اثر رہا۔ اسکو مرکنٹائل تھیوری کہتے ہیں۔ یہ خیال لوگوں کے دماغ میں بس گیا تھا کہ دولت فقط زر نقد ہے۔ سونا چاندی جو سکہ کی حالت میں نہوں تو سکہ کے داموں بیچے جا سکتے ہیں اس اصول کے موافق جو چیز کہ ایک ملک میں روپیہ جمع کرنے میں بکار آمد ہو وہ ملک کو دولت مند کرتی ہے اور جو سونے چاندی کو ملک کے باہر کرے وہ غریب کرتی ہے۔ ان اصول پر مال کا باہر بھجوانا اور قیمت کا ملک میں آنا بہت ہی اچھا سمجھا گیا اور اسکی ترقی کی کوشش کی گئی۔ اور کسی چیز کا ملک میں داخل ہونا سوائے نقد کے نقصان سمجھا جاتا تھا۔ دنیا کی تجارت اس زمانہ میں

دوستانہ تجارت نہ تھی بلکہ حریفانہ تھی کہ دیکھیں کون سونا چاندی زیادہ گھسیٹتا ہے۔

عام محاورہ میں دولت زر نقد کو کہتے ہیں۔ ہر شخص کے مال و دولت کا اندازہ نقد ہی میں ہوتا ہے۔ اور زر نقد کو دولت کہنا سچ بھی ہے۔ ایک آدمی کے پاس ایک معتدبہ رقم جمع ہو جائے تو بے شک وہ مالدار ہے اور اپنی ضروریات کو بہت آسانی سے پورا کر سکتا ہے لیکن اگر سارا ملک یہ خیال کرے تو فقط روپیہ ہی روپیہ نظر آئے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی چیز جنس سے ملے گی۔ آخرش یہی ہوگا کہ وہ رقم کیسہ سے باہر ہو اور سامان ضروری منگوایا جائے۔ ان وجوہ سے یہ ظاہر ہوا کہ نقد ہی فقط دولت نہیں۔ بلکہ وہ اشیا بھی دولت ہیں جو بنی نوع انسان کے کام آسکتے ہیں۔ اور جو قدرت نے بے انتہا مہیا نہیں کیے ہیں۔ جیسا کہ آگے مذکور ہوا کہ ہوا اور آفتاب کی گرمی دولت میں نہیں گنی جا سکتی۔ پانی کو بھی قدرتی دولت کہنا چاہیے۔ اگرچہ شہروں میں یہ قیمتی ہو جاتا ہے مگر اس قدر وافر ہے کہ دولت کے مفہوم میں نہیں آسکتا۔ ہاں بعض حالتیں ہیں کہ جس میں اسکی قیمت ہو جاتی ہے۔ مثلاً لوگوں کا آب و ہوا بدلنے کی غرض سے ملکوں کو جانا۔ اس سفر کے اخراجات کو آب و ہوا کی قیمت کہا جا سکتا ہے۔

پھر ایک شخص کی دولت میں اور ایک ملک کی دولت میں بھی فرق ہے ایک شخص کے لیے وہ سب اشیاء دولت ہیں جو ذاتی قیمت نہ رکھتی ہوں مگر دوسروں سے وصول کی قدرت رکھتے ہوں مگر ایک ملک کے لیے وہ چیز دولت نہیں جس میں بذات خود کوئی قیمت نہو۔ فرض کرو کہ ایک کاغذ رہن ہے کہ وہ اس شخص کے لیے ایک ذریعہ آمدنی ہے مگر ملک کے لیے وہ دولت نہیں غرض اسی طرح کے اور عہدنامہ اقرار کے لیے دولت ہیں مگر ملک کے لیے نہیں۔

ایک یہ سوال ہے کہ کیا آدمی کے ہنر کو بھی دولت کہہ سکتے ہیں۔ تجارتی

معلومات اور ہنر و دستکاری کو ہمیشہ مادّی اشیا کی پیدائش سے تعلق رہا ہے۔ ایک کاریگر کا ہنر فقط اسی وقت دولت کہا جا سکتا ہے جب وہ دوسری مادّی دولت پیدا کرنے میں معین ہوتا ہے۔ اور کوئی اوصاف جو اس باب میں ظاہرا سود مند نہ ہوں وہ کبھی اس طرح موسوم نہیں کیے جاتے۔ غرض کہ یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ اس علم میں دولت سے مراد فقط وہی ہے جو مادی ہو۔

اگر یہ کہا جائے کہ ایک روٹی دولت ہے تو علمی لحاظ سے وہ بالکل صحیح اور جائز ہے گو محاورہ میں مسخر معلوم ہو۔ ایسا ہی ہوتا ہے کہ ایک شے ان صفات سے متصف ہو جو انسانی ضروریات کو پورا کرتی ہیں مگر انسان ان سے ناواقف ہے یا ناقابل ہونے کی وجہ سے غور نہیں کر سکتا مثلاً آلو کو مدتوں بیکار سمجھا گیا۔ آبشار کی قوت کا پتہ نہ لگا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز شاید کارآمد ہو اور دولت کے بڑھانے کے قابل ہو۔ مگر ہم اس سے ناواقف ہوں۔ برعکس اس کے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو درا صل ہماری ضروریات کو پورا نہیں کر سکتیں۔ مگر ہماری سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے کہ وہ کام کی ہیں سینکڑوں برس تک لوگ جھوٹے تبرکات کو مفید اور بیش بہا سمجھا کیے کتنی ہی معدنی اور اشتہاری دوائیاں ہیں جن کی قیمتیں بہت گراں ہیں مگر اثر مشکوک۔ اسی طرح کہنہ کپڑے اور تصاویر اور پرانے سکے ہیں کہ اب ہی کسی کا میلان ان کے جمع کرنے کی طرف ہو جائے تو وہ قیمتی ہو جائیں۔ شراب کو دنیا برا کہتی ہے اور حکیم و طبیب تو بے حد مگر لوگ انہیں کوئی نہ کوئی فائدہ دیکھتے ہیں اور دولت سمجھتے ہیں۔

میر عاظم علی سینیر بی۔ اے کلاس

غزل

حفاظت زخم دل کی یوں ہمیں ناشاد کرتے ہیں
جگر پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں جب فریاد کرتے ہیں

ادا رسم عزائے کشتۂ بیداد کرتے ہیں
لہو روتے ہیں یوں ماتم مرا جلاد کرتے ہیں

ہجوم غم سے خالی ہم دل ناشاد کرتے ہیں
ذرا تسکین ہو جاتی ہے جب فریاد کرتے ہیں

امید و نکو ملایا خاک میں یوں ناامیدی نے
کہ اک گور غریباں دل میں ہم آباد کرتے ہیں

بیان گرمی ہنگامۂ بیداد مشکل ہے
کہ ہر تار نفس جلتا ہے جب فریاد کرتے ہیں

شہادت پر نہ پوچھو تم سبب زخموں کے ہنسنے کا
یہ آپس میں ادا رسم مبارکباد کرتے ہیں

پر پرواز ملتے ہیں ہماری خاک کو گویا
خدا رکھے سلامت اُن کو جو برباد کرتے ہیں

ہجوم یاس سے گھبرا کے لب پر جان آئی ہے
نکل جائے کہ ٹھہرے آپ کیا ارشاد کرتے ہیں

حسینوں سے نوازش ہائے الفت کی توقع کیا
کرم کرتے ہیں ظالم اگر بیداد کرتے ہیں

نفس کی آمد و شد سے یہ مطلب ہے کہ حسرت کو
کبھی ہم قید کرتے ہیں کبھی آزاد کرتے ہیں

تمدن قابل اصلاح ہے دنیائے الفت کا
وفاؤں کے طریقے و رسم ایجاد کرتے ہیں

لگا رہتا ہے کھٹکا ظلم تازہ کا اسیروں کو
قفس سے دیکھتے رہتے ہیں کیا صیاد کرتے ہیں

نظر آتی ہیں اب تک بیستوں پر خون کی چھینٹیں
یہ جوہر ہیں جو ذکر تیشۂ فرہاد کرتے ہیں

ہزاروں رنگ سے کھینچیں دل زخمی کی تصویریں
سرشک خوں ہی کار مانی و بہزاد کرتے ہیں

خدا جانے نتیجہ کیا ہو اس طومار حسرت کا
وہ خط لکھا ہے جس کے حرف تک فریاد کرتے ہیں

عجب اعجاز رکھتی ہے یہ دنیائے تصور بھی
وہ لوگ آنکھوں میں پھر جاتے ہیں جنکو یاد کرتے ہیں

دل پر آرزو کو تم کرو ویراں تو تم جانو
ہمارا کام ہے اتنا کہ ہم آباد کرتے ہیں

نظر صد سے سوا ہے اب اذیت قید ہستی کی
کہ اٹھتے بیٹھتے اعضائے تن فریاد کرتے ہیں

نعمت [illegible]

دو آسمانی مسافر

۲۵ دسمبر ۱۹۱۱ء کا چندر گرہن جس نے تمام یورپ میں صبح صادق کے وقت ایک تہلکہ برپا کر دیا تہا اپنی نوعیت کے اعتبار سے یقیناً بےمثل تھا جو پردۂ دنیا پر ایک بلائے ناگہانی کی صورت میں ظاہر ہوا قریب آگیا تہا وہ وقت کہ شجاع مشرق اپنے نازک خنجر سے دامان شب آناً فاناً چاک کر دے نسیم اٹھلا اٹھلا کر مژدہ صبح لا رہی تہی شمع کافوری جھلملا جھلملا کر صحبت شب کو الوداع کر چکی تہی اور وہ گل نوشگفتہ جو رات کے ابتدائی حصہ میں حسن عروس کی زیب و زینت کو دوبالا کر رہے تہے شب وصل کے فراق کا پیغام پونچا چکے تہے کہ پورنماشی کا چاند گہنانا شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین و آسمان تیرہ و تار ہوگئے نہ معلوم برج عقرب کب کا منہ کہولے بیٹھا تھا کہ یکلخت ہی شربت کے گہونٹ کی طرح نگل گیا اور کوہ الپیا کے دامن میں جس پر چادر مہتاب آب و تاب سے پھیلی ہوئی تہی اندھیر چھا گیا کچہ ایسا سناٹا ہوا کہ بلبل بیمار جو لہک لہک کر صبح کا استقبال کر رہی تہی آشیانہ میں جا دبکی زمین وجہ گرھن ضرور تہی مگر چاند کی بے بسی پر آٹہہ آٹہہ آنسو رو رہی تہی آسمان بیگناہ تہا یا نہ تہا مگر عقرب کے مظالم کی تاب نہ لا سکا۔

تارے ٹہنڈے سانس بہرتے ہوئے بساط فلک پر تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہے تہے کہ قمر مظلوم نے پلٹا کھایا عقرب کے اس سینہ کو جو فولاد سے زیادہ سخت تھا ہلالی ناخنوں سے چیرتا ہوا باہر نکلا قریب تہا کہ نظام عالم فتح و نصرت کا سہرا قمر چہاردہم کے سر باندھ دے کہ آفتاب سیہ رو برج عقرب

کی حمایت میں نصف سے مشرق کے ہوائی جہاز میں بیٹھکر بلند ہوا۔ اور ان کا پردہ ڈال کر ان کے دل شیر مردہ کر دیے۔

آفتاب و نقائے آفتاب کے علاوہ جن کے جاہ و جلال کا سکہ ہر چہار طرف بیٹھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بے شمار ستارے چاند کے ساتھ جانیں لڑائے ہوئے تھے اور منتظر تھے اسوقت کے کہ ماہتاب کو اسی چمک دمک سے اپنے تخت پر جلوہ گر دیکھیں۔

(۱۰)

دن کے دو بجے ہوں گے کہ رئیس بیلیگر نی کے خارجی سپرنٹنڈنٹ نے صیغہ خارجیہ کے وزیر کا یہ اعلان مشتہر کیا۔ حدود ونزی پر برج عقرب کا حملہ گو تعجب انگیز و مضحکہ خیز سمجھا گیا تھا لیکن اس دل انصاف کے مدعی آفتاب نے جس ہٹ دھرمی سے دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکی ہے اس نے یقین دلا دیا کہ حرارت آفتاب کی پیدا ہونے والی تمام طاقتیں متفقہ کوشش کر رہی ہیں کہ قدرت کے انتظام کو پلٹ دیں اور رات کا سایہ عاطفت جو بقائے حیات انسانی کے واسطے لازم ہے صفحۂ ہستی سے ناپید کریں وہ فلسفۂ قدرت کے اس مسئلہ سے بالکل بے خبر ہیں کہ جب تک انکا وجود دنیا میں ہے ہمارے شہنشاہ معظم کی آب و تاب دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتی رہے گی ہمیں اسبات کا اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ آفتاب اپنی لگاتار کوششوں تحقیقوں اور تجربوں سے انسانی دنیا کے دل مسخر کر چکا ہے وہ ہر قسم کے آلات حرب سے مسلح ہے دنیا کے بڑے حصہ کی ہمدردی اس کے ساتھ ہے لیکن اس کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وہی کھیتیاں جو اس کی تمازت سے پک کر تیار ہوئیں اگر انصاف سے کام لیں گی تو بلاشبہ اس کے ان افعال پر لعنت بھیجیں گی۔ گو ہمارے عقائد ہمکو یہ کہنے کی اجازت

نہیں دیتے کہ روز روشن میں ہماری طاقت نہ صرف کمزور بلکہ بالکل صفر ہے لیکن ہم اسباب کے متمنی ضرور ہیں کہ کاش شب ماہ میں ہماری سٹ بھیڑ اقلیم آفتاب کے شہ زور تاجداروں سے ہو جائے۔

چونکہ ہمارے سلطان قمر اول خلد اللہ ملکہ عقرب کے کمینہ حملے سے ہر طرح محفوظ رہے اس خوشی میں آج رات کو لائٹ پارک میں ایک جلسہ اس غرض سے منعقد ہوگا کہ تمام خیر خواہان مملکت قمری اس معاملہ پر غور وخوض کریں ممالک آفتابی کے تمام سفرا خصوصیت سے اس جلسہ میں مدعو کیے گئے ہیں۔

(۴)

برج سرطان کو چھوڑ کر جس نے تاج برطانیہ کی طرح کارزار طرابلس میں انصاف کو ہاتھ سے نہ دیا تمام آفتابی طاقتیں یورپ کی طرح عقرب کے ساتھ تھیں انکو یقین تھا کہ عقرب کے صرف حملہ کی دیر ہے ممالک قمری کا یہ حصہ جو سوے بازار توتیس کے نام سے مشہور ہے یقیناً شعاعی طاقتوں کے زیر نگین ہوگا یہی وجہ تھی کہ گرھن کے وقت جب عقرب نے توتیس پر حملہ کیا قمر اول نے ہر چند کوششیں کیں چاروں طرف نگاہ دوڑائی، مگر اعانت تو درکنار کسی نے بات تک نہ پوچھی کینہ دوز عقرب کی ہنکاروں نے توتیس کے پہاڑ پرزہ پرزہ کیئے زمین تاخت وتاراج کی مگر آفتاب سیہ کار کے کان پر جوں نہ چلی اس بے ایمانی کا یقینی نتیجہ یہ تھا کہ خود ممالک آفتابی کی رعیت اپنے تاجداروں پر لعنت برسانے لگی اور واقعات نے باوازبلند پکار دیا کہ بے ایمانوں کا وجود تحت الثرٰے ہی میں نہیں بہت جگہ موجود ہے +

(۴)

کرامسٹ بلڈنگ جولانٹ پارک کا قابل ناز حصہ تھا نہایت تزک و احتشام سے آراستہ کیا گیا۔ مگر موسم زیادہ گرم ہونے کی وجہ سے یہ اوپن ایر میٹنگ ایسی جگہ منعقد ہوئی جہاں سے اطراف و جوانب کی بہار اچھی طرح نظر آسکے۔ آفتاب کے غروب ہوتے ہی پلیٹ فارم ستاروں سے بھرا ہوا تھا جو اپنی زرق برق ڈریس میں جگمگا رہے تھے دس بجے کے قریب لارڈ سٹار منسٹر اوف وار کا داخلہ ہوا جسپر قطبی ستاروں کے گارڈ اوف آنر نے سلامی دی۔ ٹھیک آدھی رات کے وقت ہوا مسند رجاگنا یردد گا آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر ہز مجسٹی ملکہ مشتری کی تشریف آوری کا نعرہ بلند ہوا۔

... کی تحریک اور ... جسمیں تمام اوڈینس کی التجا شامل تھی ہز مجسٹی نے کرسی صدارت کو رونق بخشی اور چاروں طرف سے گوڈ سیو دی کوئن کے نعرے بلند ہوئے۔

لارڈ سٹار کی منسٹیریل اسپیچ اور اس کے بعد جو مختلف تقریریں ہوئیں ان کا اعادہ فضول سمجھکر ہم صرف ہز مجسٹی کی اسپیچ نقل کرتے ہیں۔

شائننگ سٹارز اینڈ سفیرز:-

جس محبت و خلوص سے آپ صاحبان نے میرا خیر مقدم کیا میں اسکو دیکھکر بیحد خوش ہوئی میں ضرور آپ کا یہ محبت آمیز پیغام شہنشاہ معظم کی خدمت میں پہنچا دوں گی۔

گرہن پر آپ صاحبان کا اس قدر اضطراب اس خیال سے کہ وہ ... کا کافی ثبوت ہے۔ ہمارے دلی شکریہ کا مستحق ہے مگر یہ کیفیت جس نے آپ کو اس قدر پریشان کیا محض ایک عکس ہے ان واقعات کا جو آج کل

انسانی دنیا پر گذر رہے ہیں ہم کو اپنے معاملات کا مطلق اندیشہ نہیں۔ نظام عالم ہمارے بقا و قیام کا ذمہ وار ہے۔ بس اگر کوئی گزند پہونچ سکتا ہے تو اسی وقت جب تمام آفتابی سلطنتیں کسی نہ کسی مرض میں گرفتار ہو جائیں۔ لیکن افسوس کے قابل وہ اصلی واقعات ہیں جن کے عکس نے آپکے دل دہلا دیے آپ صاحبان کو اپنے افکار و فرائض سے اتنا وقت بمشکل ملسکتا ہوگا کہ آپ انسانی دنیا کا کبھی مطالعہ کریں یا کسی محدود قطعۂ زمین کی کیفیت ملاحظہ فرمائیں لیکن آدھی رات کے سناٹے میں جب مطمئن دنیا کا بڑا حصہ نرم نرم بستروں پر آرام کرتا ہے میں آج کل ان حالات کو دیکھتی ہوں جس کے خیال سے کلیجہ منہ کو آتا ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ لوگ بھی ان جگر خراش واقعات کو سنکر اپنی بپتا بھول جائیں گے یہ سرزمین طرابلس الغرب جو آپ کی آنکھ کے سامنے ہے اسپر نظر ڈالئے اور ان بے نصیب فدائیان وطن کو دیکھئے جو جنگلوں میں پڑے اپنے وطن کی حفاظت کر رہے ہیں نو مہینہ کا عرصہ گذرا کہ بے ایمان ایطالیہ نے عیسائی طاقتوں کی متفقہ صلاح و مشورہ سے ان بدنصیبوں پر حملہ کیا اور اپنا رعب بٹھانے کے واسطے سینکڑوں اور ہزاروں مظلوم اور معصوم بچے اور بوڑھے عورتیں اور مرد تہ تیغ کردیے۔

سرزمین طرابلس کا ہر ذرہ اور طرابلس پر چھایا ہوا آسمان قیامت تک خون کے آنسو روئیگا ان معصوموں پر جو ایطالیہ کے ظالم ہاتھوں نے ماں کی گود سے جدا کر دیے اور نخلستان میں ان کی لاشیں بے گور و کفن سڑتی رہیں۔

یہ انسان جو تہذیب و تمدن کا مدعی اشرف المخلوقات ہونے کا مستحق تھا ہے اپنے کانوں سے ان بے بسوں اور بے کسوں کی گریہ و زاری سنتا رہا اور اس کا دل نہ پسیجا۔ طاقتور مہذبوں نے بیگناہ کمزوروں کو آہ و نالے سے ذبح ہوتے ہوئے دیکھا اور کان پر جوں نہ چلی۔

ایک رات کا ذکر ہے دو بج چکے تھے ابر غلیظ آسمان پر چھایا ہوا تھا۔ سمندر کے اس کنارہ پر جہاں کوسوں انسان کا گذر نہ تھا حسن کی ایک مجسم تصویر جس کے دونوں رخسار و پر شباب کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی مجھکو نظر آئی۔ بحر ذخار اس کے سامنے بہتا ہوا سمندر کے لہروں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی اور زیتون کے درخت تالیاں بجا بجا کر اسکا خیر مقدم کر رہے تہے۔

رات اندھیری اور ڈراونی تہی موسم ٹھنڈا اور قیامت خیز ہوا پانی میں ڈوبی اور خنک مگر یہ ماہ کنعان حیران و پریشان ساکت کھڑی تہی اسکی صورت ظاہری ثبوت تھی اس فراق ابدی کا جس کے ظالم تیر ناتجربہ کار دل کے پار ہو رہے تہے۔ عشق اس کے سر پر کھیل رہا تھا اور ذہانت دل مجروح کو قوت متخیلہ پر یورش کر کر کے مچھلی کی طرح تڑپا رہی تہی شتر بے مہار بے تیا[؟] ہر طرف دوڑتے پہرتے تھے اور طرابلس کے مشہور چیتے [؟]ن کا غول کا غول اس کے پاس سے سائیں سائیں کر کے نکل جاتا تھا خرگوش ادہر ادہر اچھل رہے تھے مگر کوئی چیز سرزمین طرابلس پر ایسی نہ تھی کہ اس کے تخیلات کی رو کو روک دے۔

پچھلا پہر شروع ہو چکا تھا کہ یہ معصوم طرابلس کے دامن کوہ کی طرف چلی سمندر کی لہریں اس کے حسن خداداد پر دوڑ دوڑ رہی تہیں ہوا کے جھونکے جھک جھک کر اس کے پاؤں چوم رہے تھے اور درختوں کے پتے سرسرا سرسرا کر اس کو الوداع کہہ رہے تھے۔

(۵)

شب آخر کے سنسان وقت میں ابر کے غلیظ ٹکڑے جھڑیوں اور ولولوں کو سینے سے چمٹائے ادھر ادھر پھر رہے تھے کہ پانی کا ایک چھوٹا سا قطرہ آغوش پدری سے جدا ہو کر زمین کی طرف چلا بادل کے ٹکڑے ۲۸ اکتوبر کا وہ خونریز واقعہ دیکھ

چکے تھے جس میں سیہ رو جنرل کینوا نے ننھے ننھے معصوم ماؤں کے کلیجوں سے چھین کر سنگینوں کی نوک پر بھون ڈیلے ان بچوں کی گریہ وزاری اور مامتا کی ماریوں کے بین جس نے تمام روئے زمین پر تہلکہ مچادیا یورپ کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس ہوئے اور صاحبِ اولاد یورپ نے اپنے بچوں کو گود میں لے کر ان بیکسوں کے ذبح ہونے کا تماشہ دیکھا اس لیے اس قطرہ کا سرزمین طرابلس پر پہونچنا اس سیہ گھٹا کو جس نے مہینوں اس ننھے سے قطرہ کو پیٹ میں رکھ کر خون جگر سے سینچا. گوارا نہ ہوا مگر ننھے سے دماغ میں سیر کا سودا سما چکا تھا۔ ماں باپ کی منت سماجت پیش نہ گئی اور یہ قطرہ فضائے عالم میں اُڑتا زمین کی طرف چلا ایک ننھی سی بوند جو مہینوں اس کے ساتھ رہی تھی اپنے مدتوں کے رفیق کا ساتھ نہ چھوڑ سکی اور وہ بھی اس کے ساتھ ہی روانہ ہوئی۔

چھوٹا سا قطرہ اور ننھی سی بوند دو توبہن بھائی جن کے سر پر ہوا کے جھکڑوں کے سوا اب کوئی والی وارث نہ تھا اس قیامت خیز رات میں جس نے اچھے اچھے مردوں کے کلیجہ دہلا دیے تھے ذوق وشوق سے اپنا سفر طے کر رہے تھے۔ نادانی ان سے وطن چھین ماں کی گود اور بالک ہٹ بزرگوں کا ساتھ چھٹا چکی تھی ہوا اپنے ہنگورے میں ان ننھی سی جانوں کو جھونکے دے دے کر جھلا رہی تھی زمین نے اپنی کشش شروع کی اور دونو معصوم کھیلتے کھلاتے اسی دامن کوہ میں پونہچے جہاں محبت و مصیبت کی تصویر گذری ہوئی راتیں اور بیتے ہوئے دن یاد کر رہی تھی۔

زمین اپنے ننھے ننھے مہمانوں کی مدارات میں کمی نہ کر رہی تھی اور گو جھیل نے اپنے فرائض نہایت توجہ سے پورے کئے مگر ماں کی محبت بھری نگاہیں میسر نہ آسکیں۔ ادھر زمین منہ کھولے بیٹھی تھی تو اُدھر صدف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر

تک رہی تہی یہاں ہوا چاروں طرف اداسی چھائی پھر رہی تھی تو وہاں سمندر زور شور سے بہتا چلا جا رہا تہا اور یہ کی معصوم جانیں عجب کشمکش میں تہیں ہر لمحہ وطن سے دور اور پردیس سے قریب کر رہا تہا۔ ہوا کے فرانٹوں نے نازک جسموں پر ٹھڈیاں ڈالدیں اور حالت یاس میں ان دونوں نے آسمان کیطرف سر اٹھا کر دیکھا مگر بے سود تہا۔ آنکھ سے آنسو نکل پڑے مگر اب ان آنسوؤں کو پونچھنے والا کون تھا آخر وہ وقت آپہونچا کہ دونو آسمانی مسافر زمین پر داخل ہوں ماں کا بچھوا یاد کر کے دونوں نے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور طرابلس کی اس دیوی کی نازک پیشانی کو بوسہ دیا +

کئی گھنٹوں کے مسلسل استغراق بوسے نے حرکت دی خاتون بدنصیب نے ایک ٹھنڈا سانس بہرا اور ان آسمانی مسافروں کو پیشانی سے اتار کر ہاتہ پر لیا ان کی صورت دیکھتے ہی دیسپرچین اور غریب الوطنی برس رہی تہی اس کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔

دونو بہن بہائی جو یہ سمجھے تہے کہ آغوش مادر کی بو اس دنیا کے کس ذرہ سے آئے گی خاتون کی یہ حالت دیکھ کر چونک اٹھے مگر جب یہ دیکھا کہ ان ہی کے ہمجنس ان ہی کے ہم عمر اس خاتون کی آنکھ سے بہی پیدا ہو رہے ہیں تو ان کی ہمدردی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خاتون کی محبت بھری نظریں دونو بہن بہائیوں پر گڑی ہوئی تہیں غور و تعمق کی نظر سے وہ تہوڑی دیر ان کو دیکھتی رہی اور پھر اس طرح کہنے لگی،

معصوم پردیسیو! کس باغ کے پہول اور کس ماں کے لال ہو؟ کہ اس اندھیری گھپ رات میں ماں کا بچھوا چھوڑ جنگل جنگل کی خاک چھان رہے ہو خدارا کسی اور سمت کا رخ کرو اور اس سرزمین سے نکلو جہاں خونخوار بھیڑیے

چاروں طرف منڈلا رہے ہیں اور جن کی بیدردی نے مجھکو مخبوط الحواس بنادیا کامل تین رات سے میں اپنی اس جھونپڑی کو ڈھونڈھتی پھر رہی ہوں جس کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور اب اس کا نام ونشان تک نظر نہیں آتا۔

بچوں! تم ایک خانماں برباد بیوی، اور ایک ناشاد ماں کے مہمان ہو آکر میرے کلیجہ سے لگ جاؤ کہ ظالم تمکو دیکھ نہ سکیں، پیارے مہمانو، بھوکے پیاسے معصومو، میری چھاتی منہ میں لو، دودن کا رکا ہوا دودھ اتر آئے گا، تم ہی جیسا لال برسوں اس سرزمین پر میرے کلیجہ سے چھوٹا ہے، مجھ دکھیاری کو اپنی ماں سمجھو، گو مسلمان نہیں ہو، مگر صاحب اولاد ماں کی گود میں ہو، اس گود ماں کی گود جانو آؤ پیار و لپٹ جاؤ اور پیٹ بھر لو، متواتر فاقوں اور پے در پے صدمات نے مردہ بنادیا اور آن پوچھا ہے وہ وقت کہ جس بدنصیب کو ماں سمجھکر آئے ہو وہ تم جیسے پیارے معصوموں کو اس بیابان میں تنہا چھوڑ کر ختم ہو جائے،، بچو! خدا تمھاری عمر دراز کرے، زندہ رہو خوش رہو، بچ گئے تو شمال مشرق کے نخلستانوں میں جانا ہزاروں کلمہ گو انسان ایسے دیکھو گے جو مجھ سے بدتر حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں، جی کچھ تو میرا یہ پیغام جہاں جہاں جاؤ پہنچاتے جانا۔

"طرابلس مسلمانوں کے محتاج ہیں"

خاتون کے الفاظ یہیں تک پہنچے تھے کہ زیتون کے درخت پر جو سر پر تھا بلبل خوش الحان چہچہا کر اڑی اور یہ کہتی ہوئی چلی،

ملنے طرابلس و دہن پہاڑ میں چھپ جا۔ قزاق سر پر آپہونچے، بلبل بمشکل تمام چند گز پہنچی ہوگی کہ ایک ایطالوی مسلح جوان اس کے سر پر تھا، صبح کا سہانا وقت ظالم نشتر جدائی میں چھپ رہو، لیکن بہالی صورت دیکھتے ہی دیوانہ ہوگیا اور کہ

طرابلسی حسینہ! پچھلے جھگڑوں کو بھول جا اور خوش ہو کہ اب ایطالیہ کے ایک بہادر سپاہی کی محبوب بنتی ہے یہ کہکر جوان آگے بڑھا ہاتھ بڑھایا کہ نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے۔

خاتون:- خبردار! نابکار اگر ہاتھ لگایا ہوگا دور ہٹ، میرے سینے سے وہ دو لال چمٹے ہوئے ہیں جن کے سر پر کوئی والی وارث نہیں دور ہوجا سامنے سے مردود ازلی اب ایسا لفظ زبان سے نہ نکالیو۔

ایطالی جوان کا جواب وہ خنجر آبدار تھا جس نے دامن کوہ میں طرابلس کی سرزمین دو معصوم اور ایک مظلوم کے خون سے لال کردی۔

یورپ کا سنگدل آفتاب ان تینوں لاشوں کو دیکھ کر مسکرایا اور صبح کھلکھلا کر ہنس پڑی درخت، درختوں کے پتے ان بیگناہوں پر خون روئے چشموں نے ان پر آنسو گرائے پہاڑ نے اپنا سایہ کیا اور ہوا نے انکی لاشوں کو پنکھا جھلا۔

انسان اشرف المخلوقات ہے مگر طرابلس کے گدھ یورپ جیسے انسانوں سے بہت زیادہ مہذب اور صاحب فراست نکلے جسوقت ان کی جماعت ان معصوموں سے پیٹ بھرنے آئی ہے معصوموں کے چہرے اور مظلوم کی صورت دیکھ کر ان کا جی بھر آیا انہوں نے مل کر ایک کمیٹی کی ایطالیہ، اور ایطالیہ کے حمایتوں پر لعنت کے ووٹ برسائے اور ان تینوں لاشوں کو لیکر بیت المقدس پہونچے

آدھی رات کا وقت ہوگا کہ ان گدھوں نے یہ لاشیں صلیب عیسوی کے سامنے لاکر رکھیں میں نے غور سے دیکھا کہ صلیب ان بیگناہوں کی معصومیت پر لرز گئی اور اس کے اس حصہ سے جسکا رخ آسمان کیطرف تھا یہ الفاظ سنائی دئیے

"تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک"

حضرات و بیگمات آپ موجودہ حالات کا زیادہ رنج نہ کریں جو کچھ آپ کی آنکھ سے گذر رہا ہے برعکس ہزاروں اتفاقات کا جو انسانی دنیا کو (باستثنائے برطانیہ) یورپ کے ہاتھوں پیش آرہے ہیں نگاہیں نیچے کیجئے۔ اور دیکھئے یہ کارزار طرابلس آنکھ کے سامنے ہر نخلستان کے ہر حصہ سے نالوں کی آوازیں آرہی ہیں اور یہ تمام یورپ ہے جہاں ان نالوں پر قہقہے لگ رہے ہیں۔ "ایڈیٹر"

معاوضہ مضامین

پچھلے پرچہ میں ہم نے تمدن کی تقطیع اور ضخامت میں اضافہ کی تجویز ناظرین "تمدن" کے سامنے اس شرط پر پیش کی تھی کہ وہ توسیع اشاعت میں حصہ لیں اور اگر تمام خریدار نہیں تو کم از کم وہی حضرات جو باسانی ایک ایک دو دو خریدار فراہم کر سکتے ہیں ہمارے مرسلہ کارڈ خانہ پری کے بعد واپس کر دیں اس تجویز کا نتیجہ کیا ہوا اس کا ذکر فضول ہے البتہ وہ کرمفرما جو ہمیشہ سے تمدن کی اشاعت میں اعانت کر رہے ہیں اس موقع پر بھی غافل نہ ہوتے اور ہم ان کے اس خلوص کا شکریہ ادا کرنے کے بعد انکو یقین دلاتے ہیں کہ وہ انشاءاللہ عنقریب اپنے پرچہ کی تقطیع اور ضخامت میں اضافہ دیکھیں گے +

ہم اہل قلم حضرات کا جنھوں نے سال گذشتہ میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ آج پھر شکریہ ادا کرتے ہیں اور گو تمدن کی مالی حالت اس قابل نہ ہو لیکن اب ہماری رائے میں تمدن کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ محض مروت اور خوشامد سے مضمون حاصل کرے قابل نامہ نگار دماغ سوزی سے محنت سے تحقیق سے تکلیفیں اٹھا کر مضمون لکھیں اور تمدن اس کا معاوضہ لفظ شکریہ سے ادا کر دے۔ اس لیے ہم اس پرچہ سے یہ اعلان کرتے ہیں کہ آئندہ پانچ روپیہ سے پندرہ روپیہ تک کا ایک دو یا تین (معاوضہ ندرانہ ؛ شکرانہ) اہل قلم حضرت کی خدمت میں پیش کریں گے۔ جو کمیٹی اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ اس پرچہ میں کون سا مضمون کس معاوضہ کا مستحق ہے۔ اس کے ممبر

حضرات ذیل ہیں:-

ڈاکٹر شیخ مفتی محمد شرف الحق صاحب ایم-اے-پی-ایچ-ڈی-

پروفیسر محمد سعید صاحب ایم-اے-

مولوی سید اشرف حسین صاحب-

پروفیسر مشتاق احمد صاحب زاہدی-بی-اے-

ایڈیٹر-

نامہ نگار حضرات سے التماس ہے کہ وہ براہ کرم مضمون کے ساتھ ہی یہ بھی تحریر فرما دیں کہ وہ اپنے مضمون کا معاوضہ پسند کرتے ہیں یا نہیں کیونکہ ہماری دلی خواہش ہے کہ ہم کوئی ایسا مضمون سوا ان چند حضرات کے تمدن جن کا اپنا پرچہ ہے درج نہ کریں جس کا معاوضہ نہ دیا گیا ہو اور امید ہے کہ انشاء اللہ آپ اس اصول پر جلد کاربند ہوں گے +

لغات جدیدہ- مولوی سید سلیمان صاحب ماڈرن عربک پروفیسر دار العلوم نے اس کتاب میں تقریباً ان چار ہزار عربی الفاظ کی تشریح فرمائی ہے جو آجکل عربی میں مستعمل ہیں-

علاوہ عربی خواں طلبار کے استفادہ کے یہ کتاب خصوصیت سے ان حضرات کے واسطے مفید ہوگی جو عربی جرائد کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں- ہمیں امید ہے کہ مولانائے موصوف کی یہ محنت ملک و قوم میں وقعت سے دیکھی جائیگی قیمت عہ

مولانا صاحب سے ندوہ لکھنؤ کے پتہ سے مل سکتی ہے

وصل حبیب

ناول نہیں دلچسپ اداؤں کی ہے تصویر
رنگ اس میں کسی شوخ طبیعت کا بھرا ہے

یہ اخلاقی اور سچا ناول سید حبیب الحسن صاحب وکیل درجہ اول عدالتہائے ریاست بھوپال کی تازہ تصنیف ہے اس میں حسن و عشق کی سچی تصویریں نہایت خوبی سے دکھائی گئی ہیں۔ اور راز و نیاز کے ہو بہو فوٹو کمال صفائی سے لیے گئی ہیں۔ ناظرین۔ اگر پاکبازانہ عشق کی غیر متوقع کامیابی دیکھنا مقصود ہو تو اس کی زیارت کرو شریفانہ ضبط و تحمل کی تاثیر اور قوت دیکھنے کی تمنا ہو تو اسکو دیکھو۔ پردہ اور تعلیم نسواں کی حمایت مرکوز خاطر ہو تو اسکو مطالعہ کرو۔ عقد بیوگان کے متعلق دلچسپی ہو۔ اور زن بیوہ کمن اگرچہ عورت کی اصلی تعبیر دریافت کرنا چاہو۔ تو اسکو ملاحظہ کرو۔ طوائفوں کی فطرتی سرشت کردار بد کا بد انجام دیکھنا ہو۔ تو اسکو پڑھو دوستی کے فرائض اگر معلوم کرنا ہوں تو اسپر نگاہ ڈالو۔ ضلع آشٹہ کے سی سالہ بندوبست منعقدہ ۱۹۰۵ء کے تاریخی واقعات کی جستجو ہو۔ تو اسکی سیر کرو۔ زبان کی نفاست۔ بیان کی سلاست۔ ترکیب کی درستی عبارت کی چستی۔ فقرات کی برجستگی۔ مکالمہ کی شوخی علم کی حفاظت۔ تہذیب کی روک تھام۔ تمناؤں کا ہجوم حسرتوں کا اژدھام۔ قابل دید ہے مصنف نے کمال کیا ہے۔ کہ درد دل کو لفظوں میں بھر دیا ہے اسکی خوبی کا اندازہ کہنے سننے کے متعلق نہیں۔ دیکھنے اور سمجھنے کے لائق۔ لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ درجہ کا حجم ۲۴۰ صفحہ بااین ہمہ بخیال اشاعت قیمت ہر دو حصہ صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول ڈاک۔ رعایتی قیمت عہ علاوہ محصول ڈاک

المشتہر مہتمم کتب خانہ حبیبیہ۔ ڈاکخانہ گوہر گنج ریاست بھوپال

جلد (۲) مئی ۱۹۱۲ء نمبر (۶)

تمدن

معاشرتی۔ تمدنی۔ ادبی۔ فلسفی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور علمی مضامین کا
مخزن

ایڈیٹر۔ محمد عبد الراشد الخیری۔ شیخ محمد اکرام

فہرست مضامین:

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری

قیمت سالانہ قسم اول ... قسم دوم ... تمدن پریس دہلی میں چھپکر شائع ہوا قیمت فی پرچہ ...
کتبہ احقر ...


اسماعيل باشا

تمدن

عم مغفور و استاد مرحوم

بے نظیر تھیں اور لاجواب، بے مثل تھیں اور نایاب، وہ پاک اور صاف روحیں، جو عالم حیات میں بہ شکل بشاش آئیں، شاداں و فرحاں رہیں، اور یک لخت دنیا سے رخصت ہوئیں، دنیا ان کے فراق ابدی پر خون روئی، آسمان و زمین انکی موت پر بیتاب ہوئے، زندوں نے انکا ماتم اور مردوں نے انکا غم کیا، اپنوں نے سینے پیٹے، غیروں نے آہ اور سننے والوں نے واہ کی،

انکی رخصت عزیزوں کی بربادی، انکا کوچ، دوستوں کی بدنصیبی اور ان کی موت قوم کی موت تھی۔

یہ متبرک صورتیں کیا تھیں؟ کیا ہوگئیں، اور کیا کرگئیں، یہ وہ لوگ تھے جن کے وجود پر دنیا ناز کرتی رہی اور طبقہ انسانی تادم بقا ان کے نام سر آنکھوں پر رکھے گا، جن کی تقریریں بیہوشوں کو ہشیار، جنکی تحریریں بے خبروں کو خبردار کرگئیں، ہنستوں کو رولانے، اور سوتوں کو جگانے والے، آج خود منہ سر لپیٹے جنگل بیابان میں پڑے ہیں،

مئی ۱۹۱۲ء کی تیسری رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے عم مغفور استاد مرحوم شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی کہا ہوا ہی غسل و کفن ہو چکا صبح کو منتقل راہ و وقوں کی یہ ہے کہ یہ نورانی صورت ہمیشہ ہمیشہ کو زیر زمین ہو جائیگی۔

دست اپنی منزل طے کر رہی ہے آسمان تاروں سے پاٹا پڑا ہے اور وہ گھر جس میں ہر وقت شیر و شکر رہا تھا سنسان پڑا ہے ہوا کے ٹھنڈے ہوگئے کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کے نعرے لگا رہے ہیں اور بدنصیب اس منہ کو تکتا ہے جس سے پھول جھڑے اور اُن آنکھوں کو دیکھتا ہے جنکو ظالم موت ہمیشہ کو بند کر گئی۔

جسد خاکی سے رخصت ہونیوالی روح! اپنے ادنیٰ خادم کا آخری سلام قبول کر لیتی جا مقدس روحیں تیرے استقبال کو آئی ہیں محبت بھری نظروں سے میرے سلام کا جواب دے اور جلدی پہنچ جا۔

آج نواب مرزا داغ دہلوی [illegible] عالم ارواح [illegible] جن کے نام صفحۂ دنیا پر چمک رہے ہیں اس مجلس کی رونق بڑھا رہے ہیں اور جھوم جھوم کر اس شعر کو ادا کر رہے ہیں جو آج سے تقریباً چند برس پہلے مولانا [illegible] مرحوم نے سرسید کی شان میں کہا تھا۔

اسے دیکھی سر پر ہاتھ رکھ کر قوم بدقسمت اور اسکو دیکھیگا جو کوئی جیتا رہا باقی

عالم خیال استاد مرحوم کے طفیل آج ان مقدس صورتوں کی زیارت کر رہا ہے جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں۔ اہل قلم کی یہ بزرگ جماعت مرحوم سرسید کی صدارت میں عالم ارواح سے حالی پاک روح کے استقبال کو آئی ہے جس کی قومی خدمات کا ڈنکا آسمان تک بج رہا ہے [illegible] کے مہکتے ہوئے پھول ان کے مبارک ہاتھوں میں ہیں اور ملاء اعلیٰ کے بسنے والے [illegible] کے نعرے لگا رہے ہیں۔

(۲)

موت یا فراق ابدی، امیر و غریب [illegible] ہندو مسلمان ہر ایک کا قابل افسوس ہے مگر شمس العلماء مولوی نذیر احمد کی موت [illegible] سے ایک ایسی بزرگ کو جدا کر گئی جسکی نظیر آئندہ دنیا مشکل سے پیدا کرے گی [illegible] مرحوم کب پیدا ہوئے کہاں کے تھے کیا سیکھا کس سے سیکھا یہ پھر بھی اس وقت [illegible]

ابھی تو زبان سے یہ لفظ نکلنے کو جی نہیں چاہتا خدا نہ کرے کہ مقدس استاد کا سایہ سر سے اٹھ جائے مگر کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْت ۔ رشد اور رشدکیات تمدن و تو تیم ہو گئے

جو آنکھیں مولانائے مرحوم کی تحریر کا لطف اٹھا چکی ہیں اور جو کان مولانائے مغفور کی تقریر کا مزا لوٹ چکے ہیں وہ شاہد ہیں اس امر کے کہ شمس العلما مولانا نذیر احمد کی نظیر کا ل ایک صدی میں بھی زمانہ پیدا نہ کر سکا۔ زندہ ہیں وہ سماں دیکھنے والی آنکھیں کہ مولانائے مرحوم کی تقریر پر کس برسے کبھی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں اور کبھی ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

استاد مرحوم کا وطن گو ضلع بجنور تھا اور دلی میں جس وقت تشریف لائے تو تین پندرہ سولہ سال کے قریب تھا زبان کو جو کچھ ماں کی گود سے لینا تھا لے چکی تھی مگر مولانائے مرحوم نے دلی کی زبان اس طرح حاصل کی کہ اردوئے معلّٰی کا مزہ آ گیا۔ سرزمین جہان آباد اس زبان پر ابد الدہر ناز کرے گی جو مغفور کے ساتھ قبر میں دفن ہو گئی۔

اب علی مدتوں شمس العلما مولوی نذیر احمد پر حسرت کے آنسو بہائیگا اور قوم ہمیشہ مولانائے مرحوم کی بیش بہا خدمات کی ممنون رہے گی۔

پنجابی کٹرہ جو دلی نے ریلوے سٹیشن پر اس طرح قربان کیا کہ آج اس کا نام و نشان تک نہیں۔ میرے آباؤ اجداد کا مسکن تھا اور پنجابی کٹرہ کی وہ مسجد جس میں میرے جد امجد مولوی محمد عبد الحق صاحب حدیث کا درس دیتے تھے طلبا کا دار القیام ۱۸۵۷ء یا اس کے لگ بھگ کا ذکر ہے کہ علامہ موصوف تحصیل علوم کی غرض سے اس مسجد میں داخل ہوئے گو اقبال کا ستارہ پیشانی پر چمک رہا تھا مگر افلاس کی مصیبت سر پر لوٹ رہی تھی تاہم شوق علم [illegible] شانت [illegible] نہ دیتا تھا۔

[illegible] دنوں [illegible] میری [illegible] سے عقد [illegible] تحریک پیش ہوئی۔ اسکے

لڑکوں کی باتیں ان سب لوگوں کو سنا دیں - بڑی بڑی درخواستیں موجود تھیں
اور [illegible] مولوی زادی کی پالکی دروازہ پر اتروا لیں مولانا نے مرحوم کی
[illegible] واقعہ رہا اور کیا دوست آشنا کسی کا وہم و گمان بھی نہ تھا اور ہوتی بھی
[illegible] طالبوں کی صلوں سے ہوتے ساتھی ایک پردیسی
طالب علم لوگوں پوچھتا پھرتا ہے کہ مولوی عبد الحق صاحب مرحوم سے
سامنے [illegible] پیش [illegible] غرض کس [illegible] سب کے لوگ اور کیسے
صابر و شاکر بندے تھے مولوی صاحب مرحوم کیا [illegible] جس شخص میں یہ
تین صفتیں ہوں [illegible] کا پابند معاملہ کا اچھا اور زبان کا سچا۔ امید اور تمیز
تو ایک ہی [illegible] کو وسیع کیا تو لگا دو مولانا
مغفور [illegible] مولوی عبد الحق صاحب مرحوم اور مولوی نذیر احمد صاحب
مغفور دونوں [illegible] مولوی عبد الحق صاحب مرحوم جیسے جید
عالم [illegible] کا [illegible] دینا [illegible] استاد مرحوم ہی
کا کام تھا [illegible] شادی کا ذکر [illegible] کرتی
تھیں [illegible] دیکھا کرتا یا جامہ سفید
تھا ٹوپی بھی [illegible] ایک عورت کے ہاتھ
پیچھے سے ایک [illegible] پوتے
چار [illegible] لائی [illegible] آتی ہے۔

یعنی [illegible] مرحوم [illegible] سلیم
[illegible] طالب علمی سے [illegible]
[illegible]
[illegible]

زمانہ کے لوگ انتظام آنا معقول کہ تیل کی ایک بوند بھی ضائع نہ ہو اور شوق ایسا بڑھا ہوا کہ چراغ ٹمٹما رہا ہے تیل نظر گیا رات کہیں کی کہیں پہونچی مگر سبق یاد کیے بغیر سونے کو جی نہیں چاہتا۔ مولانا نے مرحوم اکثر فرماتے تھے مدرسہ میں سناٹا ہوتا تھا سب پڑے سوتے تھے اور میں چراغ کے آگے اپنا سبق یاد کرتا ہوتا تھا۔

یہ تھا وہ ذوق و شوق تعلیم و تربیت اور فیض صحبت جس نے مولانائے مرحوم کو انسانیت کے پورے جواہرات سے مزین کرنے کے بعد ان کا اسم گرامی آسمان ادب پر قمر چہاردہم کی طرح چمکا دیا۔

مجھے اسوقت استاد مرحوم کی قابلیت ملازمت احسانات خدمات کسی سے بحث نہیں البتہ کچھ کہنا ہے اس کتاب کے متعلق جو "امہات الامہ" کے نام سے مشہور ہوئی اور جس پر بحث کرتے ہوئے بارہ مئی کے روزانہ پیسہ اخبار میں مولوی سید احمد صاحب نے ان لوگوں کو جنہوں نے محض اغراض نفسانی کی وجہ سے اس کتاب کی مخالفت کی نہایت معقولیت سے جواب دیا ہے۔

مولانا نے مرحوم قبر میں جا سوچے اور مجھکو پوچھنا ہے مگر میں شاہد ہوں اس امر کا کہ گذشتہ دس سال میں مرحوم کی زبان سے کلام ربانی کی کبھی کوئی آیت اس طرح نہ نکلی کہ آنکھ سے آنسو نہ گر رہا ہو۔

ناظرین تمدن کو وہ مضمون یاد ہو گا جو مئی ۱۹۱۱ء کے پرچہ میں "انسان فرشتہ کی عینک سے" کے عنوان سے شائع ہوا یہ مضمون جب مولانائے مرحوم نے سنا چہرہ سرخ ہو گیا بدن کانپ رہا تھا۔ ناخوش ہوئے اور میرے سامنے ایک مختصر سا مجمع شروع کیا وہ وقت میری آنکھ کے سامنے ہے کہ رسالت مآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام آتے ہی ان کی حالت بدل گئی زار و قطار رونے لگے اور مجھ سے [illegible]

[illegible]

صورت نہ دکھانا +

وہ شخص جو اسلام اور بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا شیدا تھا کیا اس صلہ کا مستحق تھا کہ علمائے اسلام فتوے دیں کہ اس کے جنازے کی نماز درست نہیں +

نتیجہ الامر یہ ہے کہ امہات الامہ وہ کتاب تھی کہ نہ آج مسلمانوں میں کوئی ایسا نظر آتا ہے نہ آیندہ برسوں نظر آنے کی امید ہے کہ غیر مسلموں کے سامنے اس تمانیت سے پیغمبر اسلام صلعم کی رسالت کو ثابت کر سکے اور مسلمانوں کے واسطے اتنا لٹریچر مہیا کرے جو امہات الامہ میں ہے۔

قوم کی بدقسمتی ہے کہ علامہ بنگالی نے امہات الامہ کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی خواہش ظاہر کی اور یقیناً وہ [illegible] سوسائٹی میں اجازت حاصل کر لیتا مگر علامہ موصوف کی موت نے تکمیل نہ ہونے دی۔

بعض اخباروں کی رائے ہے کہ مولانا مرحوم کو جب یہ معلوم ہوا کہ علماء اسلام اس پر معترض ہیں تو کتاب ان سے حوالہ کر دی قطعی غلط ہے۔ جس طرح یہ کتاب حاصل کی گئی اور جو اس کا حشر ہوا اس کا خیال تکلیف دہ ہے۔ انتقال سے چند روز پہلے جب میں نے امہات الامہ کی اشاعت کے واسطے عرض کیا تو خاموش ہو گئے مگر میرا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ صورت چند روز کی مہمان ہے۔ ایک بار مجبور کیا تو کہ بگڑا نسخہ کی خوشامد کی آخر مولوی رحیم بخش کو بلا کر کہا کہ کوئی جلد مل سکتی ہے انہوں نے جواب دے دیا تو فرمانے لگے کہ بیٹا جانے دو ایسے نازبردار بزرگ ایسے تنگ ہیں اب کہاں میری التجا حد سے بڑھ گئی تو چار روز رات کتاب تلاش کی آخر ایک جلد بمشکل تمام دستیاب ہو سکی [illegible] رات کا وقت تھا

کہ مجھکو طلب فرمایا کتاب دی اور حکم دیا کہ اپنے ہاتھ سے اسکی نقل کرلو اور تکمیل کے بعد مجھکو سنا دو۔ ڈھائی ڈھائی سو روپیہ تک سے خریدار ایک ایک جلد کے موجود ہیں ایسا نہ ہو کہ کتاب تلف ہو جائے۔ میں نے مارا مار کتاب نقل کی لکھکر حاضر ہوا۔ مِن سب ترمیم اور تغیر و تبدل کے بعد وہ بیش بہا اوراق اب میرے پاس ہیں۔ لیکن مجھ جیسا گوشہ نشین جو داخل شدہ ضمانت ہی کے واسطے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا ہے۔ مخالفین کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے البتہ کتاب میرے کلیجے سے لگی ہوئی ہے اور اگر اس کی اشاعت میرے ہاتھوں ہوگئی تو یہ کہونگا۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

استاد مرحوم کے مفصل حالات جو کچھ لکھ سکتا ہوں آیندہ پرچوں میں لکھوں گا۔ سردست وہ چند الفاظ امہات الامہ کے دیباچہ سے نقل کرتا ہوں جو بتائیں گے کہ شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب نے یہ کتاب کیوں لکھی۔

باقی آیندہ — راشد الخیری۔

"مدت کئی برس ہوئے گوڑگانوے کے ایک پادری صاحب نے مذہبی مناظرے کے پیرایے میں حد اعتدال سے بڑھی ہوئی آزادی عمل میں لاتے کہ اپنے ایک رسالے میں پیغمبر آخر الزمان صلعم کی نسبت آپکی بیبیوں کے بارے میں بڑی زبان درازی کی جس سے جمہور مسلمین کی دل آزاری ہوئی مسلمان جگہ جگہ استغاثہ فوجداری کی تیاریاں کرنے لگے اور جگہوں کا حال تو معلوم نہیں دلی سے کچھ لوگ فریاد لیکر شملے گئے پادری صاحب کی کتاب کی تمام اشاعت بند کر دی گئی۔ اسی اثنا میں سر سید احمد خاں"

"مرحوم مغفور بھی پادری صاحب کی کتاب کا جواب لکھ رہے تھے"
[illegible] تعجب ہے ہم نے پایا تھا کہ سید صاحب انتقال فرما گئے"
"ہم نے نہ تو پادری صاحب کی کتاب دیکھی نہ سید صاحب کا"
"ادھورا جواب۔ مگر یہ بات پہلے سے معلوم ہے کہ پادری"
"صاحب نے سخت زبانی کے سوا اعتراض میں کوئی نئی بات"
"نئی طبیعت تو ایجاد کی نہ ہوگی۔ اعتراض تو نہیں مگر جواب"
"خود قرآن میں موجود ہے ولقد ارسلنا رسلا من قبلک"
"وجعلنا لهم ازواجا وذریة [illegible]
"نزول قرآن [illegible]
"[illegible] تعلقات [illegible]
"تعلقات کی وجہ سے جناب رسالت مآب [illegible] کے مناکحت"

غرض پرانا اعتراض ہے اور [illegible] معلوم ہے"
"دندان شکن جواب بھی [illegible] مسلمانات ہو کر اپنے پیغمبر"
"کے تقدس کی اپنے مقتدر رہبر اور اپنے طور پر واجبی حمایت"
"کیے بدون ہم سے نہیں رہا جاتا اور [illegible] ہے کہ اعتراض"
"کسی مسلمان کے کان میں پڑے اور اس کو جواب نہ ملتا"
"ہو اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تقدس کی نسبت"
"خیال فاسد موہوم ہو کر دل میں بیٹھ جائے تو ایمان کے"
"جاتے رہنے کا خوف ہے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

(ماخوذ از امہات الامۃ)

اپنا ترانہ

مٹے گا کارنامہ صفحۂ ہستی سے کب اپنا / رہیگا [illegible] میں [illegible] اپنا
زباں کھلتی نہیں لیکن بہ حسرت ہی کہ اکثر / سناتے ہیں ابھی تک قصۂ [illegible] چشم اپنا
یہ عالم تھا کہ اک اک [illegible] کانپ جاتی تھی / جہاں ہم کھینچ لیتے تھے ہلال [illegible] اپنا
کبھی مشکل سے [illegible] مشکل کو ہم سمجھتے نہیں مشکل / نکل جاتا تھا آسانی سے ہر [illegible] اپنا
سمجھتے تھے [illegible] وقت [illegible] / مراد [illegible] منزل پہ [illegible]
[illegible] / [illegible] جام جم اپنا
[illegible] / [illegible] محترم اپنا
[illegible] / [illegible] کس طرح [illegible] قلم اپنا
[illegible] وقت [illegible] / [illegible] اپنا
[illegible] / [illegible]
[illegible] / [illegible] اپنا

رکھا کیوں ہم نے تکیہ غیر کی امداد پر / کیا [illegible] اپنے ہاتھوں ہم جو کچھ تھے [illegible] اپنا
یہ واجب تھا کہ آپ اپنی مکافات عمل کرتے (قطعہ) / یہ لازم تھا کہ [illegible] اپنے بستر اپنا

تقاضا اب حیا کا ہے یہ بیٹھا [illegible] ہم پہ / سنائیں کیوں [illegible] اپنا
پڑے [illegible] کو کیا غیر سمجھیں گے ، ذرا سوچیں / کسی کے قلب [illegible] اپنا
بہت کچھ ہو چکی اس ہو کے میں اب عہد کر لیں ہم / نہ سمجھیں گے [illegible] غیر کو ہم اپنا
نچھوڑیں گے کبھی اب نام کو غیروں کے [illegible] / بھریں گے دین کا دم جب تک باقی ہے دم اپنا

کسی کے سامنے جھکنا تو سیکھا ہی نہیں ہم نے
فقط اللہ کے آگے ہی سر رہتا ہے خم اپنا

بگڑنے پر بھی ہے ہم میں ابھی پہلا اثر باقی
طبیعت بجھ گئی، لیکن نہیں ہے جوش کم اپنا

ابھی تک ہم میں کچھ اسلام کی پاکیزہ خصلت ہے
ابھی تک خون پسینا سے ملتا ہے شیم اپنا

نہ محسن کش نہیں ہیں، حق شناسی اپنا شیوہ ہے
وفاکیشی ہی دستور العمل کہتے ہیں ہم اپنا

دغا و کینہ و بغض و حسد عادت نہیں اپنی
دماغ اپنا وہی ہے، گو نہیں عیش و نعم اپنا

ہیں اب محکوم، حاکم سے وفادارانہ ملتے ہیں
تھے جب حاکم، رہا محکوم پر دست کرم اپنا

ہمارا پوچھنا کیا، یاں تو دونوں ٹھاٹھ دیکھے ہیں
یہاں سارا جہاں اپنا، وہاں باغ ارم اپنا

یہ ہو سکتا ہے اب بھی پھر ہمیں اقبال و دولت ہو
یہ ممکن ہے کہ واپس پائیں پھر جاہ و حشم اپنا

اگر اللہ نے چاہا تو کل افراد عالم کو
دکھا دیگی اثر پھر سطوت خیر الامم اپنا

جہاں اڑ جائینگے، اڑ جائینگے ہم پھر نہ کھسکینگے
جہاں جم جائیگا، جم کر نہ اٹھیگا قدم اپنا

جہاں جائیں گے جھنڈا گاڑ دینگے اپنی سطوت کا
کوئی کیوں ہم کو روکیگا، عرب اپنا عجم اپنا

فلک تک گونج اٹھیگا نعرہ اللہ اکبر سے
تمنا جوش میں جس دن اٹھالیں گے علم اپنا

انشاء اللہ المستعان

تمنا عمادی پھلواری عظیم آبادی

لہ ۲ہ شِیَم اور نِعَم صیغہ جمع ہے۔ مگر بطور واحد استعمال کیا گیا۔ کیونکہ اہل اردو فارسی کے متتبع۔ اور اہل فرس کا یہ دستور رہا ہے کہ عربی کے صیغہائے جمع کو واحد قرار دیکر اوسے واحد کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اور بوقت ضرورت پھر اوسکی جمع بناتے ہیں جسکو عوام جمع الجمع سمجھتے ہیں حالانکہ وہ جمع واحد قرار پاکر پھر جمع بنی ہے اسکی مثال اساتذہ کے کلام میں بہت ملتی ہے۔ وُجُوہ، حُور، غِلمان، اُمرا، اَحوال، صِفات وغیرہ کو اسی پر قیاس کرنا چاہیے کما لا یخفی علی المہرۃ ۱۲ تمنا عمادی عفی عنہ

حارث

(سلسلہ کے لیئے مارچ کا تمدن ملاحظہ ہو)

(۲)

ساقی بیار بادہ کہ آمد زمانِ گل
تا بشکنیم توبہ دگر در میانِ گل

اب میرا انتشار دور ہوچکا تھا، میری پریشانی جاچکی تھی، اور میں مطمئن تھا کم از کم اس قدر مطمئن تو ضرور تھا کہ مکان دار کا کرایہ کل ہی ادا کردوں گا، اور ابھی کسی عمدہ ریسٹوران میں جاکر کھانا کھاؤں گا۔ کچھ بھی ہو، ایک آدھ مہینہ کے لیے معین کی نہیں، نہیں، بفیلو کی بھیجی ہوئی رقم کافی تھی، گویا ایک مہینہ تک نان نفقہ کی فکر سے چھوٹ کر ترقی کے لیے ایک مرتبہ اور جدّوجہد کرنے کی مہلت مل گئی تھی! اب میں پھر بے خوف تھا، بے پروا تھا، مستقل مزاج تھا؛ کوئی وجہ نہ تھی کہ اب میں بقیہ دونوں خطوط جو میز پر میرے سامنے رکھے ہوئے تھے اطمینان کے ساتھ نہ پڑھوں! میں اب ہر قسم کی خبر، بُری سے بُری، پڑھنے کے لیے تیار تھا؛ مجھے یقین تھا کہ دلخراش سے دلخراش واقعہ کی اطلاع بھی اب مجھے بدحواس نہیں کرسکتی! نہایت بے پروائی کے ساتھ پہلے میں نے وہ خط اٹھایا جس کا لفافہ کسی قدر لمبا تھا اور جس کو میں قطعی نہیں سمجھا تھا کہ کہاں سے آیا ہے؟ میں نے اسکو کھولا اور پڑھنا شروع کیا؛ اس کا نیلا لفافہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر گرا، میرے تمام جسم میں ایک غیر معمولی گرمی محسوس ہوئی، اور میرا سانس نہایت سرعت کے ساتھ آنے لگا! میں نے

اوّل سے آخر تک اس ناقابل یقین خبر دینے والے خط کو پڑھا کئی مرتبہ بغیر اصلی مطلب سمجھے پڑھا۔ پہلے میں اس کا مفہوم سمجھا۔ نہیں نہیں، بلکہ یکایک ایک جملہ [illegible] اس کا مفہوم میرے ذہن میں آگیا، میرے دل میں [illegible] میرے [illegible] پر چھا گیا۔ ایسا جو کچھ میں نے پڑھا صحیح تھا؟ ناممکن قطعی ناممکن! ایسا [illegible] ہے؟ ... [illegible] تو اتفاق کسی نے میرے ساتھ [illegible] کیا ہے [illegible] سے ساتھ تحریر کا اصلی مفہوم ہونا حد سے زیادہ حیرت انگیز تھا ... دولت اس قدر اندھی ہے؟ ... کسقدر اندھی تو ضرور ہے ورنہ تمہارے جیسے [illegible] کے پاس کبھی ہرگز نہ آتی! تاہم بالکل اندھی نہیں ہے اس درجہ پاگل نہیں ہے! غلط! بالکل غلط! ... مگر خط بھی جعلی نہیں سمجھا جا سکتا اس کا کاغذ اسی خاص قسم [illegible] کا چھپا ہوا تھا! اس کی سفید مہر وہی ابھرے ہوئے طریقے کی تھی! ... وہ [illegible] معلوم ہوتا تھا! قسم ہے ان تمام فرضی اور خیالی تقدیروں کی جو ان پر حکمرانی کرتی ہیں، وہ اصلی تھا!!

اپنے پریشان خیالات کو نہایت کوشش کے ساتھ جمع کرکے میں نے ایک دفعہ اوّل سے آخر تک پڑھا! عبارت صاف تھی، الفاظ خود بول رہے تھے مطلب مجسم متحرک تھا، میرے دماغ میں غیر معمولی بوجھ ہوگیا تھا، میں غالباً پاگل ہوتا جاتا تھا! اگر یہ خبر سچی ہے ... اور وہ ہر طرح سچی معلوم ہوتی تھی ... [illegible] مجھے بخار سا چڑھتا آتا تھا، میرے سر میں ایک شعلہ سا روشن ہوگیا تھا، میں زبردستی اپنی پوری کوشش کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا ہاں ... اگر یہ خبر سچی ہے تو؟ تو میں دنیا کا مالک ہوں، تمام عیش و عشرت کا حاکم ہوں، جو کچھ میرا جی چاہے، وہ ہوں! ... خط کے کاغذ پر رجسٹر نمبر وغیرہ ہونے کے علاوہ جالندھر کی مہر تھی اور بالکل صاف صاف انگریزی میں

لکھا ہوا تھا :-

"مسٹر! آپ کے متوفی چچا مسٹر داراشکوہ کا پچاس لاکھ روپیہ ہمارے بنک میں جمع ہے! جن کا انتقال غالباً آپ کو معلوم ہوگا ایک مہینہ ہوا کہ بعارضۂ دق ہوگیا! چونکہ اس وقت تک ان کا کوئی وارث سوائے آپ کے معلوم نہیں ہوا! اس لئے یہ روپیہ بذریعہ وراثت آپکا ہے! امید ہے کہ آپ اس کو اپنے نام باقاعدہ منتقل کرالیں گے، یا جو کچھ پسند فرمائیں اس سے مطلع فرمائیں گے بہتر ہوگا کہ آپ بجائے ہمکو براہ راست لکھنے کے ہمارے بنک کے ہیڈ آفس واقعہ بمبئی سے خود تشریف لیجا کر ہر ایک معاملہ طے کرلیں! ہم نے آپ کا حساب کتاب اور کل روپیہ بمبئی ہیڈ آفس میں منتقل کردیا ہے! اطلاع میں تاخیر محض آپ کا صحیح پتہ دریافت کرنے کی وجہ سے ہوئی!"

آپکا صادق ..... منیجر برانچ جالندھر
بنک آف ..... بمبئی "

پچاس لاکھ! پچاس لاکھ نقد! اور میں! میں - ایک بیکس، مفلس، فاقہ مست، ذلیل اخباروں پر پیٹ پالنے والا - میں اور چشم زدن میں پچاس لاکھ کا مالک! جلدی جلدی آنیوالے لمبے سانسوں کے ساتھ میں کوشش کررہا تھا کہ اس واقعہ کو - سچے واقعہ کو - اپنے دل نشین کروں، مگر اب تک ناکام تھا! یہ خوشخبری - دل و دماغ میں عجیب چوند پیدا کردینے والی سچی خبر - میری آنکھوں میں خواب خرگوش نظر آتی تھی، یہ اچانک موت - مجھے آسمان عروج تک پونہچا دینے والی مبارک موت - ہر طرح میرے ہوش کے غلبہ سے

بگڑ جانے والے دماغ کا پریشان خیال معلوم ہوتی تھی جو شیخ چلی کے پلاؤ کی طرح خود بخود ذہن میں آگئی ہو! میں نے کسی قدر اطمینان حاصل کرنے کے لیے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ذلیل اور کم حیثیت اسباب! ٹوٹی پھوٹی انگیٹھی! میلا کچیلا لیمپ! انچی اور جھلنگا چارپائی! ایک ایک چیز مفلسی اور ناداری کی زندہ تصویر! اور پھر پچاس لاکھ کی مبہوت بنا دینے والی خبر! ناداری اور تموّل، احتیاج اور استغنا! ناقابل تشبیہ اجتماع الضدین! میں بے آپے تھا! میں ہکا بکا تھا، اور میں بغیر سوچے سمجھے آپ ہی آپ پوری آواز کے ساتھ قہقہے لگا رہا تھا!۔

اندھی دولت! اندھی دولت اور اُسکا اندھا نزول! میں ـ تمام دنیا کو چھوڑ کر صرف میں ـ اس نعمت غیر مترقبہ کے لیے اوّل درجہ کی نامزد نیت کیساتھ منتخب کیا گیا! بس تو اب ؟ . . . . اب میری باری ہے! قسم ہے تمام مذاہب کے نت نئے معبودوں کی اس سوسائٹی کو ـ اس مغرور، اس اکھڑ، اس ناقدرشناس سوسائٹی کو ـ تھوڑے ہی عرصہ میں ناک چنے نہ چبوا دوں تو سہی! قاہ، قاہ، قاہ، ! پہلے کی طرح بغیر سوچے سمجھے محض اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے میں نے پھر قہقہہ لگایا؛ مگر فوراً کسی اور نے بھی میرے جواب میں آواز کے ساتھ قہقہہ مارا! میں نے اپنے خیالات کو روک کرنے کی کوشش کی! ہوا کے جھکڑ کی پریشان کرنے والی سنسناہٹ برابر آ رہی تھی، باہر کے برآمدے پر مینہ کی بوندیاں ٹپ ٹپ پڑ رہی تھیں، اور سڑک کے دوسری طرف والے مکان میں کوئی شخص نہایت سُریلی آواز میں گا رہا تھا

ساقی بنور بادہ برافروز جام ما"
مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما

خود مزے سے لیکر گار رہا تھا ! بس ، اور کوئی آواز نہ تھی ! اگر اب بھی میں سخت سے سخت قسم کھانیکو تیار ہوں کہ میں نے کسی کے پورے قہقہے کی آواز اپنے قریب سے ہی سُنی تھی ! خیر میں اُس وقت بدحواس تھی ! یہ سب کچھ قوّتِ متخیلہ کی کارگزاری تھی ! مگر۔ مگر محسن ، پیارے بفیلو ! میں اس عنایت بھری امداد کا بیحد ممنون ہوں ! بہت جلد تمہارے ڈھائی سو روپے مع اور ڈھائی سو کے یعنے المضاعف ، جسکو تم سود سمجھو یا احسانمندی کا اعتراف ۔ بذریعہ منی آرڈر تمہارے پاس پہنچتے ہیں ! اور ؟ اور تمہارا وہ میسیناس ۔ علم اور تموّل کی پوٹ جس کو تم ازحد ہمدردی کے ساتھ میری امداد کے لیے بھیج رہے ہو ۔ اب محض بیکار ! میرے غمخوار بفیلو اب مجھے کسی مددگار ، کسی غمگسار ، کسی سرپرست کی ضرورت نہیں ! میں یہ سب آسانی کے ساتھ مول لے سکتا ہوں ! عزت ، خطابات ، پوزیشن ، سب بازار میں فروخت ہوتے ہیں ! محبت ، دوستی ، عشق ، ہر ایک چیز سب سے بڑی بولی پر ہر کس و ناکس کے نام چھوٹ سکتی ہے ! میں سب کچھ حاصل کرسکتا ہوں ، نہایت آسانی کے ساتھ خرید سکتا ہوں ! بس ۔ اب کوئی وجہہ

ؔ میسیناس C. Cilnius Maecenas آگسٹس (رومن شہنشاہ) کے زمانہ میں اس کے دربار کا ایک معزز مدبر تھا اس کا دروازہ ہر علمی قابلیت اور دماغی لیاقت والے کیلیے رات دن کھلا رہتا تھا ! ہوریس Horace اور ورجل Virgil کا خصوصیت کے ساتھ دوست اور مربی تھا ! وہ ہر لائق اور طبّاع شخص کی پوری امداد اور سرپرستی کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ! اپنے اِسی وصف کے لیے وہ زبان زد خلائق ہو گیا ۔ مرنے کے بعد اس نے اپنا نام زندہ چھوڑا ! اب میسیناس ہر ایسے شخص کو کہتے ہیں جو بالفاظ دیگر علم دوست حاتم وقت ہو ! (جوش)

نہیں کہ میں اس ذلیل ناپاک گوشہ تنہائی میں قید رہوں! سب سے پیشتر مجھے کسی اعلیٰ سے اعلیٰ ہوٹل میں کھانا کھانا چاہیئے!

جوشِ مسرت و نشۂ دولت: جنوں کا غلبہ! پچاس لاکھ کی ملکیت کا احساس! میں فوراً کمرے کے باہر [illegible] رکھتے ہی خدا کا [illegible] تیز و تند جھونکا مینہ کی بوچھاڑ لیے ہوئے نہایت زور و شور کے ساتھ اندر گھسا اور میرے ہٹتے ہٹتے، کسقدر میرے پانوں کو ما بدولت کے زیادہ پیارے ناول کو (جو اسی جگہ پڑا تھا جسے تھوڑے عرصہ پیشتر بہجوم یاس و ناامیدی میں پھینک دیا تھا) بھگو گیا! میں نے فوراً اس کو اٹھا لیا، جھاڑا، اور دیکھنے لگا! ہائے اس کی کیا صورت ہوگئی؟ [illegible] جگہ جگہ سے خراب ہوگیا! [illegible] مشتہر کر سکتا ہوں [illegible] [illegible] تک [illegible] سکتا ہوں [illegible] [illegible] نام [illegible] کے ہندوؤں سے [illegible] ہوں نے میری [illegible] میری دماغی محنت کی [illegible] کی [illegible] پڑا ہوا تھا! [illegible] خوشی سے [illegible] آپے [illegible] تھا!

چند ہی برس بعد پانی سے ہوا کا سناٹا [illegible] موجود تھا۔ اب وقت میں کمی ہو جانیکی وجہ سے سڑک سنسان ہوگئی تھی، اور سامنے والے مکان میں سے ہارمونیم پر گانیوالے کی آواز صاف آرہی تھی:-

"ما در پیالہ عکس رخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما"

خلافِ توقع بارش نے مجھے پھر روک لیا۔ اور سچ یہ ہے کہ میری بھوک کی ہی

اب عجیب کیفیت تھی کبھی تو شعلۂ جوع یکایک بھڑک اُٹھتا تھا، اور کبھی۔ میں نہیں جانتا کیوں۔ خود بخود غائب ہوجاتا تھا! اس مرتبہ واپس آتے ہوئے میری نظر اُس تیسرے خوشنما خط پر پڑی جو اب تک میری یاد سے اُتر کر میز پر رکھا ہوا تھا؛ میں نے اُسے اُٹھالیا۔ لفافہ نہایت نفیس اور اعلیٰ درجہ کا تھا، مونوگرام اور تاج نہایت خوبصورت اور عمدہ تھا، اور ہر طرح یہ ثابت ہوتا تھا کہ ہونہ ہو بھیجنے والا کوئی متمول اور فضول خرچ ہے! میں نے کھولا اور پڑھا؛ انگریزی میں لکھا تھا!

"ڈیرسر! میں ایک خطِ تعارف آپکے پُرانے کالج فیلو مسٹر معین الدین ساکن حال بیروت سے آپکے نام لایا ہوں! انہوں نے عین عنایت کے ساتھ ایک، ایسے شخص سے میری ملاقات کرانے کے ذرائع بہم کردیے ہیں جو میرے خیال میں دولتِ علم وفضل سے غیر معمولی طور پر مالا مال ہے! میں آج شام کو آٹھ اور نو بجے کے درمیان۔ درِ دولت پر حاضر ہونگا: امید ہے کہ آپ اُس وقت درِ دولت پر ہی ملیں اور نیز فرصت میں ہوں! میں اپنا کارڈ اور موجودہ پتہ ملفوف کرتا ہوں!...... میں ہوں آپکا صادق۔ "حارث"

کارڈ خط میں سے نکلکر میز پر گرا۔ ہاتھی دانت کی وضع کے نہایت عمدہ جلا کیے ہوئے کاغذ کا تھا، ایک چھوٹا سا تاج بھی اسپر بنا تھا، "پرنس حارث کنی۔ شہاب جنگ" نہایت خوبصورت چھپا ہوا تھا جس کے نیچے موجودہ پتہ۔ تاج محل ہوٹل پنسل سے لکھا ہوا تھا!

مضمون مختصر اور سادہ، عبارت مہذب اور صاف؛ خط پاکیزہ اور پختہ؛ خواہ مخواہ میں نے اُسکو دوسری مرتبہ پڑھا، پڑھا اور غور کیا، غور کیا اور خود بخود اس خط کا اثر مجھپر پڑنے لگا، کوئی غیر محسوس چیز مجھے اپنی طرف کھینچنے لگی، اور میں بلاوجہ

آپ ہی آپ سمجھنے لگا کہ میں اس کے لکھنے والے سے مل کر ضرور خوش ہونگا!
ہوا اب پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ مینہ بھی موسلا دھار پڑ رہا تھا گرج اور
چمک بھی ٹھہر ٹھہر کر ہو جاتی تھی، اور نظر نہ آنیوالا ہارمونیم نوازرات کے سناٹے اور
بارش کے غل میں اپنی پوری آواز کے ساتھ ایک نئی غزل ؎

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما چیست یاران طریقت بعد ازاں تدبیر ما

گارہا تھا! اب پھر مجھے وحشت ہوئی، پھر اس کمرے سے، تنگ و تاریک کنج تنہائی
سے میرا دل گھبرایا، اور میں بے چینی کے ساتھ مینہ کے ٹھہرنیکا انتظار
کرنے لگا! فوراً ایک نیا خیال ـ مجھے تو منہ دکرنے والا خیال ـ میرے دماغ
میں چکر کھانے لگا! اگر واقعی وہ ـ حارث شہاب ایسا ہی امیر و کسب دولت
والا ہے جیسا کہ میں نے لکھا ہے، اور اپنی تحریر کے موافق آج بلکہ ابھی
مجھے ـ پچاس لاکھ کی حیثیت کے شخص سے ـ اس ذلیل ناپاک کمرے میں ملنے
آئے ؟ ۔ ۔ ۔ اور وہ ضرور آتا ہوگا، تو اب ؟ ۔ ۔ ۔ میرے پاس ـ مجھ
مکھ پتی کے پاس ـ اس وقت اتنے پیسے نہ تھے کہ اس کو تار دیکر آنے سے
روک دیتا! امتول کی اس عجیب و غریب بیکسی کے شان پر مجھے پھر ہنسی آئی
مگر حارث کے آجانیکا کھٹکا لگا ہوا تھا، اور میں برابر سوچ رہا تھا! بس، بس
بالکل ٹھیک! مجھے اسیوقت یہاں سے چل دینا چاہیئے، وہ آئے گا اور
مجھے نہ پائیگا؛ دو تین روز کے بعد اپنی حالت درست کرکے کسی اچھی جگہ
میں اس سے ملنے کے لیے وقت معین کرالوں گا! لہٰذا سب سے پہلا کام
یہ ہوکہ میں یہاں سے فوراً غائب ہو جاؤں! یکایک ہوا کے تیز جھونکے
کے ساتھ لیمپ بھڑکا، لو چمنی سے باہر نکل گئی، اور روشنی بیٹ سے
نذار د! میں اندھیرے میں گھر گیا ـ اور دیا سلائی کا بکس ـ یادہ نہ ملے تو

اسی حالت میں چلے جانے کے لیے اپنا کوٹ، ڈھونڈھنے لگا! کڑکڑ کرررر! بجلی نہایت زور کے ساتھ چمکی اور بعید خوفناک آواز کے ساتھ کڑک ہوئی! میں اپنی ظلمت پیمائی سے۔ اندھیرے میں ٹٹولنے سے۔ خود بخود کڑک کی آواز کے ساتھ رُک گیا! ہوا کا جھکڑ اور زیادہ شدّت کیساتھ چلنے لگا، بارش دھواں دھار اور زور شور کے ساتھ ہونے لگی، اور میری قوت سامعہ نہایت سرگرمی کے ساتھ اپنا فرض انجام دینے لگی! گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے کی آواز اور گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی، اور ہمارے مکان کے قریب آتے ہی فوراً ٹھہر گئی!

اب میں ذرا چونکا، میرے کان کھڑے ہوئے، اور میں اندھیرے میں لیٹا لیٹا یا کونے میں کھڑا سننے لگا! گاڑی کے دروازہ کھلنے کا دھڑاکا ہوا، کسیکے زینہ پر چڑھنے کی کھٹ پٹ، پھر کارخانہ دار سے باتیں کرنے کی مردانی آواز، اور ہاں اور پھر خاص میرے کمرے کیطرف بڑھنے کی پانوں کی آہٹ!

"کوئی شیطان ہے! ضرور کوئی شیطان ہے!" سخت حیرت کے ساتھ بیاختہ میری زبان سے نکلا۔ بالکل میری خلاف اُمید خود بخود آجانیوالی دولت کی طرح وہی شخص موجود ہے جس سے میں اس وقت بچنا چاہتا تھا!"

دروازہ کھلا، اور ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھنے والے اندھیرے میں سے ایک دراز قد، سیاہ ہیئات انسانی، مجھے دروازہ کے سامنے کھڑی نظر آئی! مجھے یاد ہے اور اچھی طرح یاد ہے کہ اس دھندلی نظر آنے والی ہیئات انسانی کو محض اندھیرے میں دیکھنے سے ہی ایک عجیب ناقابل بیان اثر مجھپر پڑا! پہلی ہی نظر میں اُس کی شاندار طویل قامت اور اُس کے دلکش انداز نے میری توجہ بالکل اپنی طرف کھینچ لی، اس قدر کھینچ لی کہ میں نے کارخانہ دار کے الفاظ بھی اچھی طرح نہیں سنے: "جوان بخت صاحب شاید کہیں چلے گئے" اُس نے طویل قامت شخص کیطرف

مخاطب ہو کر کہا: "جناب! ابھی آدھ گھنٹہ ہوا ہوگا کہ میں نے جوان بخت کو یہاں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ ایک منٹ کی تکلیف گوارا فرمائیں تو میں لیمپ لاتا ہوں! اگر وہ آپ کے لیے کچھ لکھ کر چھوڑ گئے ہوں گے تو ضرور میز پر ہی ہوگا" کارخانہ دار لیمپ لینے گیا اور پھر چاروں طرف سکوت اور اندھیرا تھا! میں جانتا تھا کہ اسے مجھ سے [illegible] [illegible] بالکل [illegible] خیالات کی کشمکش سے [illegible] حالت کے احساس سے [illegible] ایک حرف بھی [illegible] نکلنے دیا! میں اب بھی سوچتا تھا کہ اس عجیب ہستی سے کسی حال کی طرح چھپا رہوں! وہ [illegible] اندھیرے [illegible] دو تین قدم آگے بڑھی اور نہایت دلکش آواز میں اس نے پکارا: "مسٹر جوان بخت! کیا آپ یہاں ہیں؟"

میں قطعی نہیں سمجھ سکتا کہ میں اب بھی کیوں نہیں بولا! ایک ناقابل بیان انتشار نے۔ بلکہ بد تہذیبی نے۔ اب تک مجھے زبان نہ ہلانے دی اور میں اندھیرے میں چپ ہوا خاموش اسی کونے میں کھڑا رہا! نہایت استقلال کے ساتھ قدم رکھتا ہوا وہ اور آگے بڑھی۔ اس قدر ٹھیک میری سیدھ میں آگے بڑھی کہ اُس کا اونچا اور شاندار قد بالکل میرے سامنے آ کر اندھیرے میں مجھ پر چھا گیا! اب پھر اُس نے اپنی موثر آواز کے ساتھ کسی قدر طعن آمیز لہجے میں پکارا: "جوان بخت صاحب! کیا آپ یہاں ہیں؟"

شرم! شرم!!! اب میں خجالت میں ڈوب گیا، اور زیادہ صبر نہ کر سکا! پوری کوشش کے ساتھ میں نے اُس بیہودہ کیفیت کو، اُس زبان بند رکھنے والے جادو کو جس نے اب تک مجھے بزدلوں کی طرح چھپے رہنے پر آمادہ رکھا تھا، جوں توں کر کے دور کیا اور جسارت کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا: "جی ہاں! میں یہاں ہوں" محض سلسلۂ گفتگو جاری رکھنے کے لیے

بغیر سوچے سمجھے میں کہے گئی " غالباً آپ ہی پرنس حارث شہاب جنگ ہیں! میں نے آپکا خط ابھی پڑھا ہے؛ مگر۔ مگر۔ اس وقت میں صرف اسوجہ سے خاموش رہا کہ اندھیرا دیکھ کر آپ شاید واپس تشریف لیجائیں، اور یہ سمجھ لیں کہ میں یہاں نہیں ہوں! آپ خود دیکھتے ہیں کہ میں کس قدر سچا اور صاف گو ہوں "

"بے حد صاف گو" اس نے جواب دیا "اس قدر صاف گو کہ مجھے آپکا مطلب سمجھنے میں بالکل دقت نہیں ہوئی! غالباً آپ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی تھے " "نہیں۔ نہیں!" میں نے لاجواب ہو کر گھبراتے ہوئے کہا " بڑے مہربانی ہے مجھے اسقدر بدتہذیب اور کھڑتہ سمجھیئے! دراصل میں ابھی آپ کی تشریف آوری کے لیے کچھہ انتظام نہ کرچکا تھا کہ آپ آگئے، اور آپکے آتے آتے لیمپ یکایک گل ہوگیا! اب اس اندھیرا ہوجانیکا سب سے بڑا نتیجہ تو میں یہ ہی دیکھ رہا ہوں کہ آپکا استقبال کرنا تو کجا میں آپکے ہاتھہ تک نہیں ملا سکتا......"

وہ فوراً بات کاٹ کر اپنا ہاتھہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا " لیجئے میں اپنا ہاتھہ بڑھاتا ہوں! آپ بھی اپنا ہاتھہ لائیے؛ اگر آپ میں کچھہ بھی محبت اور دوستی کی کشش ہوگی، تو ضرور دونوں ہاتھہ خود بخود بغیر کسی رہنمائی کے ملجائیں گے!"

میں نے فوراً اپنا ہاتھہ بغیر سوچے سمجھے۔ بغیر اس کے ہاتھہ کی سمت کسی طرح دریافت کیئے۔ اندھیرے میں بڑھایا، اور یقین کیجئے کہ میرا ہاتھہ اس ڈوانسے والے اور مضبوط ہاتھہ کی گرفت میں تھا؛ کارخانہ دار اپنا سب سے اچھا لیمپ روشن کیئے۔ ہاتھہ میں لیے اندر گھسا! اور میری سب سے پہلی نظر اس شاندار جسم پر، اس مؤثر شکل پر، اس حکومت کا انداز رکھنے والی ہستی پر پڑی!!

باقی آئندہ

سلطان حیدر۔ جوش دعلیگ

عرض ستم

مطرب خوش گلو مجھے حرفِ صدائے ساز کر — کشتۂ جستجو ہوں میں، واقفِ کنہ راز کر
تیری ہی لطف پر ہے اب عزت شان دل — محرم بزم راز ہوں، غیر سے امتیاز کر
دور خود بزم عیش جب غیر تھے تو پھر مجھے — کس سے کہا تھا کہ واقفِ رازِ حریم ناز کر
شیشۂ دل ہے پاش پاش، یوں ہے وفا کی منتشر — اپنی نگاہِ ناز کو اپنے تو دل نواز کر
غیر کی ٹھوکریں ہیں اور سنگ حریم ہے ترا — اوسکی شکستگی کو دیکھ دل کو ذرا گداز کر

غیر پہ اعتماد ہے، کر کے ذرا جفا تو دیکھ
اوسکی وفا پہ ناز ہے اک ذرا آزما تو دیکھ

اپنی زمین نہ وہ رہی، اور نہ وہ آسماں رہا — صحبت ہزار ہے نہ وہ، گلکدہ نہ وہ سماں رہا
صوتِ نغمہ وہ نہیں، حالتِ بزم اور ہے — ساز گراں رہا نہ وہ جامۂ طیلساں رہا
خوب کیا مٹا دیا مجھ کو، وہ لے خبر نہیں — اپنی جبیں رہی نہ جب، کب ترا آستاں رہا
بزم سے تیرے ہے چلے آرزوِ فروغ شمع — پھر بھی تجھے ستم شعار شکوۂ میہماں رہا
ہیں جو رہین التفات، وہ دادِ نوال دیں تجھے — ہم سے تو دوست کش سدا یونہی تو سرگراں رہا

بزم سے تیرے لیکے ہم ہستی بے مزہ چلے
آئے تھے جیسے بےنوا، ویسے ہی بےنوا چلے

غیر ہے معترف ترا، اوسمیں مگر وفا کہاں — دعوے انس ہے مگر الفتِ بے ریا کہاں
فخرِ درِ حریم تھی جنکی صدائے دردناک — یہ تو سمجھ، ملیں گے اب ایسے تجھے گدا کہاں
داور تھا نہ جب دریغ، حوصلے تھے بڑھے ہوئے — عزم میں اپنے اب مگر قوت مرحبا کہاں
ہوگئیں حصۂ عدو ساری عجب نوازیاں — ہم پہ وہ لطف اب کہاں، ہم پہ وہ اعتنا کہاں

کون کھے تجھی میں اب قوت کہربا کہاں ہو گئے کاہِ منتشر ہم سے تو یہ گلہ بجا ہے

ہوگئیں چارہ سازیاں تیری فسانۂ کہن،

تازہ ہے داستانِ غم، قصۂ حسرت و محن

خاک میں ساری مل گئیں اپنی امیدواریاں ٹہریں نہ کچھ حضورِ یار قلب کی بیقراریاں

غمکی جبہ سائیاں میری ہیں وجہ سرزنش ہوگئیں سچ عدو کی سب جھوٹی وفا شعاریاں

اوروں کی خودسری بھی ہے لائق آفرین داد عجز و نیاز بھی مرا ہوگئیں ہرزہ کاریاں

پاسِ حقوق جب نہیں، غیروں سے کیا مقابلہ ان پہ ہیں مہربانیاں اونکی ہیں غمگساریاں

اپنی وفائیں اور بھول اونکی مذمتیں کھلی غیر کے عیب فاش اور اونکی ہوں پردہ داریاں

وعدے سے تیرے بدلے خود آئی ہے یہ خبر نہ تھی

سینے کو لیکے دل باوفا، تجہ میں وفا مگر نہ تھی

جس کا ہے میں ہے ترا جلوۂ تابشِ جمال اسکو عدو بتائیں اور نہ ہو تجھے خیال!

خون جگر سے اُف، لکھا جس نے صحیفۂ وفا مٹتا ہے آج اوسیکا نام آج وہی ہے پائمال

کس کے ہیں ہو گا رحم، کچھ نہیں اعتنا تجھے؟ اب تو سوالطف کی نظر سو کہہ گئے لب سوال

مٹتے ہیں آنکھیں نہیں تیرے ستم پہ ہوش کر جاتی ہے عظمت اوبس مٹتی ہے حرمت بلال

جب نہیں تجھ کو لغزشِ مرد وفا، تو دیکھ ادھر جاتے ہیں تیری بزم سے ساتھ لئے ہوئے ملال

مٹتا ہے تیرے ہاتھوں جب بارگہِ حجاز بھی

طاعت و بندگی بھی سے، روزہ بھی ہے نماز بھی

نیاز محمد خاں، نیاز، فتحپوری

لیلیٰ اور توبہ

عزہ کو اب اس بات کا پورا پورا یقین ہوگیا تھا کہ وہ لوگ جو سرِ شام لبِ آب جاتے ہوئے نظر آئے تھے، وہ لیلیٰ اور اس کے ہمراہی تھے اس کے بعد عزہ نے ہنسی میں لیلیٰ سے پوچھا "لیلیٰ! تم میں اور توبہ میں کیا واقعی محبت ہے؟

لیلیٰ:۔ میں آپ کا مافی الضمیر نہ سمجھی۔

عزہ۔ میرا سوال تو بالکل صاف ہے۔ یہ بات اب تک خود میری سمجھ میں نہ آئی کہ جب تمھارا اور توبہ کا دل ملا ہوا تھا، پھر مناکحت میں کونسا امر مانع ہوا۔ یہ ازدواج کا بڑا رکن اتحادِ قلبی پہلے سے موجود تھا۔

لیلیٰ:۔ (ذرا دھیمی آواز سے) یہ داستان خدا جانے کیوں آپ نے اس موقع کے لیے اٹھا رکھی تھی، جس کے ذکر سے اسوقت مجھے کوئی خوشی یا تفریح حاصل نہ ہوگی آپ کو بفرضِ مہمان نوازی اس وقت کوئی ایسا دلچسپ مشغلہ چھیڑنا چاہیئے جو سفر کا تکان دور کر کے ہمیں تازہ دم کرا دے

عزہ:۔ اچھا لو! تمھاری ہی خوشی سہی، اب یہ ذکر نہ کروں گی۔ طُویس جا، اور اس کمرہ سے ۔ ۔ ۔ ۔ دف لے کر آ،

طویس یہ سنتے ہی بقول شخصیکہ "سرو بستاں یا دوہا نیدن" وہاں سے بلی کی چال گیا اور کتے کی چال دف لے یکر بات کہتے واپس آگیا،

عزہ نے اس کے ہاتھ سے دف لے لیا، اور بجا کر یہ شعر گانے لگی:۔

وكنت اذا ما جئت ليلىٰ تبرقعت فقد رابني منها الغداة سفورها
عَلَيَّ دِماءُ البُدنِ ان كان بعلها يرى لِيَ ذنبًا غير اني ازورها

ابھی عزہ اِن شعروں کو پورے طور سے ادا نہ کر چکی تھی کہ اس اثنا میں لیلیٰ بول اٹھی عزہ یہ بھی عجیب بات ہے کہ دنیا میں تو بہ ہی کا قصہ آپ کو میری ضیافت طبع کے لیے یاد رہ گیا ہے کہ ہر بار الٹ پھیر کے وہی چھیڑا جاتا ہے۔

عزہ ہنسنے لگی، اور کہا "کیا دنیا میں تمہیں ایک لیلیٰ ہو، اگر توبہ ابن حمیر نے اپنے ان شعروں میں کسی دوسری لیلیٰ سے مراد رکھی ہو"

لیلیٰ اس تجاہل کی ایک ہی رہی، یوں کہیے آپ اس قصہ کو سننا چاہتی ہیں، پس اگرچہ اس کے اعادہ سے مجھے تکلیف ہوگی مگر آپ کی خواہش کو بھی رد کرنا میں نہیں چاہتی اس لیے عرض کرتی ہوں سنیے! یہ تو آپ کو معلوم ہے۔ کہ ہم اہل بادیہ ہیں، جن کے اخلاق، عادات، معاشرت اور ماند و بود وغیرہ اہل شہر سے بالکل مختلف ہیں، شہر والوں کا دستور ہے کہ ان کے یہاں کوئی نوجوان کسی دوشیزہ کی زلف پیچاں کا اسیر یا چشم پرفن کا مسحور ہوتا ہے تو ان کی قدر کی جاتی ہے، ان کے نازک دلوں کو صدمہ سے محفوظ رکھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اور شرع و عرف کی آزادیاں انکو باہمی لطف و محبت کے قائم رکھنے کے لیے عطا کی جاتی ہیں، مگر اہل بادیہ اس اصول کے بالکل خلاف ہیں، اُن کے یہاں محبت کا نام درمیان میں آیا نہیں اور مستحق رحم و غمخواری اہل عزام کے حواس خمسہ پر پہرہ بٹھا دیے گئے۔

اس عشق میں ہم بھی اس طرز تہم کے ہدف بنے، توبہ نے شہری دستور کے مطابق میرے والد کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ ادھر عشق کی خبر شہرت

پاہی چکی تھی کہ فوراً بنی ادلع میں سے میرے شوہر کو منتخب کر کے جھٹ منگنی پٹ بیاہ کر دیا گیا۔ لیکن توبہ کا جرم اتنا خفیف نہ تھا کہ محض یہہ سزا اُس کے حق میں کافی تصور کیجاتی۔ لہذا میرے اہل قبیلہ کی طرف سے اُس کا خون ہدر کیا گیا۔

ظالم نے اس ارادۂ فاسد کی تکمیل کے لیے ایک روز اپنے اپنے ہتھیار تیز کر کے کمین میں بیٹھکر اُسوقت کا انتظار کرنے لگے کہ جوہی وہ حسب معمول مجھہ سے ملنے آئے اور اُس ناکردہ گناہ کی جان لی جائے۔ مجھے اُس کی خبر پہلے سے لگ چکی تھی۔ لہذا میں اُس دن اپنی روز کی عادت کے خلاف مقام ملتخ سے اور آگے جاکر اُس کے آمد و رفت کے راستے میں بے محابا جا بیٹھی، حالانکہ اُس سے پہلے کبھی میں نے اُس کا بلا حجاب و نقاب کے سامنا نہیں کیا تہا۔ خیر! وہ اپنی عادت کے مطابق آیا۔ مگر اُس نے آج جو یہ چند امور خلاف معمول پائے تو دور ہی سے وہ کھٹکا۔ اور قریب پہونچتے پہونچتے وہ بھانپ گیا۔ اور پھر مابین سے گھوڑے کو پھیر کر جو اُس نے ایڑ بتائی، تو اُس کی گرد کا بھی وہاں پتہ نہ تھا۔

اِس واقعہ کو اُس نے اپنے ایک پرزور قصیدہ میں نظم کیا ہے جسکا مطلع یہ ہے:-

فاتك بليلى دارها لا تزورها وشطت نواها واستمر مريرها

اور وہ بیت بھی اسی قصیدہ کے ہیں جن سے آپ نے تعنی کی۔

دراصل عزہ تو اس قصے سے پہلے ہی سے واقف تھی، مگر اس وقت تو محض لیلیٰ کی خاطر سے اُس نے اس کو چھیڑ دیا تھا۔ چنانچہ اُس نے کہا:

عزہ: میں اگرچہ اس سارے قصے سے واقف تھی۔ مگر اس وقت تمہاری زبان سے

اس کے سننے میں اور ہی مزہ ملا، میری واقفیت کا ثبوت یہ ہے کہ اگر تمھارا راز مجھ سے چھپا ہوتا تو تیرے کے محض دو شعروں سے تمہیں پہچان لینا میرے لیے آسان امر نہ تہا، لیلیٰ! اگر تم نے اپنے پتہ کے اُن دو شعروں کی شان نزول نہ سنائی، حق تو یہ ہے کہ جس عفت کا اُن شعروں میں مذکور ہے شہر والے اُس کی نظیر مشکل سے پیش کر سکیں گے،

لیلیٰ - فی الواقع عفت اور پاک نفسی تو کچھ اہل بادیہ ہی کا حصہ ہے جس میں اس وقت بنی العذرا جوار مدینہ میں ہونے کی وجہ سے بڑی شہرت پا رہے ہیں مگر نہیں بدوی قبائل میں کیا بنی العذرا اور کیا کوئی سب ہی لوگ اسی درجہ کا اخلاق رکھتے ہیں، اگرچہ نسبتہً کثرت واقعات کی وجہ سے قبیلۂ بنی العذرا کو ہی شہرت نصیب ہے، خیر! وہ واقعہ یہ ہے کہ جب ہم دونوں کی شادیاں ہو چکی تہیں، ایک روز کی ملاقات میں توبہ نے کسی امر خاص میں مجھ سے اصرار کیا تہا، اُس وقت میں نے اُس کے سامنے فی البدیہہ یہ شعر پڑھکر اپنے تعلقات کا معیار اُسے بتلایا تھا،

وذی حاجۃٍ قلنا لہ لا تبح بھا فلیس الیھا ما حییت سبیل
لنا صاحبٌ لا ینبغی ان نخونہ وانت لاخری صاحبٌ وخلیل

حالانکہ میری اور توبہ کے سینوں میں جیسے پاک جذبات کا دفینہ تہا، ویسی ہی ہماری زبانیں بھی اُن جذبات کی ثقہ اور صادق ترجمان تہیں،

اسپر طولیس قہقہہ لگا کر بولا، "یہ بھی کیا مدینہ کی مخنثوں کی سی عفت ہے۔ اہل بادیہ کی عورتیں ایسی ہیں جیسے وحشی ہرنیں آدمی کو ہرگز پسند نہیں آسکتیں"

اس کے بعد حمزہ نے پھر دف لے لی، اور کچھ گانا شروع کیا، مگر بیچ

فوراً ہی دف کو رکھ عود کو اس خوبی سے چھیڑا کہ لیلیٰ اور لطوپس، دونوں کے دونوں مست ہو گئے، تھوڑی دیر تک یہی سماں رہا، آخر عزہ نے جب اسے ختم کیا تو کیفیت اور خود فراموشی کا طلسم ٹوٹا، جس پر لیلیٰ نے بہت تعریف کی، اور شکریہ ادا کیا، اس کے بعد اس نے کہا "مجھے آئے ہوئے بہت عرصہ ہوا، اس لیے اب جلد میں آپ سے رخصت ہو جاؤں گی، مگر قبل جانے کے آپ سے ایک امر خاص میں کچھ مشورہ چاہتی ہوں جس کے لیے تنہائی درکار ہے" فقط (باقی)

غالی - ندوی

میری قبر اور تم

(ایک انگریزی نظم کا مفہوم لیا گیا ہے)

جبکہ اس دارِ فنا سے میں سفر کر جاؤں گا　　تب مری چاہت تمہاری دل میں چٹکی کھائیگی
تنگ سر بے چین ہو کر، آؤ گے رونے مجھے　　کیونکہ بے میرے طبیعت بے طرح گھبرائیگی
نیلی نیلی تتلیاں تم ڈھونڈو گی مجھکو چار سو　　دوڑ پر کر کل تمہارے سامنے ہی لہرائیگی
تم جگاؤ گے کہ اٹھو بس بہت دن چڑھ گیا　　میں کہوں گا اب تو سونے دو، یونہی کٹ جائیگی
صدا دو ڈالو گے تو میری روح دیگی یہ صدا　　اب یہ دنیا کی نمایش میرے کیا کام آئیگی
پھول لانے کی ضرورت کچھ نہیں، خود پھول ہو　　پھول سی صورت تمہاری پھول خود بن جائیگی

مجھ مجید خستہ دل کو بعد کے اب کیا چاہیے
تم چلے آنا - اسی پر مغفرت ہو جائے گی

محمد مجید الحسن دہلوی

موجودہ صدی کے ایک مسلمان کا نقش

بہ درگاہ باری تعالیٰ عزّ اسمہ

اے کہ روحی تو جسم بے جان را ۔۔۔ طاقت و تاب ناتوانان را
بیکس و کس مپرس را یاور ۔۔۔ کور و گم کردہ راہ را رہبر
کہتے ہیں حالِ پُر ملال اپنا ۔۔۔ عرض کرتے ہیں پھر سوال اپنا
دل کے وہ راز لب پہ لاتے ہیں ۔۔۔ کاوشوں سے جنہیں چھپاتے ہیں

ہم میں اسلام کی ہے شان باقی ۔۔۔ اور نہ ایمان کا نشان باقی
شکل اسلام موجبِ نفرت ۔۔۔ وضع اسلام باعثِ ذلت
دل سے مرغوب شانِ عیسائی ۔۔۔ ان کی اِک اِک ادا کے شیدائی
ننگ مسجد میں ہے ہمیں جاتا ۔۔۔ جیسے زاہد کا سوئے میخانہ
پاک یوں مسجدیں مسلماں سے ۔۔۔ جیسے خالی پڑا ہو تن جاں سے
پائیے گر کہیں مصلّی چند ۔۔۔ بوڑھے ۔ بیمار ۔ منگلے ۔ حاجتمند

کل احادیث و فقہ کے دفتر ۔۔۔ کذب و بیہودگی ہیں سر تا سر
ان نشانوں سے ہم کو کیا مطلب ۔۔۔ پچھلی صدیوں کے من گھڑت ہیں سب
منہ سے قرآں پہ رکھتے ہیں ایماں ۔۔۔ سچ جو پوچھو تو کس کو ہے ایقاں
بیکن اور کارلائل ۔ اسپنسر ۔۔۔ ان کے اقوال وحی سر تا سر
ان کی ہر ایک بات ہے الہام ۔۔۔ ان پہ قربان ہمیشہ[1] اسلام

[1] افسوس ایڈیٹر

سکہ ہم مانتے ہیں سیزر کا — کلمہ پڑھتے ہیں ہم سکندر کا
پر عمرؓ خالدؓ و صلاح الدینؒ — کون تھے کیا تھے۔ جانتے ہی نہیں
وہ عمر جس نے تھی بنا ڈالی — کانسٹی ٹیوشنل حکومت کی
کوئی واقف نہیں (ہوں عام کہ خاص) — کون تھے حضرتِ عمرو بن عاص
تھا کوئی بو حنیفہ نعماں — جیسے سولن مقننِ یوناں
آتے ہیں کب زباں پہ ان کے نام — ہم سے رسوا ہے شوکتِ اسلام

کس کو ایماں بہشت و دوزخ پر — اب کہاں رکھتے ہیں یہ وعظ اثر
حور و غلماں یہ سب ہیں افسانے — ان کو مانا کریں یہ ملّا نے
ایسے پھندوں میں ہم نہیں پھنستے — ان خیالات پر ہیں ہم ہنستے
تجھ کو جو سمجھا سمجھ کو ہے معلوم — اک وجودِ معطل و موہوم
ہم نے مذہب کو جو نکلا سمجھا — مفت کی سر پہ اک بلا سمجھا
تھا نہ معلوم پسِ پردہ رہی غفلت — اس میں پنہاں ہے رازِ قومیت
ڈھیل دے کر جو کھینچ لی ڈوری — کھل گئی اپنی صاف کمزوری

کل محاسن کو آہ دے بیٹھے — سارے قومی شعار کھو بیٹھے
ہم تو [illegible] — اور [illegible] کے قائل ہیں
[illegible] کو جدا [illegible] — ان کی ساری برائیاں لے لیں
مجمع سیئات ما گشتیم — ننگ ایں کائنات ما گشتیم
منفعل ہیں خجل ہیں نادم ہیں — کہتے شرم آتی ہے کہ مسلم ہیں
اپنے عصیاں کا ہے جواب اگر — تو وہ تیرا کرم ہے اے داور

ہے اُمیدوں کا آدستیاناس — اپنی تصویر ہے سراپا یاس
آئے فریاد لے کے تیرے پاس — یا الٰہی نہ توڑنا تو آس
نیک کردار ہوں کہ بدکردار — تیرے کہلاتے ہیں ہم آخر کار
کچھ ہی ہوں تیرے نام لیوا ہیں — نامِ دینِ ہدا کے شیدا ہیں
ہم ابھی تک ہیں (اور تو ہے گواہ — قائلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه
وقعت اسلام کی ہے دل میں ابھی — عزت اس نام کی ہے دل میں ابھی
ہم میں کچھ ہے حمیت قومی — ہم میں باقی ہے غیرتِ قومی
دینِ حق کفر سے ہے رسوا آج — تیری غیرت کو ہو گیا کیا آج؟
کیوں ہو اسلام کفر سے مغلوب — ہم پھریں کافروں سے یوں محجوب
تیری مرضی ہے کیا کہ مثلِ یہود — کالعدم ہو ہمارا نام و نمود
یوں پھریں کوچہ جہاں میں خوار — کہ ہنسیں دیکھ کر ہمیں کفار!
ہوں جو آزاد کردہ اپنے غلام — ہم ہوں اب اُن کے بندۂ بےدام

کر مٹے عالم سے کالعدم ہم کو
پر دکھانا نہ یہ ستم ہم کو

اے کہ گر بیش تو بر د فریاد — بندۂ دل شکستہ و ناشاد
آیدت شرم کز در رانی — بیدل از بارگاہِ سلطانی
واسطہ ہے تری خدائی کا — واسطہ ہے تری بڑائی کا
بندۂ خوش نصیب کا صدقہ — اپنے پیارے حبیب کا صدقہ
صدقہ اپنے نیک بندوں کا — فتحمندوں کا سربلندوں کا

اپنا وہ وعدہ آج پورا کر
جھنڈا پھر اپنے دیں کا اونچا کر

علم الاقتصاد

یا

موجودہ تہذیب

اس علم کا جاننا جس قدر زیادہ ضروری ہے تعجب ہے کہ ہندوستانی اُسی قدر اس سے بے بہرہ ہیں کبھی کبھی اس مضمون پر ایک آدہ آرٹیکل لکھا بھی جاتا ہے تو عام ناظرین اس پر اتنی غور بھی نہیں کرتے جتنا شاید وہ کسی پہیلی کے بوجھنے یا کسی ہرل گو شاعر کے لایعنی اشعار کے سمجھنے میں کرتے ہوں گے۔

اگر غور سے دیکھا جاوے تو جو انسان کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس کا مطالعہ بغیر اس علم کو جانے ہوئے کامل نہیں کہا جا سکتا اور اس علم کا کامل طور پر ماہر ہونے کے لیے خود انسان اُس کے عادات و خصائل۔ طریقہ بود و باش ملکی رسم و رواج وغیرہ کا جاننا ضروری ہے غرض انسان کے ساتھ اس علم کا تعلق بہت زیادہ ہے اور آجکل کی زندگی میں تو یہ علم ایسا لازم و ملزوم ہے کہ کوئی قوم بغیر اس کے جانے شایستہ و مہذب ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ علم کیا ہے اور کس قدر وسیع ہے۔ اسکو انگریزی میں پولٹیکل اکانومی یا اکانومکس کہتے ہیں اور اُردو خواں مخلوق آجکل اسے علم الاقتصاد یا سیاست مدن کے نام سے پہچانتی ہے کیونکہ ٹھیٹ اُردو زبان کا لفظ ابھی تک اس کے لیے مخصوص نہیں ہوا۔ اور ہوتا کس طرح

ابھی تک ہم لوگوں کی توجہ ہی اس طرف نہیں ہوئی کہ یہ علم بھی کسی خاص توجہ کا مستحق ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس علم کو دلچسپ پیرائے میں اُردو خواں پبلک کے سامنے ظاہر کیا جائے تاکہ ان کی توجہ اس طرف ہو اور اس کے رواج عام سے ملک میں ترقی اور بیداری کے آثار نمایاں ہوں۔ یہ کام ہے اُن اہلِ قلم کا جو اس علم کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ زبان اُردو پر بھی پوری طرح قادر ہیں۔ ہم تو نہ اس کے ماہر نہ زبان پر قادر صرف اس بات کا شوق کہ ہمارے اُردو اخباروں اور رسالوں میں اس علم کے متعلق بکثرت مضامین لکھے جایا کریں اور یہ علم کسی طرح ہندوستان میں رواج پاجائے ہمیں ان چند سطروں کے لکھنے پر مجبور کرتا ہے۔

ہندوستان اور ایسے ہی دوسرے ملک جن میں قدرتی ذرائع پیداوار کے بکثرت ہیں، اور جہاں بلا ہاتھ پاؤں ہلائے یا بہت تھوڑی محنت سے پیٹ بھرائی ملتی ہے وہاں صنعتی بیداری کبھی نہیں ہوئی۔ کھانے کو اناج بہت۔ جانوروں کی بدولت دودھ گھی۔ گوشت وغیرہ کی کمی نہیں۔ کپڑے بھی تن ڈھانکنے کے لیے بہت نفیس نہیں تو خیر معمولی سہی لیکن بہتات کے ساتھ۔ پھر کس کی بلا کو غرض پڑی ہے کہ دماغ پر زور ڈال کے مشینوں کو ایجاد کرے۔ طرح طرح کی دستکاریوں کا رواج ہووے۔ دس گز روز کپڑا بننے کی بجائے کوشش کرے کہ ہزار گز روز تیار ہو۔ جب جانوروں کی کھالوں یا بھدّے سے کاغذ سے وہی کام نکل سکتا ہے تو نفیس چکنے کاغذ بنانے پر توجہ صرف کرنا فضول ہے۔ مٹی کے بنے ہوئے بھدّے سے برتن میں کھانے سے بھی دال کا مزہ وہی رہے تو تانبے کا برتن بنانے پر محنت صرف کرنے سے کیا حاصل۔ آدمی بہت کام کم۔ لہٰذا تقسیم

کام کا سوال ہی بیجا ہے۔ دوسرے ملک والے چاہے کچھ ہی کریں لیکن ہم بے وقوف نہیں۔ وہ رات دن اسی فکر میں لگے رہتے ہیں کہ کس طرح صنعت و حرفت میں ترقی ہو۔ دولت بڑھے چستی و چالاکی پیدا ہو جن کی وجہ سے انسانی ضروریات بڑھیں پھر ضروریات چستی و چالاکی کے بڑھانے کی محرک ہوں مشینیں ایسی نہیں کہ انسان کے دماغ پر جو زور پڑتا ہے اور جسم پر جو بُرا اثر واقع ہوتا ہے وہ ان مشینوں کی وجہ سے کم ہو جائے اور اس طرح سے یہ دماغی و جسمانی قوت اور مفید کاموں میں صرف کیے جانے کے قابل ہو سکے۔ مگر ان باتوں سے فائدہ۔ ارے یہاں قناعت ایسی چیز ہے اس ہوا ہوس میں کیا رکھا ہے۔ گز ہی۔ گاڑھا۔ بدن پہننے کو۔ ملے صبر و شکر۔ نانِ گرم اور آبِ خنک مل جائے تو سبحان اللہ۔

یہ نمونہ ہے اُن خیالات کا جو اب سے کچھ پہلے عام طور پر رائج تھے اور اب بھی سوائے ایک خاص تعداد کے تمام انہی خیالات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اگر دونوں وقت موٹا جھوٹا کھانے کو مل جائے۔ بیاہ شادیوں میں خرچ کرنے کے لیے اتنا پاس ہو جو کنبہ برادری میں نک کٹی نہ ہو تو بھی اس سے زیادہ چاہنے والے پر تین حرف بلکہ چار پانچ۔

لیکن زمانہ رفتہ رفتہ سمجھا رہا ہے کہ جن قوموں کی ضرورتیں محدود ہیں جنہیں غلط قناعت کا خیال جم گیا ہے۔ جو اپنی ملکی پیداوار کی کثرت کے گھمنڈ پر ہاتھ پاؤں ہلانا بیکار سمجھتی ہیں جنہیں اپنے قدرتی ذرائع سے پوری طرح فائدہ اٹھانا نہیں آتا۔ یا جو یہ کوشش ہی نہیں کرتیں کہ اُن سے فائدہ اٹھایا جائے۔ جنہیں اس کی خبر نہیں کہ ہماری گورنمنٹ غلط اقتصادی اصولوں پر چل رہی ہے یا صحیح اصولوں پر۔ جو اس سے بے خبر ہیں کہ

دنیا میں کیا کیا کوششیں صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی ہو رہی ہیں۔ جنھیں یہ سوال فضول معلوم ہوتے ہیں کہ ہمارے ملک کی کس کس ملک سے تجارت ہے اور اگر ہے تو آیا درآمد زیادہ ہے یا برآمد۔ یا ہمارے ملک میں سونے چاندی کی کس قدر تعداد ہے اور دوسرے ملکوں میں کتنی اور دوسری قومیں ہمارا سونا چاندی ہم سے اپنے تجارتی اشیاء کے عوض زیادہ لیجاتی ہیں یا ہم اُن سے زیادہ وصول کر لیتے ہیں وہ ترقی کی دوڑ میں دوسری قوموں کے برابر نہیں چل سکتیں اور انجام اُن کا موت ہے یا ذلت و خواری اور غلامی کی زندگی ہے جو موت سے بھی تلخی میں زیادہ ہے۔

ممکن ہے یہ سوال پیدا ہو کہ اس قدر ریک چکنے کے بعد ہی مہربانی فرما کر اسکی تشریح کر دی جائے کہ آخر یہ علم کیا ہے لیکن دراصل اسکی تشریح ہو چکی۔ جو علم ہمیں یہ سمجھاتا ہے کہ دولت کن طریقوں سے پیدا ہوتی ہے کس طرح اس کی نگہداشت ہوتی ہے۔ کیونکر اُن افراد یا گروہوں میں تقسیم ہوتی ہے جو اس کے پیدا کرنے میں حصہ لیتے ہیں۔ ایک قسم کی دولت کا دوسری قسم کی دولت سے کس طرح تبادلہ ہوتا ہے۔ انسان کی ضروریات کہاں تک اس کی پیداوار کی محرک ہوتی ہیں اور قدرت کہاں تک مدد دیتی ہے۔ غرض ہر چیز کے جس علم کا منشا مطالعۂ دولت ہو اُس کا نام سیاست مدن ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ہماری موجودہ زندگی میں ساری کشمکش اسی کے لیے ہے اور گزشتہ زمانہ میں بھی اسی کی وجہ سے بڑے بڑے انقلاب ہوئے ہیں لہذا جتنی توجہ اس علم کے حاصل کرنے میں کیجائے کم ہے

جو علم دولت جیسی شے سے متعلق ہو ظاہر ہے کسقدر وسیع ہوگا اور کیا کیا اہم نتیجے اور عجیب و غریب پیچیدگیاں دنیا میں اس علم کی بدولت پیدا ہوئی ہونگی۔ لیکن اگرچہ اس رسالہ کا نام تمدن ہے اور تمدنی مضامین کا عنصر غالب رہنا چاہیئے اس کے مقاصد و اغراض میں اور قسم کے مضامین بھی داخل ہیں اور سارے صفحہ اسی ایک قسم کے لیے وقف نہیں ہیں۔ لہذا باقی پھر کبھی۔

محمد نصیر الحق۔ قریشی۔

عالمِ خیال میں کالج سے مزے مزے کی باتیں

اے وہ در و دیوار جو ہو علم و حکم میں — مشہور یہ کالج
آجاؤ میرے پاس کہ رکھ لوں تمہیں دل میں — دنیا سے چھپا کر
اسلامیوں کے واسطے بیماری غم میں — ایک تم ہو معالج
نیچر نے، جو کچھ مورتیں تھیں جیش و جنگل میں — تم میں کہیں لاکر

ہم رہتے تھے آزادی سے سایہ میں تمہارے — ہمعمروں میں خوش خوش
پڑھتے تھے، مگر قدر نہ تھی پڑھنے کی معلوم — بیہوش تھے ایسے
وہ بورڈنگ و فیلڈ کے ہر وقت نظارے — ہر طرح تھے دلکش
باہر کہیں جاتے تھے تو پڑ جاتی تھی یہ دھوم — "بنگر وہ آئے"

قسمت سے بچھڑ کر جو چلے آئے ہیں تم سے — ناراض ہو کیا تم؟
تم یہ تو ذرا سوچو اگر پاس تمہارے — اب تک ہمیں رہتے
تو یہ جو نظر آتے ہیں نعم البدل اتنے — غیرت وہ انجم
امیدوں کے افلاک کے چمکتے ستارے — تم میں نہیں رہتے

ڈر ہے کہ الجھ جائے نہ دیوانوں کا دامن — کانٹوں میں یہاں کے
ڈر ہے کہ کہیں سستی ستائے نہ تو سے کو — اور ڈالے الم میں
لو، لیلو جوانی، ہمیں دیدو وہ لڑکپن — باز آئے ہم اس سے

لو، لیلو متانت ، ہیں وہ شوخیاں ویدو جو پہلے تھی ہم میں

تم غیر کی آنکھوں میں کھٹکنے کو نہ جاؤ ایک خار کی صورت
قدرت نے تمہیں دی ہے جگہ بس میرے دل میں بس دل ہی میں آؤ
دکھلاؤ وہ فردوس کا سا جلوہ دکھاؤ بنسکر میری قسمت
لو آؤ بس لب شوخ کے حسرت بھرے دل میں لے نوری بنساؤ

مرآد از کالج

رحمت زمانی۔ مولوی سیّد احمد صاحب کی بیش بہا تصنیف جو علاوہ دلچسپ ہونے کے ایک نہایت سودمند کتاب ہے مصنف نے ازسرنو ترمیم کے بعد نہایت محنت سے تیار کی گئی ہے بیگماتی زبان قلعہ معلّٰی کے محاورے۔ قصّہ کی دلچسپی مختصر یہ کہ کتاب بغیر ختم کئے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا قیمت۔ ایک روپیہ (عہ)

مہر افروز بیگم۔ یہ وہ کتاب ہے جو ڈھونڈھے نہیں ملتی تھی اور اب عصمت ایجنسی نے نہایت نہایت محنت و صرف سے تیار کی ہے قصّہ کی دلآویزی زبان کی سلاست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے قابل مصنف مولوی سیّد احمد صاحب کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے قیمت ۸

لڑکیوں کی انشا۔ حامیان تعلیم نسواں کی عرصہ سے خواہش تھی کہ کوئی انشا لڑکیوں کے واسطے مولوی محمّد عبدالراشد صاحب الخیری کی قلم سے نکلے لطف زبان کے واسطے کچھ لکھنا بے سود ہے ہر خط ایسا موثر ہے کہ ایک ایک حرف کلیجہ پر گڑتا ہے قیمت ایک روپیہ (عہ) ناظرین عصمت و تمدن سے آٹھ آنہ (۸)

منیجر عصمت و تمدن
دہلی سے طلب کیجئے

علم الحرکات اور مسلمان

علم الحرکات کو میکانکس (Mechanico) کہتے ہیں اور یورپین زبانوں میں کلوں کے واسطے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کی مخرج پر جب غور کیا جاتا ہے تو یونانی زبان میں ملتا ہے۔ پروفیسر میک مارڈوی (Prof. Mc Mordie) لکھتا ہے کہ میکانکس یونانی لفظ ہے۔ اور اس کی معنے علم الحیل یا علم الحرکات ہیں۔ شمس العلماء مولانا شبلی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ یہ فن آجکل بہت ترقی کر گیا ہے لیکن اس کا وجود بہت قدیم زمانہ سے ہے۔ یونان میں وہ علمی حیثیت سے حاصل کیا گیا ہے اور مسلمانوں نے جب یونان کے علوم و فنون سیکھے تو علوم پر قناعت کی نہیں کی بلکہ اس فن سے عملی کام بھی لیئے عربی میں اسکا نام علم الحیل ہے لیکن اصل لفظ سے صورت بدل کر مستعمل ہے یعنی منجنیق۔ اس کی اشتقاق میں ہمارے علماء لغت نے سخت غلطیاں کی ہیں یہ دراصل ایک یونانی لفظ کا معرب ہے۔ سب سے پہلے ایجاد مسلمانوں نے اس فن کی ہارون رشید کے عہد میں کی۔ یہ گھڑی تھی[1] اور ہدیۃً شارلیمن شہنشاہ فرانس کو بھیجی گئی تھی۔

فرانس کا مشہور مورخ سیدی یو لکھتا ہے کہ اس گھڑی میں چھوٹے چھوٹے بارہ دروازے تھے۔ ہر گھنٹہ ختم ہونے کے بعد ایک دروازہ کھلتا تھا اور جس قدر گھنٹوں کے تعداد ہوتی تھی اتنی ہی تانبے کی

سلہ۔ اس کا بنانے والا ابو معشر فلکی مشہور منجم تھا ۱۲

گولیاں ایک آہنی پلیٹ پر گر کے آواز دیتی تھیں اور جب دور پورا ہو جاتا تھا تو بارہ سوار دروازوں سے نکل کر گھڑی کے بالائی سطح پر گھومتے تھے۔

بنجمن[1] نے اس کے علاوہ دمشق کی گھڑی کا حال لکھا ہے اور ڈاکٹر لیبان[2] نے اس بیان کی تائید کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ اہل عرب نے لنگر دار (پنڈلم) گھڑیاں بھی بنائی تھیں جو یانی کی گھڑیوں سے مختلف نہیں مگر پروفیسر پامر[3] ہارون الرشید والی گھڑی سے اس بنا پر انکار کرتے ہیں کہ عرب مورخین نے اس کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ پروفیسر صاحب کا یہ عذر قطعی نہیں مانا جا سکتا جبکہ ہم یورپین مورخین کے مستند تصانیف میں اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ پاتے ہیں۔ عرب مورخین نے تو بہت سے واقعات نظر انداز کر دیے ہیں یہاں تک کہ شارلی مین کے سفارت کا بھی حال انہوں نے نہیں لکھا لیکن پروفیسر سیدی یو نے اس بارہ میں مارجنی اور ایجی نارٹ[4] کے شہادتیں پیش کی ہیں علاوہ ازیں یہ تمام ہدایا فرانس کے معبد پانتی نیون میں موجود ہیں مگر گھڑی ان میں نہیں ہے شمس العلما مولانا شبلی صاحب نعمانی نے علم الحرکات کے اُن کتابوں کی فہرست دی ہے جو یونانی زبان سے مسلمانوں نے ترجمہ کیں ہم ذیل میں اس کی نقل درج کرتے ہیں:۔

نام کتاب	مصنف
کتاب عمل الآلۃ التی تطرح البنادق	ارشمیدس۔

[1] یہ سیاح سنہ۱۱۶۰ء میں فلسطین گیا تھا اور جامع مسجد دمشق کی گھڑی کا حال اسی لکھا ہے [2] ڈاکٹر لیبان فرانس کے مشہور عالم ہیں۔ ان کی کتاب "تنقیدات بابت عرب" کا ترجمہ اردو میں "تمدن عرب" کے نام سے ہو گیا ہے [3] مسٹر پامر کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کی پروفیسر تھے [4] ایجی نارٹ شارلی مین کے دربار میں تھا

مصنف	نام کتاب
ہرقل	کتاب الدوائر والدوالیب . . . .
ایرن	کتاب فی الاشیاء المتحرکۃ من ذاتھا۔
ایرن	کتاب الۃ الزہر البوقی
ایرن	کتاب الزالرشی
مارطس	کتاب الدوالیب
ایضاً	کتاب الارغنون
ایرن	کتاب فی الجر الثقیل

مولانا صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ان میں سے اول و آخر کتابیں آج بھی لندن کے کتب خانہ برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔ پہلی کتاب میں تصویریں بھی بنی ہوئی ہیں۔

یونانی تصانیف سے مطلع ہوکر مسلمانوں نے خود اس فن میں نئے اختراعات کیں۔ اور مستقل کتابیں لکھیں۔ بنو موسے نے جو مامون کے دربار کا مشہور فلاسفر تھا اس فن میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام غلطی سے کتاب الحیل مشہور ہوگیا۔ یہ نہایت محققانہ اور نادر تصنیف ہے۔ مورخ ابن الندیم نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں کئی طرح کے عملوں کا بیان ہے۔ مورخ ابن خلکان نے جو ساتویں صدی میں موجود تھا لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب کو پڑھا ہے۔ اس میں عجیب نادر باتیں ہیں۔ اور اس فن کی تمام کتابوں سے افضل ہے۔ اس کے علاوہ علامہ[1] ابن جبیر اندلسی نے جامع مسجد دمشق کے گھڑی کا مفصل حال لکھا ہے۔ خلیفہ

[1] علامہ ابن جبیر نے ۵۷۸ھ میں تمام ایشیا کا سفر کیا تھا اس کا سفرنامہ رحلۃ ابن جبیر۔ ہالینڈ میں چھپ گیا

المستنصر باللہ نے اپنے نام سے بغداد میں جو مدرسۂ مستنصریہ قایم کیا تھا اُس کے صدر دروازہ پر بھی ایک بڑی گھڑی لگی تھی۔واضح ہو کہ یہ گھڑیاں اتنی بڑی ہوتی تھیں جیسے آجکل گرجوں کے دروازوں پر ہوتی ہیں۔گھڑیوں کے علاوہ اور آلات کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔سلطان عبدالرحمن دشاہ مراکو کے پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ کا ایک قرآن مجید تھا۔اُس نے اُس کے واسطے ایک کمانی دار صندوق طیار کرایا تھا۔

البتہ افسوس یہ ہے کہ اس فن سے مسلمانوں نے کوئی بڑا کام نہیں لیا مگر کتابیں شرح وکھیں اور ترجمہ کیں اور بہت ممکن ہے کہ قدیم زمانہ میں اور بھی آلات ایجاد ہوئے ہوں مگر ہم اُن کا پتہ بتانے سے معذور ہیں۔

محمد شفیع الدین خاں۔مراد آبادی

ہمارے محترم مولوی محمد شفیع الدین خان صاحب۔ایم۔آر۔اے۔ایس نے حال میں جنگ اٹلی و ترکی کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی ہے جس میں اِس ہولناک اور قیامت خیز معرکہ پر کافی روشنی ڈالی ہے مختلف اخبار و رسائل سے اقتباس اس قابلیت سے کیے ہیں کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد طرابلس کی مفصل تاریخ۔لڑائی کا سبب ایطالیہ کا قصد اور ترکی کی پوزیشن پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے +

ہمیں اُمید ہے کہ ناظرین تمدن ہمارے محترم دوست کی اس محنت کی داد دیں گے قیمت ۵ر صاحب مصنف سے محلہ بیٹی۔مراد آباد سے ملسکتی ہے +

زلزلہ

ہم نے چند قبل براکین یعنے کوہہائے آتش فشاں کا بیان لکھا تھا اور اُن کی حقیقت اور اصلیت کو دکھلایا تھا۔ اب ہم زلزلے کا بیان لکھتے ہیں۔ زلزلہ کو فارسی میں بومہن کہتے ہیں اور زمین لرزہ بھی کہتے ہیں۔ یہ امر قابل بیان ہے کہ براکین اور زلزلوں میں باہمی تعلق ضرور ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی بڑے برکانی التہاب کے پھوٹ پڑنے سے پہلے اوس پہاڑ کے اطراف و حوالی کی زمین میں زلزلہ واقع ہوتا ہے گویا وہ برکانی طاقت تڑپکر اندر سے باہر نکل آنا چاہتی ہے۔ اور یہ بھی مشاہدہ ہوا ہے کہ کسی ضلع یا حصۂ ملک میں جہاں پے در پے زلزلہ آیا کرتا ہے۔ اگر وہاں کوئی بڑا برکانی التہاب واقع ہوجائے تو ان زلزلوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے اس کا عکس بھی صحیح ہے۔ مثلاً امریکا جنوبی کے انڈیز پہاڑ کے سلسلہ میں جب تنگاراگوا اور کوٹوپکسی چوٹیوں پر دھواں نکلنا موقوف ہوجاتا ہے تو لوگ زلزلے کے آنے کے منتظر رہتے ہیں۔

کلبیریا کے ۱۷۸۳ء کے مشہور زلزلوں میں اسٹرومبولی کے چھوٹے مخروط کا التہاب موقوف ہوگیا۔ اور یہ ان کی تاریخی مدت میں پہلا وقوع تھا۔ کیونکہ اس کے ساکن ہونے کا ذکر یا بیان کہیں نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح سے سلسلۂ انڈیز میں پیٹو سے ۱۷۹۷ء میں سیاہ دھوئیں کا نکلنا موقوف ہوگیا جو ایک کثیف ستون کی طرح بلند ہوتا تھا۔ اور یہ امر پہلی فروری کو دفعۃً واقع ہوا

ساتھ ہی اس کے شہر ریو بمبا کو زلزلے نے ڈھاکر مسمار کر دیا جس میں چالیس ہزار جانیں تلف ہوئیں۔

مسٹر مالٹ نے جو زلزلوں کے بہت نامی محقق ہیں دنیا کا ایک نقشہ تیار کر کے اوس میں اون ملکوں اور خطوں کو جن میں زلزلے ہوا کرتے ہیں۔ بھورے رنگ سے دکھلایا ہے۔ اور زلزلوں کی کثرت و قلت کو اس رنگ کے ہلکا یا گہرا کرنے سے ظاہر کیا ہے۔ اس نقشہ کے دیکھنے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں رنگ زیادہ گہرا ہے وہ ایسے مقامات ہیں جہاں پر کانی مخزو دہانے بھی ساتھ ہی ساتھ نظر آتے ہیں۔ جس سے زلزلوں اور براکین کا باہمی تعلق معلوم ہوتا ہے۔ کوئی آتش فشاں ایسا نہیں ہے جو گہرے رنگ کے قطعہ سے خارج واقع ہوا ہو۔ اور نہ کوئی گہرے رنگ کا قطعہ ایسا ہے جو براکین سے خالی ہو۔

زلزلوں کی کثرت۔ مسٹر مالٹ نے زلزلوں کی ایک فہرست تیار کی ہے جس میں (۱۶۰۶) سال قبل مسیح سے ۱۸۴۲ء تک یعنے ساڑھے چونتیس سو برس کے مشہور زلزلے درج ہیں۔ اس کے بعد ایک فرانسیسی محقق موسیو پیراں نے ایک اور فہرست مرتب کی جو ۱۸۵۰ء تک زلزلوں کو دکھاتی ہے۔ اور (۳۴۵۶) سال میں (۶۰۳۱) ایسے زلزلے واقع ہوئے ہیں جن کا حال قلمبند ہوا ہے۔ مگر منجملہ ان کے تقریباً نصف ۱۸۰۰ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان واقع ہوئے ہیں)۔ پس اگر اس پوری مدت کے زلزلوں کا واقعہ اسی احتیاط کے ساتھ درج کیا جاتا جو ان پچاس سالوں میں درج ہوا ہے۔ تو غالباً کل تعداد اس طویل مدت میں دو لاکھ سے کم نہ ہوتی۔ اور ان پچاس سال میں بھی بہت سے زلزلے غالباً ایسے مقامات میں

واقع ہوئے ہوں گے جہاں متمدن انسان کا گذر نہیں ہوا ہے۔ یا شاید سمندر کے اندر واقع ہوئے ہوں گے جن کا داخلہ منا محال ہے فی الواقع گذشتہ صدی سے ہی زلزلوں کی اطلاع دور دور مقامات سے آنے لگی ہے جس سے ہمکو زلزلے کے وقوع کی بروقت خبر ملجاتی ہے۔

اگر ہم صرف بڑے زلزلوں کا ہی خیال کریں تو اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے مسٹر مالٹ نے بڑے زلزلے کی یہ تعریف لکھی ہے کہ اُس کا اثر ایک ایسے دایرہ یا رقبہ پر محسوس ہو جس کا قطر ایک ہزار سے بارہ سو میل تک ہے۔ اور اگر قطر چار سو میل ہو تو اسکو انہوں نے درجہ دوم میں رکھا ہے۔ اور جن زلزلوں کا اثر صرف سو میل سے ڈیڑھ سو میل تک کے عرض و طول میں محسوس ہو اون کو درجہ سوم میں قرار دیا ہے اُن کی فہرست کے مطابق اوس طولانی مدت پر صرف (۲۱۶) بڑے زلزلے واقع ہوے ہیں لیکن فقط سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک میں (۵۳) بڑے زلزلے واقع ہوئے یعنی ان پچاس سالوں میں کل بڑے زلزلوں کا ربع۔

زلزلوں کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمین کے کسی نہ کسی حصہ میں بطور اوسط ہر سال ایک بڑا زلزلہ واقع ہوا ہے۔ اگر ہم دوسرے قابل اعتنا زلزلوں کو بھی ان میں شامل کر دیں تو فی ماہ آٹھ کا اوسط ہوگا۔ مسٹر مالٹ کی فہرست کے چھپے چار سالوں میں (۴۰۶) زلزلے درج ہیں جس کا وہی اوسط نکلتا ہے یعنی (۴۸) مہینوں میں بحساب فی ماہ ۸ ½ (۴۰۸) زلزلے ان کی کثرت کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں زلزلوں کے وقوع کی اطلاعات ہر جگہ سے پہونچتی ہیں اور فوراً ان کو داخل

درج کردیا جاتا ہے۔ نہ یہ کہ اس زمانہ میں زلزلے کثرت سے ہوتے ہوں۔ بہرحال نتیجہ بدیہی ہے کہ یہ حرکت زلزالی زمین کے کسی نہ کسی حصّہ میں ضرور محسوس ہوتی ہے۔ جو کسی اندرونی قوت کی وجہہ سے وقوع پذیر ہوتی ہے اور بیشک یہ قوت وہی حرارتِ شدید اندرون کرۂ ارض ہے جو زمین کے قشر پر عمل کرتی ہے۔

آیات طبعی زلزلہ مسٹر مالٹ زلزلہ کی یوں تعریف کرتے ہیں کہ زلزلہ ایک موج یا موجوں کا تسلسل ہے جو قشر زمین میں سے بڑی سرعت کے ساتھ گذرتا ہے۔ صدمہ کی حقیقی سرعت سیر یعنے زمین کا حرکت کرنا کسی مقام پر بہ نسبت سرعت سیر موج بہت کم ہے۔ صدمہ کی سرعت سیر میں زمین کی سرعت حرکت زمین کی سطح کا نیچے اوپر ہونا ہے جو ان کے کودنے کی حرکت سے زیادہ نہیں ہے لیکن اوس موج کی سرعت سیر ہر دو اوس خطہ میں توپ کے گولے کی رفتار کی نصف ہے۔ یہ موج کی تحت الارضی مقام سے شروع ہوتی ہے جسکو غار یا شگافِ مرکزی کہتے ہیں۔ اور موج اس مرکز سے ہر سمت کو مساوی تیزی کے ساتھ جاتی ہے۔ یہ موج اوس سطح تک جو صریحًا اوس غار مرکزی کے اوپر واقع ہے عمودی سمت میں پہونچتی ہے۔ یعنی ایک خط کی سیدہ میں جسکو اونہوں نے عمود مرکزی سے موسوم کیا ہے۔ اور جیسے جیسے یہ موج اوس عمود سے دور تر ہوتی جاتی ہے اوسکا ترچھا پن یعنی انحراف بھی بڑھتا جاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اسکے اسکی قوت بھی گھٹتی جائے گی۔ یہاں تک کہ بتدریج مفقود ہو جائے۔

مسٹر مالٹ نے دکھلایا ہے کہ عمارات کی درزوں اور شگافوں سے اور نیز دوسری علامتوں سے اس موج کی سمت اور اس کے زاویہ خروج کو

کیونکر دریافت کرسکتے ہیں۔ اور اوس سے غار مرکزی کے موقع اور عمق کو یعنی جہاں سے اِس موج کا آغاز ہوا ہے کس طرح سے حساب کرکے معین کرسکتے ہیں۔ اُن کی کتاب اصول مشاہدات زلزلہ میں اونہوں نے اُن قواعد کے استعمال کا طریقہ تبلایا ہے جن کے ذریعہ سے اُنہوں نے ۱۸۵۷ء کے کلبیریا کے زلزلہ کے متعلق دریافت کیا تھا کہ غار مرکزی اوس زلزلے کا ایک ضلع کے نیچے تھا جو موضع کالگیان کے قریب اور تقریباً ساٹھ میل بجانب شرق و جنوب شرق شہر نیپلز سے دور تھا۔ اور جس کا افقی طول نو میل اور ارتفاع تین میل تھا۔ اور مرکز پوسنے چھ میل سطح زمین کے نیچے واقع ہوا تھا۔ اُن کے حساب سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمین کی سطح کا تموج اوپر نیچے تین چار میل سے زیادہ تھا اور اس کی سرعت بارہ فٹ ثانیہ تھی۔ مگر اس موج کی سرعت مرور ملک کے ایک طرف سے دوسری طرف بحسب اختلاف مواد ارضی دا انجار ثانیہ سات سو فٹ سے ایک ہزار فٹ تک تھی +

زلزلوں کے نتائج و اثرات۔ زلزلوں کے مختلف نتائج کی تفصیل بیان کرنے کے لیے کتابیں چاہئیں مسٹر مالٹ کی مختلف تصانیف۔ ڈاکٹر ڈابینی کی کتاب براکین۔ اور لائل کی اصول جیالوجی میں اس کے عجیب و غریب بیانات درج ہیں۔ کلبیریا کے ۱۷۸۳ء کے زلزلوں میں اکثر شہروں کی سڑکوں کے تپھر ہوا میں اڑکر بالکل اُلٹ گئے تھے۔ عمارات کی بنیادیں اور کنوؤں کے حلقہ بعض جا سے باہر پھینک دیئے گئے تھے۔ زمین میں لمبی خمدار دریں اور شگافیں پیدا ہوگئی تھیں۔ جن میں سے بعض تو ویسی ہی کھلی رہ گئیں اور بعض دوبارہ بتدریج زچ گئیں اور بعض تو دفعتہً بند ہوگئیں۔ مدور گڑھے اور شعاعی شگافیں بھی کہیں کہیں نمودار ہوئیں۔ زلزلوں کے

اثر سے اکثر بڑے بڑے قطعات اور چٹانیں بلندیوں پر سے اُکھڑ کر نیچے اُتر آئیں۔ اور ایسی زمین لرزوں سے ندیوں کے درے اور وادیاں بند ہو کر ندیوں کا پانی چڑھا جس سے طغیانی ہو کر بہت سے ملکوں پر پانی پھر گیا اور دریا برد ہو گئے ۔

جب سمندر کے اندر زلزلہ ہوتا ہے تو کنارہ کی زمین کے تموج و لرزش کی ایک بہت بڑی موج زمین پر آ کر ٹوٹتی ہے۔ اور زمین کی سطح کو دھو دھلا کر جو کچھ اوسکو غنیمت میں ملتا ہے سمندر میں بہا لیجاتی ہے ۱۷۵۵ء میں شہر لزبن پایہ تخت پرتگال میں جو بہت بڑا زلزلہ آیا۔ اوس کا مرکز لزبن کے مغرب کی جانب سمندر کے اندر تھا جس سے زلزلہ کی موج نے زمین کو ترچھا ہلا دیا اور مکانات ایسے گرتے گئے گویا تاش کے گھروندے تھے۔ اس کا اثر بہت دور دور تک محسوس ہوا۔ اسپین۔ الجیرز۔ سوئیزرلینڈ۔ جرمنی۔ فرانس۔ ناروے۔ ڈنمارک۔ انگلینڈ۔ آئرلینڈ اسکاٹ لینڈ بلکہ شمال میں آئسلینڈ میں بھی نہ صرف زمین کو لرزش ہوتی بلکہ ندیوں۔ دریاؤں اور سمندر کے پانی میں بھی جنبش اور تلاطم پیدا ہوا۔ اس کے وقوع کے دس گھنٹے بعد امریکہ کے جزائر کے اطراف میں سمندر میں ایسا جوش پیدا ہوا کہ پانی اُس کا کئی فٹ تک بلند ہوتا رہا۔ اس کے بعد برابر دو مہینے تک پرتگال۔ اسپین۔ شمالی افریقہ اور اٹالی میں خفیف جھٹکے برابر محسوس ہوتے رہے۔ اور شمالی امریکہ۔ اور نیو ہیمپشر میں چند زلزلے واقع ہوئے۔ خلاصہ یہ کہ اُس رقبہ اور اُس گرد و نواح میں کئی سال تک زلزالی حرکات برابر جاری تھے۔

گذشتہ صدی میں مکسیکو میں بہت شدید زلزلے مسی سی پی کے تگاب میں

اور ہندوستان و نیوزلینڈ اور دنیا کے اکثر حصص میں واقع ہوئے ہیں جن کی ایک ہی سی حالت تھی کراکاس ۱۷۹۰ء کے زلزلے میں صدمہ کی سرعت سیر ایسی شدید تھی کہ گویا کسی نے زمین کے اندر بہت بڑی سرنگ کو آگ دیدی ہو۔ اکثر لوگوں کی لاشیں لاکلکا کے پہاڑ پر جا پڑی تھیں جو لکین کی پہاڑی ندی کے اوس پار واقع ہے۔ مسٹر مالٹ نے اول لاشوں کے ارتفاعی اچھالنے کو سو فٹ تخمینہ کیا ہے یعنی ہوا میں سو فٹ بلند ہوکر گری تھیں جس سے نتیجہ سطح زمین یعنے صدمہ کی تیزی فی ثانیہ اسی فٹ حساب سے نکلتی ہے۔

جس زلزلہ نے کراکاس کو [illegible] کے [illegible] ڈھیر بنا دیا تھا۔ اور جنوبی امریکا کے حوالی و اطراف کو مرتعش کر دیا تھا ۱۸۱۲ء کے اوایل میں واقع ہوا۔ اوس وقت آسمان کی گرج سے بھی زیادہ بلند آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اور کراکاس کے قرب و جوار کی زمین کھولتے ہوئے سیال کی سطح نظر آتی تھی۔ لور ڈیلرا کے مرتفعہ حصہ میں بہ نسبت پست میدانوں کے زلزلہ کے صدمات کی شدت زیادہ ترتھی اور یہ یہ صدمات چند روز تک برابر جاری رہے پانچویں اپریل کو زمین کی سطح کا پست بلند ہونا کئی گھنٹوں تک برابر جاری رہا۔ یہ صدمات جو ۲۶ مارچ سنہ مذکور سے شروع ہوئے تھے آخر میں جب ۲۲ اپریل کو سینٹ کا کوہ آتش فشاں پھوٹ پڑا ختم ہوگئے۔ اس کا التہاب سو برس بعد اب واقع ہوا تھا۔ اور اس کے پھوٹنے کی آواز کراکاس میں سنائی دی جو اس سے پانچسو میل دور ہے۔ ہمبولڈ کا عقیدہ یہ ہے کہ آواز زمین کے ذریعہ وہاں تک پہونچی تھی یہ بھی ایک مثال براکین و زلزلوں میں باہمی تعلق کی ہے کہ جہاں براکین ملتہب ہوتے ہیں

اُس کے قرب وجوار میں زلزلہ موقوف ہوجاتا ہے +

قوۃ زلزالی کی طاقت مسٹر مالٹ نے زلزلوں کے مرکز کے تہہ عمق کو (۳۵) میل یعنے (۱۸۵۰۰۰) ایک لاکھ پچاسی ہزار فٹ معین کیا ہے۔ اور یہہ بلا لحاظ صدمۂ ابتدائی کے ہے۔ مگر اسکو ایک مافوق التصور طاقت کا اثر سمجھنا چاہیئے جس سے ایسے ایسے نتائج ظاہر ہوتے ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ اور جن سے ایسے وسیع رقبات متاثر ہوتے ہیں۔ ایک ایسی طاقت جو کئی میل ضخیم صخور اور طبقات کو اس طرح اچھال دے۔ اور اونمیں ایسا تموج پیدا کرسکے جس کا اثر پانچ چھہ سو میل تک ہر طرف محسوس ہو ضرور ایسی قوت ہوگی جس کا ہم تصور اور اندازہ ہی نہیں کرسکتے۔ جیسے جیسے ہم مرکز تشوش سے دور ہوتے ہیں اوس کا تشوشی اثر بھی گھٹ جاتا ہے۔ یہہ صدمات سطح زمین پر کیسے ہی شدید اور مخرب ہوں اور انسان اور اُس کے مساکن کو کتنا بھی ضرر پہونچائیں۔ اور زمین اور پہاڑوں کو ہلادیں مگر یہہ سب صدمات بمقابل اوس صدمۂ شدید کے جو مرکز تشوش کے قریب واقع ہوتا ہے۔ ایک بہت چھوٹی کسر سمجھی جائے گی۔ زمین کی سطح اس موٹے قشر یا پپڑی کے سبب سے بہت کچھ محفوظ ہے۔ اور اوس صدمہ کا پورا اثر کہاں اوس کا ایک خفیف جزو بھی یہاں تک نہیں پہونچتا ہے زلزلہ کی ان سطحی طبعی آیات کو جن سے اس قدر صدمہ پہونچتا ہے فی الحقیقت اوس شدید صدمہ کا ایک خفیف اثر سمجھنا چاہیے جو مرکز پر واقع ہوتا ہے۔

ہم اپنے آیندہ مضمون میں سطح زمین کی خفیف حرکات کا ذکر کریں گے جو خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

میرزا مہدی خاں

وقار آباد۔

بخت خفتہ

بامید سحر کلفت شب کیا کیا اٹھائی ہے
چھپے جس وقت سب تارے تو مجھکو نیند آئی ہے

سوا نیزہ پہ ہے خورشید یورپ کی ترقی کا
اُٹھو اے سونیوالو وقت قسمت آزمائی ہے

خدارا قوم کو اپنی بچاؤ ہرزہ گردی سے
یہی ہے حسن اخلاق اور یہ شانِ رہنمائی ہے

مبارک ہو مبارک بخت خفتہ قوم کا جاگا
تصدق اس کے جس نے یہ صدا مجھکو سنائی ہے

ذرا سوچو کہ وہ بھی تو تھی نوعِ بشر سے
جنھوں نے شاہد اسلام کی رونق بڑھائی ہے

کمال اسطرح کھینچکر تہ بہت جو ملنا رشتہ ہے
دل نازک پہ اک نشتر انکی کج ادائی ہے

اگر ہم ناصح مشفق ہے بھی تو نتیجہ کیا
ہمارے منہ پہ کہتے ہیں ہمارا کیا صفائی ہے

امیں دولت ان کا تمکو کیا تھا اس لیے ہم نے
لیئے دیتے ہو ضائع جو بزرگوں کی کمائی ہے

کدھر لیجاؤں یا رب میں دل آشوب گستر کو
بچھا چاروں طرف دام فریب و دغائی ہے

تو قابل ہے اگر اب بھی تو تمکو قتل کر ڈالے
ہٹو بس جاؤ کیا اوچھی یہ تلوار اک لگائی ہے

کوئی ہمدرد ہو تو زخم دل کے اسکو دکھلائیں
تماشا دیکھنے والی تو یہ ساری خدائی ہے

ہم اخوان یوسف کیطرح ہیں خون کے پیاسے
نفاق و کبر نے وہ آگ اس گھر میں لگائی ہے

پڑی ہے اک گرہ دل میں ہمارے دست نکبت سے
مدد اے ناخن ہمت دم عقدہ کشائی ہے

جگا اے نالۂ محشر طراز اسکو جو سوتا ہے
کہ اس دنیا کے ساتھ اب دین بھی برباد ہوتا ہے

عزیز لکھنوی

ناظرین تمدن براہ کرم خط و کتابت مین نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دین +

بیکن

لوگوں کو سخت تعجب ہوتا تھا کہ سر نکولاس بیکن Sir Nicholas Bacon جو ایک نہایت نامور اور باقتدار شخص تھا، اور جس پر ملکہ الزبتھ کی چشم تلطف کا کچھ ٹھکانا نہ تھا، اس کا بیٹا ملکہ کی عنایت خسروانہ سے محروم رہے، خواہ سیسل Cecil ہزار ہی اس کی مخالفت پر کیوں نہ تلے رہتے ہوں، تاہم اس کی نہیں تو اس کے باپ کی قدر و منزلت و حسن خدمات کے لحاظ سے کچھ تو ہونا چاہیئے تھا۔ اس کا سبب ہماری تلاش سے کچھ دور نہیں، وجہ یہ تھی کہ نوجوان بیکن نے حقوق عامہ کی حفاظت کرتے ہوئے، جوش طبیعت میں آکر اپنی دھواں دھار تقریروں سے ہاؤس اوف لارڈز (طبقۂ امرائے) کے دھوئیں اڑا دیے تھے اور حملوں کی بجلیاں کوندا دی تھیں۔ مسئلہ یہ درپیش تھا کہ ملکی ضرورت کے رفع کرنے کے لیے روپیہ فراہم کیا جائے۔ اور بیچارے غریب غربا کا گلا گھونٹا جائے۔ بیکن نے اسکی مخالفت میں جان تک کی لڑا دی تھی، اس بات پر زور دیا تھا کہ طبقۂ شوریٰ اور امرائے کی کانفرنس اور باہمی صلاح و مشورہ سے اس مشکل پیچ کو سلجھایا جائے۔ امرا و وزرا کی مخالفت اس زمانہ میں ایسے گناہ کبیرہ سمجھے جاتے تھے کہ جب تک انتہا درجہ کی عاجزانہ معذرت نہ کیجائے اور متوسلین کا پیچ میں پڑنا جمایا جائے، معافی ناممکن تھی بیکن اس کو خیال میں لایا اور نہ اسکی کبھی سلسلہ جنبانی کی۔ برلے Burleigh اور سیسل Cecil نے اس موقع کو غنیمت خیر مترقبہ بنایا اور خوب خوب نمک مرچ

چڑھ کر اس تصویر کو ملکہ الزبتھ کے روبرو مفویانہ شان میں دکھایا۔ ملکہ جو پہلے ہی بریٹ کی تحریک سے اس کی زد سے بیزار ہوگئیں تھیں، اب اُن کے شعلہ غضب کی انتہا نہ رہی۔ اس سبب سے بیکن جب کبھی سرکار عالیہ کی خدمت میں ترقی وغیرہ کا التماس کرتا تو اس کا جواب یا تو کچھ جواب ہی نہیں ہوتا تھا یا مصلحت آمیز انکار+

لارڈ برے ایک پرانی وضع کا دور اندیش مستقل مزاج شخص تھا۔ بیکن کی کچھ تو خود ستائی اور بے ثباتی سے وہ نالاں تھا اور کچھ وہ اس امر کو خلاف اصول سمجھتا تھا، بلکہ اُس نے شروع زمانہ سے عہد کر لیا تھا کہ اپنے کسی عزیز یا رشتہ دار کی سفارش ہرگز نہیں کرے گا، بیکن کے مزاج میں تلون ضرور تھا، لارڈ برے اس عادت سے سخت جلتا تھا اور اس کی تلون مزاجی کو پولیٹیکل بے ثباتی سے تعبیر کرتا تھا، اور یہ جرم اس کی نگاہ میں ناقابل عفو تھا۔

بیکن نے اپنے رشتہ داروں کی رشتہ امید کے آخری تسمہ کو بھی یک لخت منقطع کرنے کا عزم بالجزم کر لیا اور ارل اوف ایسکس[۱] کی پارٹی میں جا ملا

[۱] ارل اوف ایسکس: - رابرٹ ڈیورو دارل اوف ایسکس Robert Devereux Earl of Essex ۱۵۶۶ء میں پیدا ہوا۔ دربار میں حاضر ہونے کے تھوڑے ہی روز بعد ملکہ کے چاہیتوں میں ہوگیا۔ اور اتنا [illegible] کہ ناقابل تسخیر آرمیڈا کی چڑھائی کے زمانہ میں ملکہ الزبتھ نے اُسے دم بھر کے لیے اپنے سے جدا ہونے دیا، حالانکہ اس نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے کہ میدان کارزار میں اُسے شریک ہونے دیا جائے۔ اس نے نہایت کامیابی کے ساتھ فرانس اور پرتگال کی مہمات سرانجام کیں ۱۵۹۶ء میں اسپین کے خلاف فوج کا کمانڈر مقرر ہوا جہاں سے وہ بے شاد کام پھرا۔ کیڈز کی تسخیر سے اس نے اپنی خدمات کو ممتاز کیا۔ دوسرے سال کی

نوجوان ارل بڑا طباع اور تندخو تھا، اور شوخی طبع بعض اوقات اسے
ملکہ کے حضور میں بھی پایہ ادب سے گرا دیتی تھی جو کئی بار اس کے حق میں سم قاتل
ہو ہو کے رہ گئی اس نے بھی فلک کجرفتار کی عجیب عجیب نیرنگیاں دیکھیں
اقبال جب اس کا اوج پر آیا تو قلمرو سے انگلستان کے عرش کا تارا بنایا
باد مخالفت کا جھونکا آیا تو ایسا گرایا کہ تحت الثرےٰ میں پہنچایا، ملکہ الزبتھ
یا تو اس قدر مہربان تھیں کہ گلے کا ہار بنایا، زمانہ نے پلٹا کھایا تو ایسی
پلٹیں کہ دار پر کھچوایا - ان ایام فرحت فرجام میں ارل انگلستان کی پالٹیکس کے
جہاز کا ناخدا تھا اور لارڈ برلے کا رقیب، بیکن سے اسے ایسی انس
حقیقی اور محبت صادق ہو گئی تھی کہ اسکی رفاقت کا بیڑا اٹھایا، ملکہ سے
بار بار بصد اصرار اٹارنی جنرل شپ attorney gel ship اور سالسٹر جنرل شپ
Solicitor gel ship کی استدعا کی سعی [?] بیکن نے
کچھ نہ چلنے دی، آخرکار مجبوراً ماسٹر اوف رولز master of Rols
کی نسبت نہایت شد و مد سے عرض کی - انتہا یہ ہوئی کہ ملکہ جہاں کار کو باجبر و اکراہ

(بقیہ صفحہ ۵۲) ہم میں وہ ناکام رہا - ملکہ الزبتھ نے جن سے وہ ہمیشہ لڑتا جھگڑتا رہتا تھا اس بار سرد مہری
سے اس کا خیر مقدم کیا - ملکہ کی عنایت و لطف پر بھروسہ کر کے اس نے کچھ وحشیانہ برتاؤ کیا
ملکہ نے اس کے کان پر ایک گھونسا رسید کیا اور کہا میرے سامنے سے دور ہو اور سولی چڑھ
چند ماہ کے بعد ملاپ ہو گیا اور آئرلینڈ کا لارڈ لفٹننٹ مقرر ہوا - ۱۵۹۹ء جہاں بغاوت
کا اندیشہ تھا - آئرلینڈ میں اس کا عہد حکومت ناکام رہا ستمبر میں انگلستان واپس آیا -
شورش بپا کرنے کے جرم میں اسے اس کے مکان میں قید کر لیا گیا - اس نے ایک دستہ فوج سے
مقابلہ کیا چھوٹی سی لڑائی کے بعد وہ پکڑ لیا گیا اور ٹاور میں بھیجدیا گیا - ۱۹ فروری کو بالجرم
بغاوت اسکا ٹرائل ہوا - اور ۲۶ فروری کو پھانسی پر چڑھایا گیا - از ماڈرن سائیکلوپیڈیا

یہ کہہ دینا پڑا کہ آیندہ بیکن کا نام میرے سامنے زبان پر نہ آئے جبکہ متذکرہ بالا عہدے بیکن کے آنکھوں کے سامنے غیروں کو دیدیے گئے تو اس شوعنیت کا دل اپنی بے کسی پر بھر آیا۔ افسردگی اور مایوسی کی گھٹا چھا گئی۔ ارل سے جو بڑا جوہر شناس تھا اس کے غنچۂ دل کی کملاہٹ نہ دیکھی گئی۔ نہایت خلوص دل اور منت قبول سے ٹوکنہام Twickenham میں ایک املاک جس کی حیثیت تقریباً دو ہزار پونڈ یا تیس ہزار روپے کی تھی بیکن کی نذر کی۔ ان دونوں دونوں میں جذب جنسیت اور رسم الفت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ یک جان و دو قالب کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔ بیکن ایسکس ہاوس Essex House (قصر ارل) کی تمام نعمت الوان میں شریک رہتا تھا۔ اس زندگی کی فرط مسرت نے صحبت عیش و نشاط Conf: of Pleasures کے عنوان سے سلسلۂ مضامین لکھوایا۔ خوش حالی اور بے فکری نے سمند طبع پر تازیانہ کا کام دیا، اور ایسے معرکۃ الآرا مضامین لکھے جس پر "قصر علوم" Palace of Learning مختصر شہادت ہے اور جیسا کہ "Gesta Grayorum" کی مضمون نگاری عیاں کرتی ہے، اُس کے لوگوں کے مذاق اور طبیعت میں پورا پورا دخل تھا، جیسے اس کا مضمون سوانگ بھرنا اور کامیاب ہونا Masques Triumphs ظاہر کرتا ہے۔ یہ مضمون ۱۵۹۴ء کی جلد میں نکلا۔

ف Masques Triumphs انگلستان میں بھی تفریح طبع کے عجیب سامان ہیں منجملہ اور ہزارہا کھیلوں اور شوقوں کے ماسکریڈ Masquerade یا امرا و رؤسا اور انکی لیڈیوں کا بھیس بدل کر شب کے وقت یک جا جمع ہونا نئی دلچسپی رکھتا ہے۔ یہ ایک امیرانہ و شاہانہ چوچلا ہے۔ چارلس دوم و جارج چہارم کے

نہسان ضعیف البنیان خطا سے مرکب ہے۔ بیکن کا پایہ گو علمی لحاظ سے نہایت بلند تھا، مگر اسیقدر اخلاقی پہلو سے گرا ہوا تھا۔ شروع زمانہ میں ترقی کے خار دار رستہ طے کرنے میں اُسے بے شمار تشنہ کامیوں کا سامنا ہوا۔ ترقی اُس کے لیے عنقا صفت ہوگئی تھی، اور اوج ہمارے زیادہ دولت حرص و طمع نے تمام لطیف محسوسات پر سیاہی کا پردہ ڈال دیا تھا۔ اب وہ جائز و ناجائز وسائل کچھ نہیں دیکھتا تھا۔ ترقی کے قدم بہرطور آگے بڑھاتا تھا اسی زمانہ میں ارل کا طالع قسمت نصف النہار پر چمک کر برج زحل میں آ رہا تھا۔ آئرلینڈ میں ارل اوف ٹائرن کی سرکردگی میں سرکشی ہوئی۔ ارل کو اس کی سرزنش کے لیے بھیجا گیا۔ بغاوت فرو کرنے میں ارل کی تمام کوششیں بے سود گئیں اور سوئی اتفاق پر اتفاق، اس بیچارے کے اوپر خود مفسدہ پردازی و ہنگامہ برپا کرنے کا الزام لگایا گیا۔ اس جرم کی صحت و سقم پر بحث کرنا ہم مصلحت نہیں سمجھتے، تاہم اتنا ضرور ہے کہ بیکن کو ارل کی شاہ اسکاچ سے کسی قسم کے عہد و پیمان کی پوری خبر تھی، بیکن نے اعتماد و راز داری کا خون کرنے اور اپنے مربی کے گرفتار کرانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ دوبارہ اس نے دخل در معقولات دیا اور عدالت کو مفید

بقیہ صفحہ ۵۸) زمانے میں اس قسم کے میلوں کا بہت زور تھا۔ اس میں شریک ہونیوالوں کی ہئیت کذائی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ لوگ عجیب و غریب قیود سے نمودار ہوتے ہیں۔ تن پر ایشیائی ملک کا لباس اور اس کے مطابق چہرہ پر بیجا یا نقاب، رقص و سرود، ہنسی مذاق، راز و نیاز اسکا مقصد اعلیٰ ہوتا ہے، مدتوں کے بچھڑے ہوؤں کو بھی کلیجہ ٹھنڈا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ لباس کا پہلے سے من سمجھوتا ہو جاتا ہے۔ بیکن نے اپنے مضمون میں اس تفریح کے لطف کو شائستگی کے ساتھ حاصل کرنیکا طریقہ بتایا ہے ۱۲

مفید نکات بتاسکتے ورنہ کوکس Macaulay کے منتشر اظہارات نے عدالت کو مزید شک بنا دیا تھا، اور چراغ امیدمیں جان پڑتی جاتی تھی۔ ارل کی رہائی ظلمات سے نور میں نکلتی آتی تھی۔

پروفیسر گارڈینر Prof. Gardiner کی رائے دونوں پہلو ونیز آئینہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں اس میں کلام نہیں بیکن کا رویہ صحیح طور پر دلالت کرتا ہے کہ وہ حس اخلاقی سے بہت کچھ معرا تھا۔ تاہم ہمارا یہ خیال کہ ذاتی بندشوں کو امور سیاسیہ پر ترجیح دیجائے امور سیاسیہ کی اہمیت پر حصر رکھتا ہے، اور ایسی صورت میں جبکہ بدنظمی اور بدامنی کے دور دورہ کے ساتھ لوگوں کی عزت و حرمت کی خاک ریزی ہو، لوٹ و غارت مچ جائے اور ملکہ کا حق انتخاب وزرا بھی چھن جائے مشکل سے عائد ہوتا ہے۔"

منچلا اور ہر دلعزیز ارل اوف ایسکس الزام بغاوت میں ماخوذ ہوا۔ زمانہ نے ایسا ورق الٹا کہ نام ونشان تک نہ رکھا۔ وہی مخلوق انگلستان جو اس کے دست فاتح پر ہزار جان سے قربان تھی، جس نے قومی ہیرو بن کر کیڈز کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور قوم کی عظمت کو بڑھایا تھا اب بلالحاظ حسن خدمات ایسا رنگ بدلا کہ اسکی خون کی پیاسی ہوگئی۔ ملکہ الزبتھ کے تخت کو ہلا دیا۔ ملکہ مخلوق کا یہ طور دیکھ کے کانپ اٹھی اور بادل ناخواستہ حکم نافذ کرنا پڑا کہ از روئے سررشتہ کاغذات بغاوت تیار کیئے جاویں۔ یہ کام بیکن کے سپرد کیا گیا اس موقعہ پر بیکن نے اپنے محسن و مربی کے ساتھ وہ کفران نعمت اور محسن کشی کی کہ جس سے اس کا دامن صفات ایسی تعلقات سے

لہ Macaulay مترجم بیکن اور اسپیزا وف میکالے میں مندرج ہے۔ پروفیسر

لہ ملکہ الزبتھ نے ارل کے قتل پر اپنی ذات کو معاف نہیں کیا اور مرتے دم تک ارل کی موت کا اسی ملال رہا۔

ا

آلودہ ہوگیا جو اس کی تمام فلسفی اور اخلاقی تصانیف کے سات سات پانی سے بھی دھویا جائے تو صاف نہیں ہوسکتا۔

مقدمہ کی کیفیت کو بیکن نے دل کھول کے رنگا۔ اس کے کمزور پہلوؤں کو خوب آب و تاب سے چلا دیا، اور ہر نکتہ پر ایسی سیاہی ڈالی کہ ملزم بریت کے ہزار سامان کرے تو بھی اس کے لیے بچنا محال ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ارل پر فرد جرم ثابت ہوگئی اور اس نے پھانسی پر دم توڑا۔ یا تو بیکن کے ضمیر نے چٹکیاں لے کے اسے ادھیڑ دیا یا ارل کے یار دوستوں کے طعن و تشنیع نے اس کا نفس تنگ کر دیا، بہرحال اس نے [illegible] میں ایک رسالہ موسومہ معذرت جرم [illegible] شائع کیا۔ ہوا [illegible] عقلی و نقلی کی لطیف سازی کے مزہ میں مصلحت وقت کے اجتہاد سے بھی پیچ و پیچ ہے۔ اسی بنا پر یقین کے درجہ پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے مضمون بعنوان "دوستی" میں جو عبارت "بہت[1] سے اس قسم کے لوگ بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے اسٹیج پر ہم ہمیشہ ایک خاص ترکیب سے کارسازیاں کرتے رہیں گے، اس کا راز صرف ہمیں کو معلوم ہوگا اور کبھی اس کا پردہ فاش نہ ہوگا لیکن [illegible] سمجھے تو آخر ریاکاری ایک [illegible] چیز ہے، اور فی الحقیقت وہ شخص جو ہمیشہ [illegible] کا بہروپ بھرتا ہے اور فطرت انسانی کے تیر [illegible] ایک [illegible] کشتی کی مثال ہے،" اس کا روئے سخن [illegible] بیکن کے [illegible] ہے۔ یہ مضمون بیکن نے ۱۶۰۵ء میں لکھا تھا لیکن [illegible] ۱۶۲۵ء میں شائع ہوئی اس میں اس نے اڑا دیا۔

[1] [illegible]

۱۵۹۷ء میں بیکن کے مضامین اول بار بہت چھوٹی تقطیع پر شائع ہوئے تھے اسکو بیکن نے اپنے آکا بھائی انیتونی Anthony کے نام معنون کیا تھا۔ اس میں دس مضمون تھے (۱) مطالعہ (۲) گفتگو (۳) آداب و اخلاق (۴) دوست اور پیرو (۵) انتخاب شادی Suitors (۶) اخراجات (۷) قواعد صحت (۸) اعزاز و شہرت (۹) فرقہ بندی (۱۰) معاملہ کرنا۔ یہ کتاب مضمون آفرینی، لطف محاورہ اور کمال انشا پردازی میں اپنی نظیر آپ تھی، اور ایسا قبولیت کا جامہ پہنا کہ زبان زد خاص و عام ہو گئی۔

ملکہ الزبتھ کا پرشکوہ دور سلطنت جو یادگار زمانہ تھا قریب الاختتام ہو چلا تھا ملکہ کا دل بے ثباتی اور ریاکاری دنیا سے بیزار ہو گیا تھا۔ چونکہ اسے تحقیق ہو گیا تھا کہ وہ امرا جنھیں وہ دل و جان سے اپنا شیدا جان نثار سمجھتی تھی۔ اسکے پیچھے جی اسکاٹلینڈ کے ہلال نور وز[؎] کو در پردہ مراسم بندگی بجا لا رہے تھے اور ملکہ سے یک گونہ کنارہ کشی کرتے جاتے تھے۔ زمانہ کی بیوفائی اور ملکہ کی جانکاہ تنہائی جس قدر دل سوز تھی اسی درجہ قابل رحم۔ اس کے تمام کہن سال رفقا وزرا شربت مرگ پی چکے تھے۔ برگلے جوان سب کے فائق تھا ۱۵۹۸ء میں لقمہ اجل بن چکا تھا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا مسند وزارت پر متمکن ہوا تھا۔

سترھویں صدی کی نئی پود عالم موجودات میں سبزہ خودرو کی طرح جوش مار رہی تھی اس کا فکر نئی تدبیر اور نئے ہوش کے فانوس سے روشن تھا۔ زمانہ کی نئی افق کے ساتھ کہنہ اصول سیاست کو نت نئی چالوں سے کالعدم فی الوجود کر دیا تھا۔ اس کی تدابیر سیاسیہ کی چاشنی میں لطف ہی اور تھا۔ اسکاٹ لنڈ کے مہر کے پرستش کرنے والوں میں بیکن سب سے چار قدم آگے تھا۔ یہ ظالم تو ایک

؎ ہلال نور دز جو بعد میں جیمس شاہ انگلستان و اسکاٹ لنڈ ہوا ۱۲

زمانہ سے شاطرانہ چالیں چل رہا تھا۔ ایک طرف تو ملکہ الزبتھ کی خیر خواہی میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ آئرلینڈ کی مصالحت پر لارڈ سیسل کو ایک ایڈریس دیا جس میں بے انتہا کر و فر سے حق وفاداری و نمک حلالی کا اظہار کیا۔ دوسری طرف انگلستان کی جسری پر شاہ اسکاچ پر ڈورے ڈال رہا تھا اور دام تزویر میں لا رہا تھا۔ جوں ہی کہ انگریزی سلیمان[1] تخت انگلستان پر جلوہ افروز ہوا، بیکن درباری دلپذیر باتوں کے ساز و سامان سے تیار ہو کر خدمت میں حاضر ہوا۔ معزین جو ہر خداداد تھا، جو بات دماغ سے اتارتا ہوگا، وہ شربت کے گھونٹ کی طرح کانوں کی راہ سے دل میں اتر جاتی ہوگی۔ جھوٹ بھی بے معنی اور لطافت سے خالی نہ ہوگا۔ اثر یہ ہوا کہ چند ہی روز ۱۶۰۳ء میں نائٹ ہڈ[2] کا خطاب مع سات پونڈ پنشن کے عطا ہوا۔ یہ پنشن بہ صلہ حسن خدمات انہوں نے برادر بیکن عطا ہوئی جو جیمس James شاہ اسکاٹ لینڈ کا تخت انگلستان پر سریر آرا ہونے کا دل و جان سے خواہاں تھا اور ۱۶۰۱ء میں عالم جاودانی کو سدھار چکا تھا۔ پھر تھوڑے روز بعد بیکن شیر شاہ یا King's Counsel مقرر ہوا۔ اور اس کے صلہ میں چالیس پونڈ سالانہ کا اور عطیہ ہوا۔ بادشاہ کی خوشامدانہ ہمدردی اس پیرایہ میں کی گئی کہ زبان قلم سے تاج و تخت انگلستان و اسکاٹ لینڈ کے "اتحاد" میں کا عقدہ دلائل اور براہین کے فیل مست دوڑا دیے تھے اور تیغ دہن سے تقریروں میں شرارے پیدا کر دیے تھے۔ فی الحقیقت اس باب میں

[1] جیمس اوّل کی طرف اشارہ ہے۔ James I

[2] نائٹ ہڈ۔ کے، سی، ایس، آئی کے خطاب کو کہتے ہیں۔

اس کے مضامین ایک قابلانہ صفت ہیں جس میں اُس نے "اتحاد"
کو تاریخ و شاہد و عقلی و نقلی دلائل کی رُو سے نہایت عالمانہ طور پر ثابت
کرنے کی کوشش کی ہے کہتا ہے "قانون قدرت صحیح قانون مصلحت کے
بالکل مطابق ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں، ایک نظام عالم کی باقاعدگی
سے دوسری نظام سلطنت کی "سلطنت کی سچی عظمت" کی داغ بیل "اتحاد"
انگلستان و اسکاٹ لینڈ کے مضمون میں ڈال چکا تھا۔ اسی پر اُس نے
یہ عبارت چنی ہے وہ کرتا ہے خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ جب جیمس نے اکتوبر
۱۶۰۴ء میں شاہ برطانیہ اعظم King of Great Britain کا لقب
اختیار کیا تو بیکن نے ہی تجویز کرکے برطانی Brittany سے
برطانیہ Britain تصنیف ہوا۔ نیز بیکن نے اتحاد انگلستان اور اسکاٹ لینڈ
پر ایسی ساطع و قاطع دلائل پیش کیں کہ جائنٹ کمیٹی جو اس مسئلہ پر غور کرنے
کے لیے جمع ہوئی تھی اس نے اسکی بنیاد سے سرمو اختلاف نہیں کیا۔
اور اگر جیمس دل پیش نہ بیچ میں نہ نکال کہ ملکی اور غیر ملکی کے حقوق سلطنت
میں کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے، وہ ضد سے پیش نہ آتا تو اتحاد انگلستان
و اسکاٹ لینڈ کی تکمیل اس کی اصلی تاریخ سے سو سال پیشتر ہو چکی ہوتی۔

باقی آئندہ

سید شوکت ہلوی

سلسلۂ تصاویر خدیوان مصر پر ہمارے محترم سید شوکت صاحب
جو مضمون لکھ رہے ہیں وہ آئندہ پرچہ میں درج ہوگا۔

شکوۂ بخت

کامیاب ایک جہاں مجھ سے ہے اور میں ناکام   میری تقدیر کی گردش ہے مگر گردشِ جام
بزمِ عالم میں ملی قسمتِ ساقی مجھ کو   آپ پینے کی قسم سب کو پلانا مرا کام
دل ہے انگور مرا خونِ دل آبِ انگور   خود کوئی لطف نہیں اور ہیں سرشار عوام
جس طرح شیشہ کہ ہے لذتِ مے سے محروم   اور شیشے ہی میں ہے بند شرابِ گلفام
یا وہ میکش ہوں کہ پینے کا ہو وقت نہ جس کو   اور اک سامنے رکھا ہوا لبریز ہو جام
بلکہ وہ خادمِ میخانہ کہ تلچھٹ نہ ملے   اور سیراب مرے ہاتھ سے ہوں مے آشام
حوضِ کوثر پہ بھی پہونچوں تو رہوں تشنہ دہن   خلد میں جا کے پلٹ آؤں میں بے نیلِ مرام
مختصر درد کی لذت پہ مرا عیش ابد   ضبطِ گریہ پہ ہے موقوف مرا شربِ مدام
بزمِ عالم ہمہ معمورۂ عشرت لیکن   اپنے حصے کا نہیں خمکدۂ دہر میں جام
ابر و باد و مہ و خورشید و فلک ہیں کارند   لیکن اپنا تو کسی سے بھی نکلتا نہیں کام
جامِ معکوس سے مانند مہ و مہر و نجوم   صورتِ کاسۂ خالی فلکِ نیلی فام
گرچہ ہم صورتِ ساغر ہیں حبابِ لبِ جو   میری قسمت سے مگر وہ بھی ہیں اوندھے ہوئے جام
اس طرح خونِ تمنا سے مرا دل معمور   موجزن جیسے صراحی میں شرابِ گلفام
بے بہا جنس کی صورت ہوں جہاں میں بیکار   بکنے بھی جاؤں تو بازار میں اٹھتے نہیں دام
خواب میں بھی نہیں ممکن ہے نشاط و عشرت   مٹ گیا عیش کا یوں صفحۂ تقدیر سے نام
تلخکامی میں بھی ہوتی ہے حلاوت کچھ کچھ   لیکن اپنے لیے اتنی سی بھی لذت ہے حرام
اب تو کھانے کو نہیں خونِ جگر بھی باقی   ضعف نے مجھ کو بنایا ہے وہ لاغر اندام
شومیٔ تقدیر کچھ ایسی کہ نہ لی پھر کروٹ   شام سے صبح ہوئی اور ہوئی صبح سے شام

رات آتی ہے بلا خیز شب ہجر کی طرح — ختم ہوتا ہے اگر روزِ مصیبت انجام
دل کو فریاد کی طاقت نہ توانائی ضبط — پاؤں کو تاب گریز اور نہ یارائے قیام
اُن بلاؤں میں گھرا ہوں کہ عیاذاً باللہ — کسی پہلو کسی کروٹ نہیں ملتا آرام
قبر ہے میرے لیے خانۂ تاریک مرا — ایک ہی حال ہے ہر وقت یہاں صبح و شام
اِک دلِ زار مرا اور ہزاروں آفات — اک مری جانِ حزیں اور ہزاروں آلام
کر دیا غم نے گھلا کر مجھے کانٹا ایسا — کہ کھٹکتا ہوں زمانے کی نگاہوں میں مدام
اُنگلیاں میری طرف اُٹھتی ہیں مثلِ مہِ نو — سارے عالم میں نہ ہوگا کوئی مجھ سا بدنام
گردشِ انجم و افلاک کو مجھ سے ہی ضد — دن کی خواہش پہ ہو شب صبح کی خواہش پہ ہو شام
آگ برسے جو مجھے ہو کبھی بارش مطلوب — برق چمکے جو مجھے ہو طلبِ ماہِ تمام
مٹی ہو جائے چھوؤں میں جو طلائے خالص — خاک ہو جاتا ہے ہاتھ میں آتے ہی مرے نقرۂ خام
عالمِ یاس میں دیکھوں جو فلک کی جانب — چشمِ اختر سے ہو پیدا نگہِ خوں آشام
شعلے دریا سے اُٹھیں تشنہ لبی پر میری — ہو مرے غسل کی خواہش پہ خمودِ حمام
ذبح کرنے کو مرے عید دکھائے خنجر — خیریت سے کبھی کٹ جائے اگر ماہِ صیام
دل سے دل ملنے کی تدبیر ہے اک امرِ محال — بلکہ اس نام سے ممکن نہیں توام بادام
دردِ دل زخمِ جگر سوزِ محبت در گور — لوگ سمجھیں کہ جنوں ہے جو مجھے ہو سرسام
ضبطِ گریہ کی یہ کثرت کہ ہو دل اِک دریا — سوزِ غم کی وہ حرارت کہ ہے سینہ حمام
دلمیں وہ مجمعِ حسرت کہ تنفس دشوار — چارہ گر کو یہ گماں ہے کہ ہوا ہے برسام
وصل میں حالِ دلِ زار کی آنکھیں غماز — ہجر میں رازِ محبت کا ہر آنسو نمام
نامرادی جو یہی ہے تو خدا حافظ ہے — بیدل کا ہے یہی دور تو دنیا کو سلام
فرصتِ عمر قلیل اور یہ قصہ ہے طویل — تا کجا شکوۂ ناسازیِ بخت و ایام

دیر تک شب کو اسی فکر میں غرقاب تھا میں

اور گھیرے ہوئے تھے دل کو ہزاروں اوہام

کبھی ناقدریٔ دنیا سے طبیعت مایوس — کبھی امید پیدا ہوس ناقص و خام
یاس و امید میں تا دیر رہی ردّ و بدل — آخرش عقل نے صادر کیئے اپنے احکام
دُرفشاں دل سے ہوئی یوں بزبانِ گویا — کیوں ہے گرشتۂ نیرنگ طلسم اوہام
بدسلوکیٔ زمانہ کی شکایت تاچند — ناکامیٔ مقدر کو کہاں تک الزام
سعی کو یاوریٔ بخت کی کچھ قید نہیں — عرض جوہر کا مقرر نہیں کوئی ہنگام
گرچہ ہر بات میں ہے مرضیٔ خالق مضمر — پھر بھی انسان کو بنایا نہیں قسمت کا غلام
ہے بشر کے لیے تقدیر معمائے ازل — اور تدبیر ہے اک لوحِ طلسم انجام

پڑتی ہے رشتۂ تقدیر میں جب کوئی گرہ
لیتے ہیں اہلِ خرد ناخنِ تدبیر سے کام

اخگر

یاسمین - پروفیسر میرزا محمد سعید صاحب ایم اے مصنف خوابِ ہستی کا یہ لاجواب نتیجہ خیز ناول اور تمدن ایجنسی کی پہلی کتاب جس کا عرصے ملک کو انتظار رہتا تھا تیار ہو گئی ہے یہ کتاب جو درحقیقت حسن و محبت کی زندہ تصویر ہے قابل مصنف نے خصوصیت سے نوجوان طلبا کے واسطے لکھی ہے اور مختلف مضامین پر اس قابلیت سے بحث کی ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

یاسمین جو اس تمام قصہ کی جان ہے اور بنگالہ کی ایک مشہور نازنین ہے اسکی زندگی کا ہر ورق فلسفیات کے پیچیدہ مسئلہ کو نہایت خوبی سے حل کر رہا ہے۔ قابل مصنف کا اسم گرامی کتاب کے لاجواب ہونے کی کافی ضمانت ہے قیمت فی جلد عہ صنیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجئے

ہیئت

جملہ فنون میں سے علم ہیئت کی قدامت امر مسلم ہے علم ہیئت النجوم جس سے اجرام سماوی کی تقسیم ان کے افعال خدمات حرکات کا پتہ چلا مسلمانوں کی جانکاہی اور ان کی تحقیق و تلاش کا سب سے زیادہ ممنون ہے۔

قدرت کے انعامات میں وحشت و تہذیب علم و جہالت، افریقہ کی وحشی اقوام اور یورپ کے متمدن قبیلے دوست دشمن سب کے اعتبار سے یکساں ہیں شب و روز کا انقلاب، موسم کا تغیر و تبدل، آفتاب کا طلوع و غروب، ماہتاب کا عروج و زوال ہر کام کرنے والی آنکھ کے روبرو ہے، لیکن طلسم قدرت پر غور کرنے والی عقل انسانی یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ قدرت کا ہر انتظام صرف انسانی دنیا کے بقا کی ضرورت ہے اور نظام عالم حیات انسانی کی آسائشوں میں سہولتیں پیدا کر رہا ہے۔

وہ بھولا بھٹکا مسافر جو تمام رات جنگل بیابان میں مارا مارا پھرا جس کو منزل مقصود کا پتہ تک نہیں وہ تباہ و برباد ہونے والی کشتی جسکو باد مخالف منزل مقصود سے دور لے گئی اور ملاح کنارہ کی صورت دیکھنے کو تڑپ رہا ہے [illegible] شب تاریک عالم میں ستاروں کو دیکھ کر دلوں کو یہ تسکین [illegible] باقی رہ گیا۔ کاشتکار موسم کا پتہ آسمان سے [illegible] دیکھنے والے ہوا کا رخ پہچان کر بارش [illegible] کے انتظام پیش نظر ہیں اور عقل انسانی [illegible] نتیجہ اخذ کر رہی ہے۔

مصری ہندی چینی قالدی وغیرہ سب کا دعوے ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے علم ہیئت پر توجہ کی اور سائنس کو معراج کمال پر پہونچایا ہم اس وقت ان تمام دعووں پر سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ چین میں ہیئت کی ترقی نہایت قدیم زمانہ میں ہوئی گرھن کا حساب ان کے ہاں پانچہزار برس تک پہلے کا موجود ہے چوہنی یعنے چین کا وہ مشہور شاہنشاہ جو اس سلطنت کا بانی ہے علم ہیئت کا پہلا ماہر تھا جس نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اس علم کی تحصیل میں بسر کیا چوہنی سنہ عیسوی سے تین ہزار برس پہلے موجود تھا اور درحقیقت اس نے علم ہیئت کی کما حقہ قدر دانی کی اس کے بعد شاہنشاہ سوانگ ٹی نے ایک رصد گاہ تیار کی جس میں سال و ماہ کے حساب کی صحت کیجاے اسی کی کوشش اور تلاش کا یہ نتیجہ تھا کہ شمسی اور قمری مہینے برابر نہیں ہوتے تھو انگ ٹی ہیئت کی تلاش میں اس قدر سرگرم اور صحت کے اعتبار سے اس قدر سخت تھا کہ اگر کسی ماہر فن کی کوئی پیشین گوئی غلط ہو جاتی تو اس کا خمیازہ سزائے موت تھی اس کے بعد جب یاؤ تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوا تو اس نے بھی علم ہیئت کی خدمت میں کسر نہ کی اور چینی سال اب تین سو پینسٹھ روز کا اسی کے دوران حکومت کی یادگار ہے۔

ان تینوں کے بعد چیو کانگ کے زمانہ میں بھی علم ہیئت نے سرزمین چین پر بہت معقول ترقی کی مگر افسوس چیو کانگ کے بعد چین سے اس علم کی قدر دانی اٹھ گئی اور سن جی ہانگ ٹی کو اس فن سے ایسی نفرت ہوئی کہ اس نے نہ صرف رصدگاہیں برباد کردیں بلکہ تمام کتابیں بھی جلوادیں مگر مسلمانوں کی خوشہ چینی سے وہ بعد میں مستفید ہوئے۔ کیونکہ اکثر علمائے ہیئت

مسلمانوں کے چین میں پہونچ گئے تھے۔

چین کے بعد جب ہم ہندوستان کی ہیئت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمکو دو مختلف خیالات سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایک فریق کہتا ہے کہ سائنس کی تمام ترقی و سرسبزی کا فخر اس سرزمین کو حاصل ہے بعض کہتے ہیں کہ جب فیثا غورس ہندوستان آیا تو اس نے اس علم کو یہاں بھی رائج کیا۔

ان دو کے علاوہ ایک تیسری رائے بھی ہے کہ نویں صدی میں مسلمانوں کے ساتھ علم ہیئت بھی ہندوستان میں آیا اور ان کے تنزل کے ساتھ یہ بھی کمال کو پہنچکر برباد ہونا شروع ہوا۔

ہمکو اس سے بحث نہیں کہ کونسی رائے درجۂ صحت کے قریب ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ فیثا غورث اور گوتم بدھ کا زمانہ قریب قریب ایک تھا مگر سری کرشن کا زمانہ ان دونوں سے بہت پیشتر تھا اور سری کرشن کی بابت منجموں کی پیشین گوئیاں ہو چکی تھیں جس سے ظاہر ہے کہ علم ہیئت کا وجود اس وقت بھی ہندوستان میں تھا۔

تاریخی واقعات تیسرے خیال کو بھی رد کرتے ہیں اور پہلا ہی خیال ہندوستان کے متعلق زیادہ صحیح معلوم ہو رہا ہے۔

یونانی مورخ قالدی اور مصری اقوام میں علم ہیئت کے قدیم نشانات کے وجود کا اعتراف کر رہے ہیں۔ ان کے سامنے کالڈیا کا صاف مطلع تھا اس سے انہوں نے اس فن کو واقعی ترقی دی۔ اور کسوف و خسوف کے دو سو تئیس دورے جو اٹھارہ سال شمسی میں ختم ہوتے ہیں ان ہی کی تحقیقات کا نتیجہ ہے اسیطرح فنیشی قوم کی کوشش بھی قابل تسلیم ہے مگر ان کی تمام کوششیں جہازرانی پر منحصر ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جہازرانی میں ان کو ستاروں کی پوری تحقیقات کرنی پڑی ہوگی مگر افسوس واقعات انکی محنت کا پتہ نہیں دیتے۔ (باقی)

ایف۔ احمد۔

گورغریباں کی سیر

گیا میں گورغریباں میں ایک دن احسن — اداسی ایسی تہی چھائی کہ گم ہوئے اوسان
سنا تہا میں نے کہ مدفن بہی ایک بستی ہے — مگر جو دیکھا تو ہر عقل ہو گئی حیران
بس ایک مٹی کے تودوں پہ پڑ رہی تہی نگاہ — نہ آدمی کا پتہ تھا۔ نہ تھا گہروں کا نشان
نہ بام و در نظر آیا نہ کہڑکی و غرفہ — نہ کوٹھا تھا نہ اٹاری نہ صحن اور دالان
بغور قبروں کو دیکھا تو بڑھ گئی حیرت — پتہ نہ تھا کہ یہ درویش تھا یہ تہا سلطان
سوائے خاک کے کچھ اور امتیاز نہ تھا — کہ یہ مزار ہے بڈھے کا ہے یہ قبر جوان
یہ وہ جگہ تہی کہ سوتے تھے ہر طرح کے لوگ — بنی تھی سب کے لیے صرف گور تیرہ مکان
ہزاروں ایسے کہ مشہور تھے زمانہ میں — کہ جن کا ایک زمانہ تہا تابع فرمان
ہزاروں ایسے کہ تھی جنکے حسن کی اک دہوم — کہ جنکی ترچھی نگاہیں نکال لیتی تہیں جان
ہزاروں ایسے کہ تھے جنگجو و قلعہ شکن — کہ جن کے پاس تھی ہر وقت تیغ و تیر کمان
ہزاروں ایسے کہ تھے خوش گلو بھی مشہور — کہ چھیڑ ڈالتی تہی دلکو جن کی اک اک تان
ہزاروں ایسے ہی عالم ہزاروں ایسے فقیر — مرید جن کے کمالات کا تہا سارا جہان
غرضکہ سب ہی اوجڑے دیار میں آئے — مگر جو ڈہونڈیئے انکو تو کچھ ملے نہ نشان
میں چپ کہڑا تہا تہی کچھ ایسی بیخودی چھائی — کہلیں تہیں عالم حیرت میں آنکھیں بند زبان
یکایک آئی کسی سمت سے صدائے عجیب — تھی اس طرح کی یہ آواز آشنا تہے نہ کان
"یہ کیسی تجھکو ہے حیرت سمجھ تو لے غافل — جہاں میں جتنے ہیں سب چند روز کے مہمان
فنا ہے سب کے لیے اور یہیں پہ آنا ہے — نہ اس میں شبہ و شک ہے نہ اس میں وہم و گمان
ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید — ز جام دہر مے کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ

(احسن از بمبئی)

فراق

در فراق تو چنانم اے بت محبوب کنم
صبر ایوب کنم گریہ یعقوب کنم

آہ۔ فراق کہنے کو تو ایک چھوٹا سا چار حرفی لفظ ہے مگر معلوم نہیں کس قیامت کا اثر رکھتا ہے کہ اس کے ذکر سے سخت سے سخت دل بھی بھر آتے ہیں۔

یوں تو فراق چاہے کتنے ہی عرصہ کے لیے ہو برا ہوتا ہے مگر ہائے وہ فراق جسے "فراق دائمی" کہتے ہیں کن الفاظ میں بیان کیا جائے کس قدر مصیبت ناک ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

جدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہ ہو　　یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

اور آہ آہ جدائی بھی وہ جدائی جو ہمیشہ کے لیے ہو۔ آہ موت بڑی ظالم ہے ایک کو لیجاتی ہے اور ایک کو چھوڑ جاتی ہے۔ اللہ اللہ جن کے لیے ہزاروں منتیں مرادیں مانی جاتی تھیں اور جن کا سن وصل ابھی اس بے رحم کے شکنجہ میں پھنسنے کے قابل نہ تھا وہ تو چل بسے اور ایک وہ ہیں جو رات دن موت کی آرزو کرتے رہتے ہیں اور یہ جھوٹوں نہیں پوچھتی +

موت کسی عمر کی کیوں نہ ہو بری بیشک بری اور بہت بری مگر ہائے جوانی کی موت نہیں نہیں اکیسواں سال جوانی کیسے کہا جائے نوجوانی کی موت کوئی اہل دل کہے کہ اس موت کے لیے کونسے ایسے الفاظ ہیں جو استعمال کیے جائیں اور کونسا ایسا بے رحم دل ہوگا جو اس عمر کی موت پر محزون نہ ہو۔

ہاں اے دل تڑپ تڑپ اپنے محبوب کے لیے تڑپ اور ایسا تڑپ کہ ہمیشہ کے لیے تیری تڑپ موقوف ہو جائے بس جاؤ اے آرزو دور ہو جاؤ۔ اے شوق مٹ جاؤ۔ اے تمنا و برباد ہو جاؤ۔ اے جان ہائے جان پیار اآنکھوں کا زندگی کا سہارا رخصت ہو گیا بس اب تجھ سے رخصت نکل نکل اے روح جسم سے نکل جا آزاد ہو جا۔

صبر ــ کہنا بہت آسان کرنا مشکل نہیں مشکل ہے نہیں ناممکن ہے بتا کی محبت دیکھا لی پھر ہمیشہ کی جدائی کہیں قابل صبر و شکیبائی ہو سکتی ہے نہیں ہرگز نہیں اگر کوئی شخص ایسے وقت میں صبر کر سکتا ہے تو وہ یا تو انسان نہیں فرشتہ یا اوس کے پہلو میں دل نہیں سنگ خارا ہے۔ مگر ہائے افسوس کہ پر اختیار نہیں۔ ہائے۔

ہائے ہجر را گذرا ندیم و زندہ ایم ما را بسخت جانی خود ایں گماں نبود

ہائے معلوم نہیں کہ اکیسویں تاریخ ذی الحجہ کی کیسی مصیبت ناک تاریخ تھی کہ ایک اکیس ۲۱ نوجوان عزیز ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا آہ آہ

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی

آہ زمانہ ایک حال پر نہیں رہتا۔ یا تو وہ عالم تھا کہ مرحوم سید صلابت علی سعید اور بدنام کنندہ نام محبت یعنے مجھ بدبخت ہجراں دیدہ بلا چشیدہ مہدی علی شہید میں وہ اخلاص تھا کہ ایک منٹ کی جدائی شاق تھی اور جسم و جان کا حال تھا یا اب جدائی بھی ایسی ہوئی کہ جسکی ختم کی مدت ہی معلوم نہیں اب زیادہ نہ زبان قلم میں طاقت ہے نہ مجھ میں تحریر کا یارا سواے اس کے کہ

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

دل بہلانے کے لیے اپنے عزیز کے مرنے پر کئی ایک مادہ ہائے تاریخ کہے تھے

جن میں سے سنہ عیسوی کے صرف دو تاریخی مصرعے تحریر کیے جاتے ہیں

رفتہ ز دار فنا میر صلابت علی
۱۹ ۱۱ ۶

اور

موسے وادر بقا صلابت علی
۱۹ ۱۱ ۶

چونکہ مرحوم کو اس قابل قدر رسالہ تمدن سے نہایت انس تھا اور وہ اسے ہمیشہ نہایت شوق و ذوق سے ملاحظہ کرتے تھے بلکہ مجھے آجتک کبھی یہ نصیب نہوا کہ پرچہ اون سے پیشتر دیکھنے پاتا اور شاید وہ کچھ دنوں زندہ رہتے تو اشاعت تمدن میں بہت کچھ کوشش کرتے اور میرا ہاتھ بٹاتے مگر افسوس کہ قضا سے مہلت نہ ملی اس لیے اوس مرحوم کی خوشنودی روح کے لیے جو جو کام کئے جا رہے ہیں اونمیں سے یہ بھی ہے کہ تمدن کا بھی کچھ خیال کیا جائے اس لیے اس مہجور کا ارادہ ہے کہ اون نادار شائقین کے نام جنہیں اس بے نظیر رسالے کے دیکھنے کا شوق تو ہے مگر خریداری کی استطاعت نہیں رکھتے مرحوم کے نام سے پانچ پرچے درجہ دوم کے بالفعل جاری کر دیئے جائیں۔ آیندہ انشاءاللہ تعالے بشرط حیات مستعار اس میں اور زیادتی وقتاً فوقتاً کیجائے گی۔ دس[1] پندرہ روز میں رقم بذریعہ منی آڈر روانہ کر دی جائے گی۔ امید کہ تمدنی بھائی مرحوم کو دعائے مغفرت سے فراموش نہ فرمائیں گے +

خیر خواہ تمدن
عزیز مردہ - فراق دیدہ
میر مہدی علی شہید

تمدن۔ اپنے قدر دان کی موت پر دلی رنج کا اظہار کرتا ہے خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر دے

[1] روپیہ وصول ہوگیا۔

غزلین

بے غم نہ چاہیے مجھے یہ درد گار دل اسلام کے ہو نشتر غم سے فگار دل

منظور ہے مصیبتِ صد گو نہ لے خدا احسانِ بندگان سے نہو شرمسار دل

سیماب وار ہائے نہ یوں ہر دم تڑپ ا دم بھر قرار لینے دے او بیقرار دل

گو جانِ ناتوان پہ گریں لاکھ کوہ غم ہر حال میں ہے شکریہ کردگار دل

حبِ وطن کی مجھ کو اجازت ہو مرحمت کہتا ہے مجھ سے یوں مرا الفت شعار دل

جذبات و حسیات پہ قادر ہے آدمی باطل یہ عذر ہے کہ ہے بے اختیار دل

ہمدم! یہی ہے زندگی جاودان یہی جاں قوم پر فدا ہو۔ وطن پر نثار دل

سید نے کی حیات و دوام و بقا سے نام دیکر وطن کو دولت و زر جان زار دل

دنیا میں پھنس کے دیکھ نہ عقبےٰ کو بیہدہ اس پنج روزہ زیست کا کیا اعتبار دل!

کرتی ہے وحشت زر دل و دین عقل در رخرا مینائے حبِ قوم کا ہو جرعہ خوار دل!

ذرخ - خوشی سے کرتی فدا ملک و قوم پر
پہلو میں اس کے ہوتے اگر صد ہزار دل

ز - خ - ش -

نکلیں حسرت و ارماں تو یارب میرا دم نکلے نہ کھاؤں ٹھوکریں در در جو جانِ پرالم نکلے

ادا بجنگی مرتے تھے - وفا پہ جان دیتے تھے نہ وہ اہلِ وفا نکلے نہ وہ اہل کرم نکلے

ستم ڈھاتا ہے او ظالم تو جھنجھلا کے یہ کہنا کوئی اہل کرم ڈھونڈھو جو ہم اہلِ ستم نکلے

وہ ہیں لاچار عادت سے جو ان کی خو ہوا شک دل نہ وہ جور و جفا چھوڑیں نہ میرے دل کا غم نکلے

جو اک ساغر بھی وہ شیشہ تو تشنہ بانہ سے آئے تو پھر دل سے میرے ساقی تمنا جام جم نکلے

لگے تھے کوئے جاناں میں جو بہر جاڈ شوق کے انہیں جب غور سے دیکھا تو زنگار حرم نکلے

حزیں بیمار ہے تیرا - چھپا مت اب رُخ زیبا
نشانہ تیر مژگاں کا لگا جلدی کہ دم نکلے

اختر علی - عزیز -

از حضرت [illegible]

قید ہستی سے چھٹے سارے اسیران قفس ہم بھی دو چار گھڑی اور ہیں مہمان قفس
مجھ کو کس پیار سے کہتے ہیں نگہبان قفس دل اُڑے جاتے ہیں نالے نہ کرو جان قفس
ہاتھ کھینچے ہوئے جاتے ہیں اسیران قفس کہ نہ داماں قفس ہے نہ گریبان قفس
ہم گئے گلشن ہستی سے عدم کی جانب آج آرام سے بیٹھے ہیں نگہبان قفس
[illegible] چشم رہا [illegible] دم مرگ نہ بھولو نگا یہ احسان قفس
تیلیاں توڑ کے بیکار کیے جاتے ہیں کہ تمہیں بعد ہمارے کوئی خواہان قفس -
ہمصفیران چمن نے نہ کیا استقبال - در تک آکر مجھے پہونچا گئے یاران قفس
ہمصفیران چمن کا تھا مجھے قید میں دھیان اب ہوں گلشن میں تو یاد آتے ہیں یاران قفس
بعد مدت جو کوئی چھوٹ کے آجاتا ہے پوچھتا ہوں کہو اچھے تو ہیں یاران قفس
عار تھی آپ کو بیکار جناب صیاد بند ہونے سے مرے گھٹ گئی کیا شان قفس
دھیان آیا کہیں اس حال سے کل دیکھ لیں بن گئے آہ مرے پردہ الوان قفس
کب رہا ہو کے اسیری کا مزا دل سے گیا آشیاں بھی جو بنایا تو بعنوان قفس

دونوں عالم جنہیں کہتے ہیں وہ یہ عالم ہیں
صبح مرغان چمن شام غریبان قفس

وصل حبیب

ناول نہیں دلچسپ اداؤں کی ہے تصویر
رنگ اس میں کسی شوخ طبیعت کا بھرا ہے

یہ اخلاقی اور سچا ناول سید حبیب الحسن صاحب وکیل درجہ اول عدالتہائے ریاست بھوپال کی تازہ تصنیف ہے اس میں حسن و عشق کی سچی تصویریں نہایت خوبی سے دکھائی گئی ہیں۔ اور راز و نیاز کے ہو بہو فوٹو کمال صفائی سے لیے گئی ہیں۔ ناظرین۔ اگر پاکبازانہ عشق کی غیر متوقع کامیابی دیکھنا مقصود ہو تو اس کی زیارت کرو شریفانہ ضبط و تحمل کی تاثیر اور قوت دیکھنے کی تمنا ہو تو اسکو دیکھو۔ پردہ و تعلیم نسواں کی حمایت مرکوز خاطر ہو تو اسکو مطالعہ کرو۔ عقد بیوگان کے متعلق دلچسپی ہو۔ اور زن بیوہ کمن اگرچہ عورات کی اصلی تعبیر دریافت کرنا چاہو۔ تو اسکو مشاہدہ کرو۔ طوائفوں کی فطرتی سرشت کردار بد کا بد انجام۔ دیکھنا ہو۔ تو اسکو پڑھو دوستی کے فرائض اگر معلوم کرنا ہوں تو اسپر نگاہ ڈالو ضلع آٹھ کے سی سالہ بند وبست منعقدہ ۱۹۰۵ء کے تاریخی واقعات کی جستجو ہو۔ تو اسکی سیر کرو۔ زبان کی نفاست۔ بیان کی سلاست۔ ترکیب کی درستی عبارت کی چستی۔ فقرات کی برجستگی۔ مکالمہ کی شوخی علم کی حفاظت۔ تہذیب کی روک تھام۔ تمناؤں کا ہجوم حسرتوں کا اژدحام۔ قابل دید ہے مصنف نے کمال کیا ہے۔ کہ درد دل کو لفظوں میں بھر دیا ہے اسکی خوبی کا اندازہ کہنے سننے کے متعلق نہیں۔ دیکھنے اور سمجھنے کے لائق۔ لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ درجہ کا حجم ۳۲۰ صفحہ باایں ہمہ بخیال اشاعت قیمت ہر دو حصہ صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول ڈاک۔ رعایتی قیمت عہ علاوہ محصول ڈاک

المشتہر۔ مہتمم کتب خانہ حبیبیہ۔ ڈاکخانہ گوہر گنج ریاست بھوپال

ڈاکٹر برمن کی بنائی ہوئی مشہور دوائیں

[illegible] استعمال میں آ رہی ہیں۔

(۱) [illegible] ایک ہفتہ کے استعمال ہی سے دب جاتا ہے۔

(۲) [illegible] دوا کا استعمال کیا جائے گا تو اکھڑ کے جاتا رہتا ہے۔

(۳) [illegible] قیمت [illegible]

[illegible] ایک [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] قیمت [illegible]

[illegible] وغیرہ کو مٹا کر

[illegible]

[illegible] قیمت [illegible]

[illegible] قیمت [illegible] منگا کر دیکھئے

ڈاکٹر [illegible]

[illegible]

نوٹ: [illegible] دہلی [illegible]

فرمائش کے ساتھ اخبار کا حوالہ ضرور دیجئے

جلد (۲) جون سنہ ۱۹۱۲ء نمبر (۳)

تمدن

معاشرتی - تمدنی - ادبی - فلسفی - اخلاقی - تاریخی - اور علمی مضامین کا مخزن

ایڈیٹر - محمد عبد الراشد الخیری - شیخ محمد اکرام

فہرست مضامین

باہتمام محمد عبد الراشد الخیری دہلوی

تمدن پریس ۱۲۳ دہلی میں چھپکر شائع ہوا

قیمت سالانہ قسم اول ۸ قسم دوم ۶ - قیمت فی پرچہ ۱۲

کتبہ احقر ابو ظفر حامد

خاک کی چٹکی

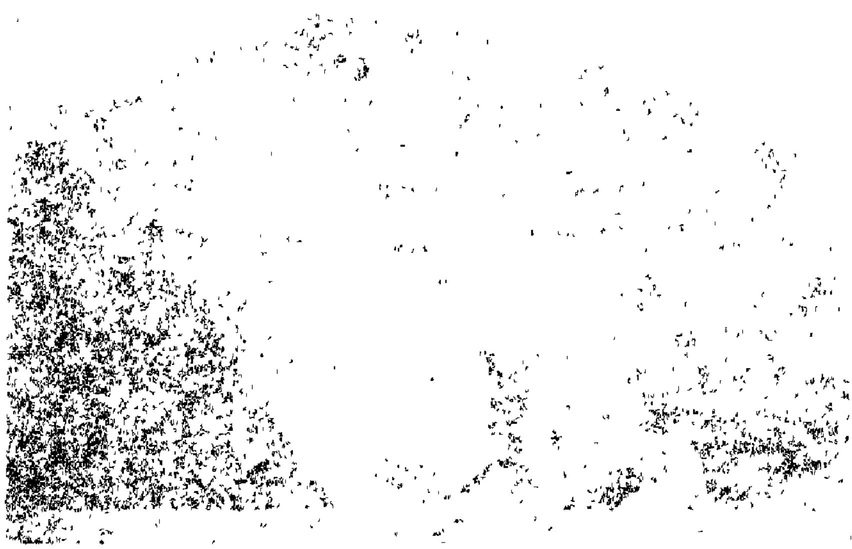
(فقیری ٹٹکا کیوں زیادہ مؤثر اور معتبر مانا گیا ہے۔ اس لیے کہ وہ ریاکاری سے پاک اور اصلی اثرات کا مظہر ہے)
دنیا کو روزمرہ اس کا تجربہ ہے کہ فقیری خاک کی چٹکی بھی اکسیر اعظم ہے چنانچہ ہمیں بھی ایک مرد باخدا نے نہایت الطاف کیساتھ **آفتابی سرمہ** کا نسخہ عنایت فرمایا اور اس سے عام فائدہ رسانی کی اجازت دی۔

تعریفی الفاظ اس کے لیے ممکن ہیں نہ ہم طولانی تقریر سے کام لینا چاہتے ہیں صرف اس قدر کہتے ہیں کہ یہ سرمہ تمام امراض چشم کا کامل اور نہایت مجرب علاج ہے اس کے استعمال سے ایک ایسی نظر قایمہ پیدا ہو جاتی ہے جو کبھی خوفناک مرض میں مبتلا نہیں ہوتی۔ کم سے کم چالیس دن کا تجربہ اچھی طرح اس کی خوبیوں کا یقین دلا دیتا ہے۔ اور ایک سال کا استعمال گویا زندگی بھر صحت چشم کا ضامن ہے۔ یہ سرمہ محض خاک کی چٹکی نہیں ہے بلکہ اجزاء جواہرات اور نباتات سے بنایا جاتا ہے اور سیارگان کی گردش کے موافق آفتاب کے اثرات اسمیں شامل ہیں اس لیے اسکا سنگ بھی سفید ہے۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے قیمت بہت کم ہے فی شیشی چھ ماشہ والی (عہ) فی شیشی یکتولہ والی برائے ایک معہ نقرہ سلائی (ے) چھ روپے۔

نوٹ پوڑیہ بغرض آزمایش چالیس یوم۔ صرف ایک روپیہ (عہ)

المشتہر

منشی جواد حسین [illegible] مالک کارخانہ آفتابی سرمہ کمبوہ دروازہ میرٹھ



تمدن

اُمّہات الاُمّہ

از شمس العلما مولوی حافظ محمد نذیر احمد صاحب ایل - ایل ڈی - مرحوم و مغفور

ہم تو ع ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد - کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ایک وقت کا ایک تقاضا ہوتا ہے خاص یعنی ہر ایک وقت کے لوگ سب نہیں تو اکثر ایک خاص خیال کے پیچھے پڑے ہوتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو کا چرچا تھا - عیسےٰ کے طب کا ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد میں زبان عربی کی فصاحت بلاغت کا ہم نے اپنے ابتدائے شباب میں بہت سے چرچے دیکھے - ناچ رنگ کے - گانے بجانے کے - شعر شاعری کے پتنگ بازی بٹیر بازی شطرنج بازی - بنیتری بازیوں کے اکھاڑوں میلے تماشوں کے - یا اب انگریزی عملداری - انگریزی تعلیم کی بدولت دیکھ رہے ہیں - آزادی کے - ریفارم (اصلاح) کے - اخبار اور رسالوں کے - انجمنوں کے کانگرسوں - اور کانفرنسوں کی کمیٹیوں اور سوسائیٹیوں کے اشتہاروں اور

تعلیم گاہوں کے۔ مذہبی مناظرات کے اور بالآخر سودیشی کے بائی کاٹ[1] کے سوراج کے یہ جتنے چرچے ہیں سب انڈے بچے ہیں آزادی کی ان سب چرچوں میں سے ہم کو صرف اُس آزادی پر کچھ لکھنا ہے۔ جو مذہبی مناظرات میں برتی جاتی ہو۔ انسان کی بناوٹ پر نظر کرتے ہیں تو وہ ایک تو جسم رکھتا ہے قریب قریب اسیطرح کا جسم اور جانوروں کے پاس بھی ہے جسم کے علاوہ ایک خاص طرح کی روح ہے وہ مغز ہے اور جسم پوست وہ مخدوم ہے اور جسم خادم۔ وہ کارفرما ہے اور جسم کارکن وہ سوار ہے اور جسم سواری۔ وہ مثلاً بڑھئی کی جگہ ہے اور جسم کلہاڑی بسولے۔ آرے کی جگہ پہلے آدمی کے دل سے ارادہ پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ ارادہ اعضا و جوارح کے ذریعے سے عمل میں لایا جاتا ہے یعنے

[1] سودیشی اور سوراج ہندی لفظ ہیں زبان سنسکرت سے ماخوذ۔ سودیشی کے معنے یہ ہیں کہ اپنے دیس یعنی ملک کا بنا ہوا ساز و سامانِ زندگی استعمال کیا جائے سوراج کے معنے ہیں اپنی حکومت کہ ہم آپس کے رگڑے جھگڑے انگریزی عدالتوں میں نہ لیجائیں بلکہ خود فیصلہ کرلیا کریں یعنے ہندوستان میں ہماراج ہو اور ہماری حکومت۔ بائی کاٹ انگریزی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنے ہیں کہ غیر ملکوں کے بنائے ہوئے ساز و سامان زندگی کے استعمال کو روکا جائے چندروز سے یہ شورش انگریزی کی مخالفت میں بنگالے سے شروع ہوئی کہ انگریزوں نے صوبہ بنگالہ کو تقسیم کرکے مشرقی بنگالے کا علاقہ جدا گانہ قرار دیا۔ بنگال کے بیرسٹروں اور وکیلوں نے تقسیم بنگالہ میں اپنا مالی نقصان دیکھ کر ہندوستان سے لیکر ولایت تک اس کی مخالفت کی مگر کہیں شنوائی نہیں ہوتی اس ناکامی کے انتقام کے طور پر ہنود بنگالہ نے سودیشی اور بائی کاٹ اور سوراج کی شورش برپا کی اور اس شورش میں ہندوستان کے اور صوبے بھی کم و بیش شامل ہوتے گئے اور ابھی تک بھی یہ شورش برسرترقی ہے۔ انگریز بزور حکومت اور حکومت سے بڑھکر بزور تدبیر بھی اس شورش کے دبانے میں ساعی ہیں شورش اگر بالکل فرو نہ ہوگی تو بغاوت کا رنگ اختیار کرنے سے ضرور بچا رہیگا۔

ارادہ عمل کی صورۃ میں ظہور پزیر ہوتا ہے اب آزادی کے اعتبار سے دیکھتے ہیں
کہ ارادہ اور عمل کہاں تک آزاد ہو سکتے ہیں تو عمل کو تو کسی طرح آزاد کہہ ہی نہیں
سکتے وہ شروع ہی سے محکوم ارادہ ہے اور چونکہ اعضا و جوارح کے ذریعے
وقوع پزیر ہوتا ہے اور اعضا و جوارح بجائے خود جسم میں بہت سے اسباب خارجی
اس کے وقوع کو روک دے سکتے ہیں آدمی پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنا چاہے
تو اڑ نہیں سکتا چوری کرنا چاہے تو لوگ اسکو چوری نہیں کرنے دیں گے پس
عمل کو صرف ایک محدود حلقے میں آزاد کہہ سکتے ہیں رہا ارادہ وہ البتہ بنظر ظاہر
آزاد معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اختیار رکھتا ہے جو چاہے خیال کرے جو چاہے
سوچے مگر نہیں عمل کا پیرایہ اختیار کرنے کے علاوہ وہ محکوم ہے صحبت کا تعلیم و
تربیت کا - آب و ہوا کا - تقاضائے عمر کا - مذہب کا رسم و رواج کا بڑوں کی
تقلید کا غرض مطلق آزادی ارادے اور خیال کو بھی نصیب نہیں لوگ ان قیود
اور شرائط کا لحاظ تو کرتے نہیں ستو باندھ مطلق آزادی کے پیچھے پڑی
ہیں اور اسی سے دنیا میں بدامنی پھیلتی ہے حاکم وقت ارادے اور خیال تک تو
دست رس نہیں رکھتا ہاں نقص امن کا اندیشہ ہو تو خیال کو عملی صورۃ اختیار کرنے
سے روک سکتا ہے اور تھانے اور کچہریاں اور عدالتیں اسی مرض کی دوا ہیں کئی
برس ہوئے گوڑگانوہ کے ایک پادری صاحب مذہبی مناظرے کے پیرایے
میں حد اعتدال سے بڑھی ہوئی آزادی عمل میں لائے کہ اپنے ایک رسالے
میں پیغمبر صاحب آخر الزمان صلعم کی نسبتہ اُن کی بیبیوں کے بارے میں بڑی
زبان درازی کی جس سے جمہور مسلمین کی بڑی دل آزاری ہوئی - مسلمان جگہ
جگہ استغاثہ فوجداری کی طیاریاں کرنے لگے اور جگوں کا حال تو معلوم نہیں
دلی سے کچھ لوگ فریاد لیکر شملے گئے بارے پادری صاحب کی کتاب کی اشاعت

حکماً بند کر دی گئی۔ اسی اثنا میں سر سید احمد خاں مرحوم مغفور بھی پادری صاحب کی کتاب کا جواب لکھ رہے تھے مگر وہ پورا نہیں ہونے پایا تھا کہ سید صاحب انتقال فرما گئے۔ ہم نے تو نہ پادری صاحب کی کتاب دیکھی اور نہ سید صاحب کا ادھورا جواب مگر اتنی بات پہلے سے معلوم ہے کہ پادری صاحب نے سخت زبانی کے سوا اس اعتراض میں کوئی نئی بات اپنی طبیعت سے تو ایجاد کی نہ ہوگی۔ اعتراض تو نہیں مگر جواب تو خود قرآن میں موجود ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ[1] وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً جواب کا ہونا دلالت کرتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت بھی پیغمبر صاحب کی زندگی میں بعض لوگ زن و شوہر کے تعلقات کو خلاف شان پیغمبری سمجھتے اور انہی تعلقات کی وجہ سے جناب رسالتمآب کی رسالت کے منکر تھے۔ غرض پرانا اعتراض ہے اور علمائے اسلام نے اس کے دندان شکن جواب بھی لکھے ہیں مگر مسلمان ہو کر اپنے پیغمبر کے تقدس کی اپنے مقدور بھر اور اپنے طور پر حمایت کیے بدون ہم سے نہیں رہا جاتا اور یہ بات بھی ہے کہ اعتراض کسی مسلمان کے کان میں پڑے اور اسکو جواب نہ آتا ہو اور جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تقدس کی نسبت خیال فاسد و وہم بیہودہ اس کے دل میں بیٹھ جائے تو ایمان کے جاتے رہنے کا خوف ہے نعوذ باللہ من شرور انفسنا

پیغمبر صاحب کے کثیر الازواج ہونے سے ہمکو انکار نہیں۔ اس کو سب مانتے ہیں کہ پیغمبر صاحب کے انتقال کے وقت بی بی عائشہؓ۔ سودہؓ۔ حفصہؓ۔ ام سلمہؓ۔ زینبؓ بنت جحش۔ ام حبیبہؓ۔ جویریہؓ۔ صفیہؓ۔ میمونہؓ۔ نو بیبیاں ان کے نکاح میں تھیں تو الدتناسل کی قوت کو لوگوں نے کچھ آج سے نہیں

[1] اور (اے پیغمبر) تم سے پہلے بھی ہم نے (بہتیرے) پیغمبر بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں بھی دیں اور اولاد بھی دی)۔ ۱۲

قوت ہم انسانوں نے بری طرح استعمال کر کے اس قدر شرمناک چیز بنا دیا ہے
[illegible] اس سے کترا [illegible] جا [illegible] حالانکہ
[illegible] جیسے شفقت [illegible] بڑا [illegible]
اسی قوت سے پیدا ہوئے اور جو آیندہ پیدا ہونگے وہ بھی اسی قوۃ سے پیدا
ہونگے پردہ تو اس قوت کا کیا جاتا ہے اور کوئی فرد بشر اس سے خالی ہی
نہیں۔ انسانی بچے ننگے ہوتے ہیں سب اسی غرض سے کیے جاتے ہیں
اور پردے کی پوچھو تو وحشی سے وحشی قومیں بھی آگا پیچھا چھپائے رکھتی ہیں
کپڑا میسر نہیں تو پتے ہی سہی یہ پردہ تو اس وقت سے ہی کہ مذہبی روایت کی
رو سے جب حق نے آدم و حوا کو بہشت سے نکالا قرآن کی اس وقت کی حالت
کا بیان قرآن میں ہے بدت لہما سوا تہما وطفقا یخصفن علیہما من ورق
الجنۃ[1] پس یہ توالد تناسل کی قوۃ فی حد ذاتہا ہرگز بری نہیں اور جو اس کو برا
سمجھے وہ حکمت بالغہ الٰہی پر اعتراض کرتا ہے خدا تو ہر چیز پر قادر ہے[2]۔ ان
مثل عند اللہ کمثل ادم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون خدا
چاہتا تو مرد اور عورت کو ایسی قابلیت دیتا کہ مرد کھانسا اور منہ سے بیٹے اگل دیتے
عورت چھینکی اور ناک سے بیٹیاں بکھر پڑیں مگر اس نے جو توالد تناسل کا قاعدہ
جاری کیا ہے تو اسکی مصلحۃ کو وہی خوب جانتا ہے[3]۔ الا یعلم من خلق وھو
اللطیف الخبیر پس منا کحۃ حقیقۃ میں خدائے تعالیٰ کے ارادے کا نافذ کرنا اور

---

[1] جوں ہی آدم و حوا نے درخت ممنوع کے پھل کو چکھا تو دونوں کی پردہ کرنے کی چیزیں انکو دکھائی دینے لگیں اور لگے جنت کے پتوں کو اپنے اوپر چپکانے [2] اللہ کے ہاں عیسیٰ آدم و جیسے ہیں کہ خدا نے مٹی سے آدم (آدم کے پتلے) کو بنا کر اسکو حکم کیا کہ آدمی بن اور وہ آدم) بن گیا [3] بھلا ہوسکتا ہے کہ خدا) جو پیدا کرے وہی مخلوقات کے حال سے ناواقف ہو حالانکہ وہ بڑا باریک بین اور باخبر ہے

اس کی مرضی کی تکمیل ہو اور اسی سے پیغمبر صاحب نے فرمایا لَا رُھْبَانِیَّۃَ فِی الْاِسْلَامِ[1]
اور اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ[2] اور جو لوگ اس سے
اعراض کرتے یا اسکو فعل قبیح سمجھتے وہ ابطال حکمۃ الٰہی کے درپے ہیں اور
چاہتے ہیں تو الدتناسل موقوف ہو کر دنیا آخر کو اجڑ جائے۔ بانگی دیکھکر
اناج کے ڈھیر کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ اچھا ہے یا برا نہ ہب بھی احکام کا
انبار ہے اور رہبانیۃ بانگی۔ اسلام اور عیسائیۃ میں محاکمہ کرنے کا اچھا ذریعہ ہے
اچھا پھر ایسی ضروری اور عالمگیر قوۃ کس وجہ سے شرمناک قرار پائی اور اس میں
کیا برائی دیکھی کہ لوگ چار و ناچار اس سے کام بھی لیتے ہیں اور بلی کے . . .
کی طرح چھپاتے بھی ہیں آؤ ذرا اس قوۃ کی تشریح کریں جس سے فہم مدعا
میں سہولۃ ہو پہلی بات یہ ہے کہ خلاق عالم نے یہ قوۃ نر و مادہ مرد و زن دونوں
میں ودیعۃ رکھی ہے مردوں میں بشکل قوۃ فاعلہ اور عورتوں میں بصورۃ منفعلہ یعنے
مرد و زن دونوں اس قوۃ سے متمتع ہونے کے حق دار ہیں پس آزادی استعمال
قوۃ میں پاس حق فریق ثانی کی ایک ضروری قید بڑھی اور اَلْاِنْسَانُ حَرِیْصٌ
عَلٰی مَا مُنِعَ[3] کی رو سے فتنہ فساد کی جڑ قایم ہوئی مشارکۃ ایسی بد چیز ہے
کہ خدا تک کو گوارا نہیں جتنے رگڑے جھگڑے لوگوں میں ہوتے ہیں تحلیل
کر کے دیکھو تو مشارکۃ پر جا کر منتہی ہوں گے۔ زید خالد کے گھر میں چوری کرتا
ہے اس کے یہی معنے ہیں کہ زید زبردستی خالد کے مال میں شریک بننا
چاہتا ہے خالد اسکو جائز نہیں رکھتا۔ زید نے خالد سے میعادی قرض

---

[1] اسلام میں رہبانیت یعنے ترک دنیا نہیں ہے۔

[2] پیغمبر صاحب نے فرمایا نکاح میرا طریقہ ہے اور جو میرے طریقے سے مونہہ موڑے وہ مجھ سے نہیں

[3] آدمی جس چیز سے روکا جاتا ہے اس کے کرنے پر زیادہ حریص ہوتا ہے ۱۲

لیا اور وقت پر ادا نہ کیا خالد نے عدالت میں جا دعویٰ دائر کیا اس صورت میں تو یہ خالد کے مال سے اس کے تمتع میں ناجائز طور پر شرکت کرنی چاہتا تھا جو وجہ مخاصمت قرار پائی اسی طرح مرد اور عورت کے معاملے میں خدا نے اس تمتع میں جو توالد تناسل کی قوت سے حاصل ہوتا ہے مرد اور عورت دونوں کو شریک یکدیگر ٹھیرا دیا ہے مرد عورت کو اس کے تمتع سے محروم کرنا چاہے یا عورت مرد کو متمتع نہ ہونے دے تو اس کا ضروری نتیجہ ہی بگاڑ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ دنیا میں کروڑوں مرد ہیں اور کروڑوں ہی عورتیں ہیں تو پہلی ضروری شرط اس قوت میں ساجھا کرنے کی رضائے فریقین یعنے ایجاب و قبول یعنے نکاح۔ متعارف ہے۔ اب ہماری زمین ہے کہ اسمیں کروڑوں بیگہ جوتنے بونے کے قابل ہے اور کروڑوں ہی کاشتکار ہیں تو لوگوں نے زمین کو آپسمیں بانٹ رکھا ہے زمینداروں نے گانوں گانوں کی حد بندی کر رکھی ہے اور ان کے ذیل میں کاشتکاروں نے کھیت کھیت کی۔ اس باہمی تقسیم کی بدولت ملک آباد ہے نہ دنگا ہے نہ فساد ہے یہی مثال خدا نے قرآن میں عورتوں کی بھی دی ہے۔ نساؤکم حرث لکم فاتوا حرثکم انی شئتم[1] دنیا بھر کی عورتیں مردوں میں تقسیم ہیں کھیتوں کی جتائی بوائی ہو رہی ہے پندرھویں بیسویں برس مردم شماری کیجاتی ہے پیدا اور آبادی سوائی ڈیوڑھی بڑھتی جاتی ہے تمام جہان کے لوگ اس قاعدے کے تو پابند ہیں کہ جو عورت جس مرد کے نکاح میں ہے کوئی دوسرا اس میں ساجھا نہیں کرسکتا یعنے عورت ایک وقت میں ایک مرد سے زیادہ کی جورو ہو نہیں سکتی مگر مسلمانوں میں ایک مرد

[1] تمہاری بیبیاں (گویا) تمہاری کھیتیاں ہیں تو اپنی کھیتی میں جسطرح چاہو آؤ ۱۲۔

وقت واحد میں چار نکاح کر سکتا ہے لیکن عورت نہیں کر سکتی ہے مردوں کے ساتھہ
بے جا رعایت ہے اور معترض کہہ سکتا ہے کہ جب مرد اور عورت دونوں توالد تناسل
کی قوت سے متمتع ہوتے ہیں یعنی مرد عورت دونوں حصہ دار ہیں تو کیوں مرد کو
وقت واحد میں چار بیبیوں سے نکاح کرنے کا اختیار دیا جائے اور عورت کو
بر عضو ضعیف ایک ہی کا ہو کر رہنا ہے جن لوگوں کی نظر نارسا ہے
اس اعتراض کو سنکر بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ تمتع ہونے
کے اعتبار سے مرد اور عورت دونوں توالد تناسل کی قوت میں فی الواقع
ایک دوسرے کے شریک تو ہیں مگر برابر کے شریک نہیں مرد کا حصہ غالبا
ہی اور زیادہ کا حصہ دار ہے اسی سبب اس کے ساتھہ بجا رعایت
کی گئی ہے اور وہ اسکا حق ہے اور معاوضہ ہے اس کے حصہ زائد کا
جس طرح کاشتکاروں کو تقاوی دیکر کاشتکاری کی ترغیب دی جاتی
ہے تاکہ کوئی قابل زراعت زمین افتادہ نہ رہے اور جس قدر پیداوار
کا زمین سے حاصل کرنا ممکن ہے حاصل کی جائے اسیطرح اس حکیم علی الاطلاق
نے تمتع کو موجب ترغیب نکاح قرار دیا کاشتکاری سے مقصود اصلی
پیداوار اراضی کا حاصل کرنا ہے نکاح سے اولاد کا۔ لوگوں نے کوتاہ
نظری سے تمتع ہی کو نکاح کی غرض و غایت سمجھ لیا ہے تو یہ خود انکی غلطفہمی
ہے جس طرح غذا سے مقصود تقویۂ جسم ہے اور ذائقہ بیش برین نیست کہ
ترغیب ہی تمتع میں جو ہم نے مرد کو شریک غالب کہا اسکی وجہ یہہ ہے کہ
عورت کے پیچھے حمل اور ارضاع وغیرہ کے عوارض بھی لگے ہیں اور وہ ان
وقتوں میں فطرۃً تمتع سے محروم رہتی ہے اور اسکو خود تمتع کی خواہش نہیں
ہوتی +

خلاصۂ نظم اقبال

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں
سرمۂ چشم دشت میں گردِ رمِ آہو ہوا

رہزنِ ہمت ہوا ذوقِ تن آسانی ترا
بحر تھا صحرا میں تو گلشن میں آیا جو ہوا

اپنی اصلیت پہ قایم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروانِ بو ہوا

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہوا

پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا

فرد قایم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

پردۂ دل میں محبت کو ابھی مستور رکھ
یعنی اپنی مے کو رسوا صورتِ مینا نہ کر

خیمہ زن ہو وادیٔ سینا میں مانندِ کلیم
شعلۂ تحقیق کو غارت گرِ کاشانہ کر

شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجامِ ستم
صرفِ تعمیرِ سحر خاکسترِ پروانہ کر

تو اگر خود دار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر

خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر
تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر

ہاں اسی شاخِ کہن پر پھر بنا لے آشیاں
اہلِ گلشن کا شہیدِ نغمۂ مستانہ کر

اس چمن میں پیروِ بلبل ہو یا تلمیذِ گل
یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو
لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تو

اقبال

کیا مذہب بنی نوع انسان کے لیئے مفید ثابت ہوا؟

ایک مغربی کا خیال

ہم اپنے معزز گریجوایٹ دوست کے اس مضمون پر سرسری کوئی رائے دینی نہیں چاہتے اور اسکو نہایت خوشی سے اس لیے درج کرتے ہیں کہ تمدن کے معزز نامہ نگاروں میں سے کوئی صاحب اس مسئلہ پر قلم اٹھائیں تاکہ مذہب کے متعلق جو خیالات آجکل کے نوجوانوں میں راسخ ہوتے جاتے ہیں ان کی روک تھام ہو۔

اس سلسلہ میں بہترین مضمون پر تمدن ایک اشرفی نذر کرے گا +

مذہب کے متعلق عام طور پر دو خیال ہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب صرف ایک فضول چیز ہے بلکہ اس سے انسان کو سخت نقصان پہنچا۔ برخلاف اس کے بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اس سے دنیا کو بے انتہا فائدہ پہنچا۔ اور اگر مذہب نہوتا تو نہ دنیا میں امن قایم رہتا اور نہ نیکی و بھلائی کا نام باقی رہتا ان لوگوں کے خیال کے موافق انسان کو برے کام سے روکنے کے لیے سوائے مذہب کے اور کوئی طاقت نہیں ہے۔ اس بات کو وہ لوگ بھی مانتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مذہب دماغ کا سدراہ ہوا۔ ساتھ ہی اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں یا یہ کہ ہر چیز میں کوئی نہ کوئی وصف ضرور ہے اور خدا نے جو چیز بھی پیدا کی ہے انسان کے فائدے کے لیئے کی ہے

چنانچہ زہر جہاں قاتل ثابت ہوتا ہے وہیں تریاق کا بھی کام دیتا ہے۔ بہت سی چیزیں پہلے از قسم خس و خاشاک معلوم ہوتی تھیں لیکن تجربے سے انسان کے مفید مطلب ثابت ہوئیں حتیٰ کہ پلیگ و وبا بھی اس خیال سے مفید ہیں کہ بہت سے آدمیوں کے مرنے سے آبادی اس قدر نہیں بڑھنے پاتی کہ دنیا میں انسان کے رہنے کو جگہ ہی باقی نہ رہے بہت سے لوگ جہالت میں بھی ایک بات نکالتے ہیں اور یہ جاہل رہنے کی بڑی شدومد سے طرفداری کرتے ہیں تو اگر اس قسم کی دلیل کو مدنظر رکھا جائے تو مذہب کے متعلق بھی بغیر بحث کیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی انسان کے فائدے ہی کی ایک چیز ہوگی کیونکہ ہر شے میں انسان کا فائدہ متصور ہے۔ جس طرح صوفی سے ہمہ اوست کے مسئلہ پر بحث کرنی عبث ہے اسی طرح اس خیال والوں کے سامنے مذہب کے خلاف دلائل پیش کرنے فضول ہیں۔ جہاں ثبوت دار و مدار قیاس پر ہو وہاں بحث کرنی لاحاصل ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ مذہب نے اپنی مختلف صورتوں میں انسان سے کیا کیا کارنمایاں کرائے۔ اول ہم کو وحشی قوموں کے مذاہب کا تماشہ دیکھنا چاہیے۔ ایشیا اور افریقہ میں مذہب کے بدولت ہزاروں لوگوں کا خون ہوتا ہے۔ اے۔ جی۔ لیونرڈ صاحب اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ مغربی افریقہ میں دریائے نائیجر کے دہانے کے قریب جب کسی قبیلے کا کوئی سردار مر جاتا ہے تو وہاں کے مذہب کا یہ حکم ہے کہ اس سردار کے ساتھ چار اور آدمیوں کو مار کر دفن کیا جاتا ہے تاکہ قیامت کے دن یہ لوگ اس کو قبر سے اٹھائیں۔ جب وہاں کے بادشاہ ایا سو نے وفات پائی تو اس کے ساتھ تیس لونڈیاں جلا دی گئیں اور کئی سو مردوں کو قتل کیا گیا تاکہ دوسری دنیا میں

جاسکتے تو تمام قوم کے ساتھ عزت و احترام سے جاسکتے ورنہ وہاں روحیں اسکو
حقارت کی نگاہ سے دیکھتیں اور یہ کہتیں کہ یہ کوئی بڑا ہی غریب شخص ہوگا کہ جو اس کے
ساتھ ایسا تھا ہی نہیں

مسٹر میکڈانلڈ صاحب اپنی کتاب ریلیجن اینڈ متھ میں لکھتے ہیں کہ افریقہ میں
جب کسی بزرگوں کے قدیم مکان کی مرمت کیجاتی ہے تو بعض موقعوں پر دو ہزار آدمیوں
تک کی قربانی کی جاتی ہے۔ ایک یہ بھی مذہبی رسم ہے کہ اگر کوئی شخص مرجائے تو یہ
خیال کیا جاتا ہے کہ اسپر کسی نے جادو کردیا چنانچہ جن لوگوں پر شبہ ہوتا ہے
ان کو ایک قسم کا پڑھا ہوا زہر دیا جاتا ہے اور اعتقاد یہ ہے کہ اگر انہوں نے
جادو نہیں کیا ہوگا تو ان پر زہر کا اثر ہوگا۔ اس میں ہمیشہ ایک شخص کے ساتھ
اور کئی آدمیوں کی جانیں جاتی ہیں چنانچہ ڈیوک ٹاؤن کے سردار کے مرنے کے
موقعہ پر پچاس غلاموں اور ملازموں کو پڑھا ہوا زہر دیا گیا جس میں سے چالیس
مرگئے (بقول لیونارڈ صاحب) اس جگہ اس بات کی تصریح کی چنداں ضرورت نہیں
کہ انسانی قربانی قدیم زمانے سے چلی آتی ہے اور اسکا دارو مدار محض مذہبی
احکام پر ہے۔ قدیم مصر میں ہیلونٹی کے بیٹے کی قربانی ہوتی تھی اس سے پہلے
زمانے میں انسان کی قربانی مصر میں عام تھی۔ ہندوستان میں بھی مختلف صورتوں
میں پائی جاتی تھی۔ چنانچہ ستی کی رسم اب تک موجود ہے۔

یونانیوں۔ یہودیوں۔ عیسائیوں مسلمانوں غرضیکہ جملہ قدیم اور جدید
مذاہب میں انسان کی قربانی ایک نہ ایک شکل میں موجود رہی۔ صرف اتنا فرق ہوگیا
کہ جدید مذاہب نے قربانی کی صورت بدل دی۔ مسلمانوں کے ہاں اگرچہ حضرت
اسحق کے باپ نے اپنے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی اور اپنی طرف سے کی لیکن
مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ خدا نے حضرت اسحق کو بچا لیا اور ان کی بجائے

ایک بھیڑ کی قربانی منظور فرمائی۔ اس کے علاوہ بعض قومیں ایسے مہلک جانوروں کی پرستش کرتے ہیں جو بنی نوع انسان کے دشمن ہیں۔ مثلاً افریقہ اور ہندوستان میں سانپ کی پوجا کی جاتی ہے۔ ہندوؤں کے مذہب میں کسی جانور کا مارنا ہی گناہ ہے خواہ وہ شیر ہی کیوں نہو۔ اب غور کرنے کا مقام ہے کہ کیا انسان کی جان لینا خاصکر بے گناہ کی جان لینا بنی نوع انسان کے لیے فائدے کی چیز ہے۔

مندرجہ بالا امثال سے یہ ظاہر ہے کہ بہت سے مذاہب نے بے گناہ انسانوں کو جان لینے کی تلقین کی۔ تو گویا مذہب انسان کو بجائے پناہ دینے کے اسکی جان کا لینے والا ثابت ہوا +

یہ تو خیر نیچے طبقے کے مذاہب کا ذکر ہے۔ اب ترقی یافتہ مذاہب پر غور کیجئے۔ مذہب عیسوی کو لیجئے۔ اس مذہب کے پیرو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس سے دنیا کو بے حد فائدہ ہوا۔ لیکن تاریخی واقعات اس دعوے کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔ انگلستان کا مشہور مورخ لیکی لکھتا ہے کہ سینٹ گرے گری کے زمانے میں عراق و شام۔ فسق و فجور کا ملجا و ماوا تھا۔ یورپ میں مذہب کا زور ۳۲۲ء سے لیکر ۱۲۰۰ء تک بہت رہا۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جو تاریخ میں یورپ کی گمراہی کا زمانہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس زمانے کی توہم پرستی اور مذہبی مظالم کا اگر ذکر کیا جائے تو آسانی سے یقین نہ آئے گا۔ مذہبی خانقاہوں میں جو بدکاریاں ہوتی تھیں اور مذہبی پیشوا جن حرام کاریوں کی مذہبی احکام کی رو سے اجازت دیتے تھے اُن کا خیال کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ مذہبی مظالم کی کوئی حد نہ تھی اگر کوئی شخص لینٹ (عیسائیوں کا رمضان) کے مہینے میں گوشت کھائے تو اس کے لیے سزائے موت کا حکم ہوتا تھا۔ ہزاروں

مرد و عورت اس شبہ میں زندہ جلا دیئے گئے کہ وہ جادو کرتے تھے۔ ایک پندرہ برس کے لڑکے نے ایک صلیب کو توڑ دیا۔ تو بغیر تحقیقات کے اسکو قتل کر ڈالا گیا۔ فرانس میں دو پادری یکے بعد دیگرے وزیر اعظم ہوئے اور انہوں نے اس قسم کی حکومت کی کہ ان کے بعد آخر ایک ایسی زبردست طوائف الملوکی اور شورش ہوئی کہ جس میں کروڑوں بے گناہوں کا برسوں خون ہوتا رہا اور سارے یورپ میں ایک تہلکا مچ گیا۔ صلیبی جنگ میں ہزاروں جانیں تلف ہوئیں سینکڑوں عورتیں بیوہ ہوگئیں اور ہزاروں بچے یتیم ہوگئے مگر مذہبی خونیوں کی پیاس نہ بجھی پر نہ بجھی۔ عیسائی مسلمانوں کو قتل کرنا باعث نجات خیال کرتے تھے اور مسلمان عیسائیوں کی جان لینے میں جنت کے خواب دیکھتے تھے۔ غرضیکہ جوں جوں دنیا میں مذہب کا خیال ترقی کرتا گیا بجائے بنی نوع انسان میں آپس میں محبت اتحاد بڑھنے کے مخاصمت و کشت و خون کا بازار گرم ہوتا گیا۔ اگر کسی طرح یہ ممکن ہو کہ مذہب کے رواج سے ماقبل و مابعد کے اقتال کا حساب ہو سکے تو امید ہے کہ مذہب کے زمانے کے خون کا سمندر غیر مذہبی زمانے کے مقابلے میں ناپید کنار ثابت ہوگا اور پھر داعیان مذہب بڑی شد و مد سے دن رات یہی راگنی الاپتے رہتے ہیں کہ مذہب نے دنیا میں امن قایم کیا مذہب غصے و غضب کی آگ پر پانی ڈالنے والا ہے مذہب جذبات انسانی کا محافظ ہے۔ اور اگر مذہب نہو تو آدمی آدمی کو کچا چبا جائے اور ایک دوسرے کو زندہ نہ رہنے دے اور کسی قسم کا دنیوی کاروبار صلاحیت و سہولت سے طے ہونا ناممکن ہوجائے اب یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ مذہب کے رائج ہونے سے پہلے دنیا کا کیا ایسا ہی حال تھا۔ جیسا کہ حامیان مذہب بیان کرتے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت تک دنیا کے ترقی کا چکر اچھی طرح گردش میں نہ آیا تھا لیکن جانتک

معلوم ہوا ہے مذہب کے بے بہرہ انسان اُن انسانی صفات سے جنھیں محبت رحم۔ وعدل سے تعبیر کرتے ہیں بالکل معرّا نہ تھا نہ ہر وقت اُس کے سر پر خون سوار رہتا تھا۔ انسانی جذبات کا دور دورہ غیر مذہبی زمانے سے کسی طرح زیادہ نہ تھا۔ ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ بطل وکذب کا رواج ہوتا۔ مکر و فریب دغا غضب قتل وغیرہ وغیرہ دنیا بھر کے عیوب کی لشکر کشی ہوتی۔ نہ کہیں شہر ہوتے نہ کہیں آبادی ہوتی۔ نہ کسی قسم کا تمدن ہوتا۔ نہ کوئی تہذیب ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

گزشتہ زمانے کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت کی تاریخ معلوم نہیں۔ لیکن اب بھی بعض بعض حصے دنیا کے ایسے موجود ہیں جہاں کے باشندے ابھی تک مذہب سے نابلد ہیں چنانچہ مسٹر ہوایٹ اپنے سفرنامہ آسٹریلیا میں لکھتے ہیں کہ یہاں کے اصلی باشندے کسی قسم کے خدا یا دیوتا کو نہیں مانتے نہ کسی قسم کی پرستش کرتے ہیں۔ ایک اور سیاح لکھتا ہے کہ اس ملک میں کشت وخون کی افراط نہیں ہے۔ ڈاکٹر گرے گری اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ یہاں کے لوگ بہت فیاض طبیعت کے ہیں مسٹر ہال صاحب اسکیمو قوم کا حال تحریر فرماتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ وہاں کے باشندے چوری اور قتل کے نام تک سے واقف نہیں۔ رنک صاحب اسی قوم کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کی زبان میں گالی دینے یا کوسنے کے کوئی الفاظ نہیں +

اسی طرح قدیم زمانے میں سوئیزرلینڈ کے جھیل میں رہنے والے باشندے اگرچہ مذہب سے بالکل بے بہرہ تھے تاہم مل جل کر گاؤں میں رہتے تھے کاتنے اور بننے کے فن سے واقف تھے اور گلہ بانی کرتے تھے۔

انسان کو چھوڑ دیجے۔ حیوان کو لیجئے۔ یہ ظاہر ہے کہ حیوان مذہب سے متمتع نہیں ہو سکتے۔ تاہم بہت سی قسم کے جانور ایسے ہیں جو آپس میں مل جل کر رہتے ہیں اپنی قوم والے کی مدد کرتے ہیں چنانچہ ایک تیندوے کا قصہ مشہور ہے کہ اس نے لنگوروں کی بستی پر حملہ کیا اور ایک لنگور کو پکڑ لیا۔ اسکی چیخ پکار سے اور بہت سے لنگور جمع ہو گئے اور سب نے مل کر تیندوے پر یورش کر دی آخر تیندوے کو لنگور چھوڑتے ہی بن پڑی اور اپنی جان بچا کر بھاگا۔ ایک کوّے کو مار کر لٹکا دو پھر دیکھو کتنے کوّے کائیں کائیں کر کے منڈلانے لگتے ہیں اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاں ایک کوا پکڑا گیا اور اس نے ایک آواز لگائی کہ ہزاروں کوّے جمع ہو جاتے ہیں اس حیوانی حس کے ایکے کا نام کچھ ہی رکھو اور اسکی وجہ کچھ ہی قرار دی جائے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس اتفاق اور آپس میں مل جل کر رہنے کی وجہ مذہب ہے۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ بغیر مذہب کے بھی انسان آپس میں مل جل کر اتفاق سے رہ سکتے ہیں اور تمام وہ خوبیاں جو حیوان مطلق میں پائی جاتی ہیں ان میں بغیر کسی مذہب کی پیروی کئے بھی قایم رہ سکتی ہیں لہذا حامیان مذہب کا یہ دعوے صحیح نہیں ہے کہ بغیر مذہب کے انسان انسان ہی نہیں رہ سکتا۔

اب یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ کیا مذہب کسی اور صورت میں انسان کے لیے مفید ہوا۔

اکثر یہ مغالطہ ہو جایا کرتا ہے کہ ہم سبب اور مسبب میں غلطی کر جاتے ہیں ایک شخص سگار پیتا ہوا بائسکل پر جا رہا ہے۔ دوسرا شخص جس نے آجتک بائسکل نہیں دیکھی ہے مگر انجن دیکھ چکا ہے یہ قیاس کرتا ہے کہ بائسکل اس

دھوئیں کی وجہ سے چل رہی ہے جو اصل میں سگار سے نکل رہا ہے یا بعض وقت یہ بھی ممکن ہے کہ ایک انجان آدمی موٹر کار کی خاک اڑاتے ہوئے تیز رفتاری کو اس خاک کے اٹھنے پر محمول کرے۔ اسی قسم کی رائے لوگ مذہب کے متعلق بنا لیتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ جس طرح ایک مشین کے چلنے کا عمل اس کے چلنے کی وجہ سے ہے نہ کہ مشین اس عمل کی وجہ سے چل رہی ہے۔ اسی طرح مذہب نتیجہ ہو دنیا کے دن بدن ترقی کرنے کا۔ برخلاف اس غلط العام خیال کے کہ دنیا کی ترقی نتیجہ ہے مذہب کا۔ مثلاً خیال کرنا چاہیے کہ مذہب کی بنا کس طرح ہوئی۔ نامعلوم کے معلوم کرنے کی خواہش کا نام مذہب ہوا۔ جانور درخت دریا پہاڑ آسمان بادل بجلی آگ چاند سورج وغیرہ وغیرہ دیوتا ملنے لگے ہیں۔ مگر کس زمانے میں۔ اس زمانے میں جب کہ انسان ان کی ماہیت سے واقف نہ تھا جوں جوں ان کی اصلیت معلوم ہوتی گئی ان کا تقدس کم ہوتا گیا۔ غرضیکہ اس نامعلوم کے معلوم کرنے کی تلاش تو انسان کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی لیکن انسان اس تلاش میں غلط راستے پر چلا یعنے انسان نے شروع میں مشکل سے مشکل مسائل کو حل کرنا چاہا جس کے لیے اس کا دماغ تیار نہ تھا لہذا اس تلاش کی بدولت انسان نے بہت سی غلطیاں کیں بہت جگہ ٹھوکر کھائی۔ ایک آدمی کیچڑ میں پھسل پھسل کر گرتا جاتا ہے۔ پاؤں رکھتا کہیں ہے اور پھسل کر پہنچتا کہیں ہے۔ اس کا یہ گرنا اسکی کشمکش کے لیے کسی طرح مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے نقش قدم سے یہ معلوم ہوگا کہ یہ آدمی آگے ہی بڑھتا چلا گیا یعنے اس نے ترقی کی حالانکہ وہ اپنے پاؤں پر سیدھا کھڑا ہی نہ ہو سکا۔ یہی حال مذہب کی کیچڑ میں پھسلنے والوں کا ہے ہر نیا مذہب پرانے مذہب کی خرابیاں

بتاتا ہے اور اکثر ٹھیک بتاتا ہے۔ تو گویا انسان کا وقت گزشتہ غلطیوں کے ٹھیک کرنے ہی میں صرف ہوتا رہا۔ جو شخص پہلی غلطیوں کے درست کرنے میں لگا رہے وہ ترقی کیا کرسکیگا۔ اور جب مذہب ہم کو ایسی الٹ پھیر میں پھنسانے والا ثابت ہوا تو کس طرح انسان کے لیے مفید ہوسکتا ہے +

لیکن ہاں مذہب کا ایک فائدہ ہے۔ ہماری بہت سی خوشی کا دارومدار خیال پر ہے۔ خیال ایک لاانتہا چیز ہے یہی وجہ ہے کہ جھوٹی امیدسے بھی انسان کو بہت خوشی ہوتی ہے۔ اسی قسم کی جھوٹی امیدوں پر عقائد و اعتقادو مذہب کی بنا رہے اور اس سے قدرتاً بعض صورتوں میں انسان کو راحت نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ مذہبی خیال کا آدمی بعض تکالیف میں بھی راحت پاتا ہے۔ اگرچہ یہ راحت خیالی ہی ہوتی ہے۔ لیکن یہ خیال راحت سچائی کا معیار نہیں ہے۔ شراب پینے کی خیالی تعریف قدیم آریہ لوگوں کے زمانے سے عمر خیام تک برابر گائی جاتی رہی۔ لیکن اس سے شراب کا مفید ہونا عائد نہیں ہوتا۔

یہ خیال ہی غلط ہے کہ مذہب کا اثر ہمارے اخلاق پر اچھا ہوا۔ ازمنہ وسطیٰ میں مذہب کا زور تھا۔ مگر اخلاق میں بجائے ترقی کے تنزل ہی پیدا ہوا دوزخ کی دھمکی اور جنت کی رشوت اخلاق پیدا کرنے میں بیکار ثابت ہوئی۔ یہ ایک معمولی تجربے کی بات ہے۔ کہ جس زمانے میں چوری کی سزا موت تھی اُس زمانے میں بھی چوری نہ بند ہوئی۔ تو جب ایسی سزا برائی کو نہ روک سکی تو محض دوزخ کی دھمکی کیا کارگر ہوگی۔ مذہب نے سب سے بڑا نقصان یہ پہنچایا کہ برائی کو بحیثیت برائی کے نہ سمجھنے دیا۔ جس طرح ایک بچے کو بلی شادی یا بیچارے ڈرانا اُسکے مُنہ

مُضر ہے اسی طرح مذہب کی دھمکی نے انسان کو آیندہ ترقی کے راستے پر پڑنے سے روک دیا۔جس چیز کا نام کیرکٹر ہے وہ نہ بننے دیا۔کوئی نیکی نیکی کے لیے نہیں کیجاتی تھی بلکہ خدا کے خوش کرنے کے لیے۔بھروسہ اپنے اوپر کرنا نہ سکھایا جاتا تھا۔بلکہ ایک نامعلوم چیز پر غرضیکہ انسان کی اپنی ذاتی قوتوں کو بڑھانے اور اُن سے فائدہ اُٹھانے کی کبھی مذہب نے تعلیم نہ دی بلکہ ہمیشہ اس کے خلاف عمل رہا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ انسان کی دماغی ترقی میں مذہب کا ساتھ رہا ہے تاہم انسان کی اخلاقی اور سوشل ترقی کا سبب مذہب کبھی نہیں ہوا۔

زمزم[1]

یاسمین۔پروفیسر مسٹر محمد سعید صاحب۔ایم۔اے مصنف خواب ہستی کا یہ لاجواب و نتیجہ خیز ناول اور تمدن ایجنسی کی پہلی کتاب جس کا عرصہ سے ملک کو انتظار تھا تیار ہوگئی ہے یہ کتاب جو درحقیقت حسن و محبت کی زندہ تصویر ہے۔قابل مصنف نے خصوصیت سے نوجوان طلبا کے واسطے لکھی ہے اور مختلف مضامین پر اس قابلیت سے بحث کی ہے کہ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔

یاسمین جو اس تمام قصہ کی جان اور بنگالہ کی ایک مشہور نازنین ہے۔اسکی زندگی کا ہر ورق فلسفۂ حیات کے پیچیدہ مسئلہ کو نہایت خوبی سے حل کر رہا ہے۔قابل مصنف کا اسم گرامی کتاب کے لاجواب ہونے کی کافی ضمانت ہے قیمت عمر

منیجر عصمت و تمدن دہلی سے طلب کیجئے

---

[1] حضرت زمزم اس مضمون کا جواب جولائی کے پرچہ مین ملاحظہ فرمائین۔

ہاتف کی صدا

سونے والے اُٹھ کھڑا ہو وقتِ راحت کب تلک　خود فراموشی کہاں تک خوابِ غفلت کب تلک
دل نزار بیگانۂ دردِ مصیبت کب تلک　روئیگی بالیں پہ تجھکو تیری قسمت تلک
فاقہ مستی پی رہے گی مے پرستی کب تلک
بے خبر! نا آشنائے رازِ ہستی کب تلک

خوابِ عشرت میں ترے دل کی تمنا اور ہے　اور ہی پیمانہ ساقی اور مینا اور ہے
ہوش میں آ کھول آنکھیں دیکھ دنیا اور ہے　بزمِ شب کچھ اور ہنگامہ سحر کا اور ہے
مجھکو ڈر ہے ہو نہ مدہوشی سے رسوائی تیری
صبح کے ہوتے ہی خلقت ہو تماشائی تیری

ہو کے بیدار انقلابِ چرخِ کج رفتار دیکھ　چال چلتا ہے زمانہ کیسی! یہ رفتار دیکھ
سمتِ مغرب سے طلوعِ شمس کے آثار دیکھ　دیکھ مشرق کا ترا اُجڑا ہوا گلزار دیکھ
ہمصفیرانِ چمن کی غور سے گفتار سن
نالۂ قمری، فغانِ عندلیبِ زار سن

کاروانِ نگہتِ گلشن رواں ہونے کو ہے　دشمن اب صیاد و گلچیں باغباں ہونے کو ہے
غنچۂ خاموش کی پیدا زباں ہونے کو ہے　ہمنوائے بلبلِ بے خانماں ہونے کو ہے
بے زبانوں کو تو فریاد و فغاں کا جوش ہے
تو گرفتارِ مصیبت ہو کے بھی خاموش ہے

رنگ بدلا ہے چمن نے گل کھلانے کے لیے　چھا گئیں کالی گھٹائیں خوں رُلانے کے لیے
آسماں گردش میں ہے تیرے مٹانے کیلئے　برق پہونچی آشیاں تیرا جلانے کے لیے

جل اٹھا جب گھر ترا تو پھر خس و خاشاک ہے
جب ہوا گلزار صحرا - زندگانی خاک ہے

فائدہ ہستی کا تیری کیا جو ویراں ہو گیا — تنگ ہوگا اور بھی جب دم پریشاں ہو گیا
کیوں ہے غافل اسقدر کیا تجکو نادان ہو گیا؟ — تیری آسایش کا ساماں آفت جاں ہو گیا

خواب میں عمر گرانمایہ کا کھونا چھوڑ دے
جہاں میں اکسیر بنتا ہے تو سونا چھوڑ دے

انقلاب دہر سے ہے شورش محشر بپا — شمع کے شعلے نے پروانے کو خاکستر کیا
تیر جلاد فلک نے ہاتھ میں خنجر لیا — دمبدم ارشدؔ یہی آتی ہے ہاتف کی صدا

ہے تیری ہستی کا دنیا سے سفر ہشیار ہو
سر پہ آپہونچی قیامت بے خبر ہشیار ہو!!

آغا غلام حسین - ارشدؔ

عصمت جس طرح یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ قوم کی ترقی کا انحصار تعلیم النسواں پر ہے اسیطرح اس میں بھی کلام نہیں کہ رسالہ عصمت لڑکیوں کے واسطے ایک بیش بہا نعمت ہے جس میں خانہ داری تعلیم و تربیت - مذہب وغیرہ پر منتخب اہل قلم کے مضامین نکل رہے ہیں

عصمت کنواری لڑکیوں کو فرمانبردار بیویاں - اور بیویوں کو سلیقہ شعار گھر والیاں اور سگھڑ مائیں بنانے کے واسطے ایک لاجواب چیز ہے جو بیش قیمت اعلی درجہ کی لکھائی چھپائی رنگین ٹائٹل سنہری بیل اور تصویر سے مزین ہو کر ہر مہینہ شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ ۳ روپے -

منیجر عصمت و تمدن دہلی -

ملکی کفایت

تمہید

دنیا میں کوئی امیر ہوتا ہے کوئی غریب۔ امیروں کے پاس جو مال و دولت ہوتی ہے وہ بالعموم یا تو اپنی ذاتی محنت، سلیقہ شعاری اور عقلمندی کا نتیجہ ہوتی ہے اور یا اُن کو ورثے میں ملتی ہے اور اس حالت میں وہ در حقیقت اُن کے باپ دادا کی کمائی ہوتی ہے جسکو وہ اپنا خون پسینا ایک کر کے جمع کرتے ہیں اور دور اندیشی کو مد نظر رکھکر اپنی اولاد کی بہبودی کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ماں کے پیٹ سے دولتمند نہیں پیدا ہوتا مگر عموماً غریب آدمی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اللہ کی دین ہے جسکو چاہتا ہے دیتا ہے کچھ محنت اور عقل کی رسائی پر منحصر نہیں اور یہ سوچکر کہ خدا نے ہماری قسمت ہی میں غریبی لکھدی ہے وہ اپنی حالت بہتر کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور اپنی ساری زندگی یونہی تنگدستی میں رہ کر گذار دیتے ہیں بلکہ اس ناگوار ہستی پر قناعت کرنیکو ایک نیکی اور ذریعہ نجات تصور کرتے ہیں۔ برخلاف اسکے امیر آدمی کے پاس جو دولت موجود ہوتی ہے وہ اُس پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دن بدن اور دولت جمع کرنے کی آرزو اُس کے دل میں بڑھتی جاتی ہے اور ہمیشہ ننانوے کے پھیر میں رہتا ہے۔ یہی حال دنیا کی مختلف قوموں کا ہے مثلاً براعظم ایشیا میں جو لوگ آباد ہیں انمیں سے

اکثر بحیثیت مجموعی اپنی موجودہ حالت پر قانع اور یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہماری زندگانی کا سب سے بڑا مقصد اپنے موجودہ سرمایے پر قناعت کے ساتھ بسر اوقات کرنا ہے۔ اس کے برعکس فرنگی قومیں جو اسوقت دنیا کے بڑے حصے پر قابض و حکمراں ہیں برابر ترقی کر رہی ہیں اور حالانکہ بلحاظ امارت و طاقت اور قومیں اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتیں مگر اُن کو اپنی موجودہ دولت و شروت پر اکتفا نہیں بلکہ ہر لحظہ اضافہ کرنے میں کوشاں ہیں۔ چنانچہ اس کوشش میں کہ ہم اور زیادہ اقبالمند ہوں انہوں نے علوم و فنون کے ہر صیغے میں نہایت حیرت انگیز ایجادیں کیں اور اُن کے ذریعے سے قدرتی عناصر کو اپنے زیرنگین کیا۔ وہ علوم جو قدیم زمانے میں محض ابتدائی درجہ رکھتے تھے اُن کو کمال پر پہونچایا۔ مثلاً علم کیمیا جو درحقیقت عربوں کی ایجاد ہے اُس میں اہل فرنگ نے اب ایسی نمایاں ترقی کرلی ہے کہ انسان کو عربوں کی موجودہ تہذیب دیکھکر یقین کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ علم کیمیا کے موجد ایسے لوگ تھے جو اب تک پستی کے گڑھے میں بے خبر سو رہے ہیں اور اپنے ایجاد کردہ علم کا مقصد یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ رانگ اور پیتل سے چاندی سونا بن سکتا ہے۔ اہل فرنگ نے اسکا اصلی مفہوم سمجھکر کالے کلوٹے کوئلوں میں سے خوبصورت خوبصورت رنگ نکالے۔ کوڑے کرکٹ میں سے جوہر پیدا کیے۔ بدبودار چیزوں میں سے خوشبوئیں کھینچیں اور اس طرح اپنی چاندی بنائی۔ یہی حال علم ہندسہ کا ہے کہ اگرچہ اس نے ہمارے ملک ہندوستان میں جنم لیا اور

دنیا نے ہمارے ملک سے فائدہ اٹھایا مگر فرنگی زمین پر اس نے وہ نشو و نما پائی کہ آج میدان ترقی میں اہل فرنگ کے تیر رفت کا وسیلہ بنا ہوا ہے۔ قدیم علوم کو زمانہ حال کے سانچے میں ڈھالنے کے علاوہ یورپ والوں نے زمانے کی ضرورت کے مطابق اور ایسے نئے علم ایجاد کیے کہ جن کا متقدمین کے دلمیں سان و گمان بھی نہ گزرا تھا۔ اُن میں سے نہایت اہم اور پیچیدہ ملکی کفایت کا علم ہے جسکی بنا انگلستان میں ایک انگریز آدم سمتھ نے "دولت اقوام" کتاب لکھکر ۱۷۷۶ء میں ڈالی۔ اول اول لوگوں نے اس علم کی بڑی مخالفت کی کسی نے کہا کہ یہ ہرگز اس قابل نہیں کہ معقول آدمی اس کے مطالعہ میں اپنا قیمتی وقت صرف کریں تنہا میں مال و زر کے علاوہ اور بہت سے ایسے اعلی مضامین ہیں مثلاً علم اخلاق علم دین علم فلسفہ۔ جو ہم کو نیکی سکھاتے ہیں اور بُرائی سے بچنے کیطرف مائل کرتے ہیں اس لیے اسکی بجائے انکو پڑھنا چاہیئے۔ کسی نے یہ اعتراض کیا کہ اس علم کا فقط یہ مقصد ہے کہ امیروں کے پاس اور دولت آئے اور غریب بیچارے بھوکے مریں۔ غرض اسیطرح اور سینکڑوں قسم کے اعتراضات کیے گئے جن کی اصل بنا یہ تھی کہ اسکی رُو سے عالموں نے دنیا میں پہلی مرتبہ یہ ثابت کردیا کہ بیجا خیرات کرنی یعنی ہر ایک فقیر کو جس نے سوال کیا بغیر اُس کا استحقاق دریافت کیے خیرات دینے سے نہ تو اُس کا بھلا ہوتا ہے اور نہ وہ مقصد پورا ہوتا ہے جس کے لیے خیرات محض ایک ذریعہ ہے یعنی خلایق عامہ کی بہبودی۔ بلکہ اسکا اُلٹا اثر پڑتا ہے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھیک منگوں کی تعداد روز بروز

بڑھتی جاتی ہے اور فلاس اور فاقہ مستی عوام الناس میں زیادہ ہوتی جاتی ہے اس کی بڑی وجہہ یہ ہے کہ لوگوں نے بے جا خیرات کر کرکے آبادی کے ایک بڑے حصے کو کاہل وجود اور بے کار بنا دیا ہے جن میں دوسروں کی کمائی پر اپنا پیٹ پالنے کا مرض پیدا ہو گیا ہے اور چونکہ اب تک اس قسم کی نامعقول خیرات کا سلسلہ جاری ہے بلکہ روز افزوں ہے اس لیے ان لوگوں کو بھی بھیک مانگنے کا چسکا پڑ گیا ہے جنکو اگر یہہ خیرات دہندگان اس بے غیرت پیشے کی طرف اپنی بے جا دریا دلی سے ترغیب نہ دلاتے تو خود محنت کرکے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکتے ملکی کفایت کی تعلیم ان عیوب کا کافی انسداد کرنا بتاتی ہے اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غریبوں کو تعلیم دینا اُن کے فائدے کے لیے کتب خانے کھولنا اور رفاہ عام کی خاطر صنعت و حرفت کے مدرسے جاری کرنا سب سے بہتر خیرات ہے اور ایک فقیر کو پیسہ دو پیسے دینے کے بجائے اگر اُسکو روزی کمانے کا طریقہ سکھا دیا جائے تو نہ صرف اُس کے حق میں مفید ہوگا بلکہ ملک کی اخلاقی اور مالی حالت پر اچھا اثر پڑے گا۔

اگرچہ اس علم کی عمر بمقابلہ دیگر علوم بہت تھوڑی ہے لیکن اس چھوٹی سی عمر میں اس نے تعجب انگیز ترقی کر لی ہے اور اس کا جاننا ہر مہذب ملک کے باشندوں کے لیے ضروری ہو گیا ہے چونکہ اس مضمون کا تعلق اُن باتوں سے ہے جو ہماری روزمرہ کے تجربے میں آتی ہیں اور سب سے بڑا مقصد یہہ ہے کہ **دولت کی ماہیت**

اُسکی پیداوار - استعمال - اور تقسیم کے اصولوں کی تشریح
علمی پیرایے میں کرے اس لیے ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے میں
جبکہ تجارت کا بازار گرم ہے ہر تاجر اور کام پیشہ شخص کو اس سے
واقفیت پیدا کرنی لازمی ہے تاکہ اپنے کاروبار میں ایسی غلطیاں
نہ کرے جو نقصان کا باعث ہوں۔ علاوہ تجارت پیشہ اشخاص کے
اس علم کا جاننا اُن نوجوانوں پر بھی فرض ہے جو اپنی قومی بہتری کے
وسائل سوچنے میں اپنے قیمتی وقت کا بہت سا حصہ صرف کرتے ہیں
اور جنمیں سے اکثر کو آیندہ زندگی میں غالباً اسکا موقع ملے گا کہ قوم
کے تمدنی معاملات پر اپنی رائے سے خاطرخواہ اثر ڈال سکیں اس لئے
اگر اُنکی رائے سیاسی اصول سے بے بہرہ رہی تو بہت سی ایسی غلطیوں
کے مرتکب ہوں گے جن کا اثر اُنکی ذات تک محدود نہیں رہیگا
بلکہ ملک کی عام حالت میں خلل انداز ہوگا اور جن کے درست کرنے
کے واسطے آینوالی نسلوں کو محنت شاقہ اُٹھانی پڑے گی لہذا اس
علم سے واقف ہونے کی جتنی سخت ضرورت اہل ہند کو ہے اس کا
بیان کرنا احاطہ امکان سے باہر ہے۔ ہندوستان کی موجودہ روش
میں ہمارے استقبال کا راز نہاں ہے اور ہماری قومی تاریخ میں
زمانۂ حال ایک ایسا درجہ ہے جسکو دورِ انقلاب کہیں تو بیجا نہ ہوگا
اگر اسوقت سیاسی عمارت کی بنیاد ملکی کفایت کے سچّے اور سنگلاخ اصولوں
پر پڑ گئی تو نتیجہ پائدار ثابت ہونے کے علاوہ خوش آیند ہوگا۔ لیکن اگر لوگ
مدنی علوم سے تاریکی میں رہے تو اُن کی جہالت نہ صرف اُن کے حق
میں مضر ہوگی بلکہ خود اس علم کے مقابل میں ایک ایسا طاقتور

مخالفت کھڑا کر دیگی کہ جس کا زیر کرنا مشکل ہوجائیگا کیونکہ یہ بالکل سچا مقولہ ہے کہ اگر لوگ تمدن کے اصلی علوم سے ناواقف رہیں گے تو وہ ضرور اُنہی بیٔے ملکی کفایت شعاری کا ایک جھوٹا علم گھڑکر اسکی پیروی کریں گے اور اخیر میں اس جھوٹے علم کا عوام کے دلوں سے دور کرنا ایک اہم اور دشوار کام ثابت ہوگا۔ برعکس اس کے اگر اول سے خاص و عام میں اس کے سچے اصولوں کی تعلیم و تلقین کی جائے گی تو آیندہ کے لیے بہت سے مرحلے طے ہوجائیں گے بہت سی اور موجودہ غلطیاں رفع ہوجائیں گی مزید براں ہمکو یہ معلوم کرنے میں مدد ملے گی کہ قومی عروج کی منزل مقصود تک پہونچنے کا کونسا آسان اور بہترین راستہ ہے اور ہم کو کیا کیا طریقے اختیار کرنے چاہییں جن سے قوم میں خوشحالی بڑہے دولت زیادہ ہو اور ہمارے مفلس ہمقوم فاقہ کشی کی تکلیف سے نجات پائیں۔

پہلا باب

دولت

تمہید میں ہم کو یہ تو معلوم ہوگیا کہ ملکی کفایت کا علم دولت سے بحث کرتا ہے اب ہم کو یہ دریافت کرنا ہے کہ درحقیقت دولت کس کو کہتے ہیں؟ اس کا جواب غالباً بہت سے اشخاص یہ دیں گے کہ میاں دولت کے معنی تو ہم خوب جانتے ہیں مگر ساری دقت تو اس کے حاصل کرنے میں ہے مگر ان کا یہ خیال غلط ہے کیونکہ دولت ایسی چیز نہیں جس کی ہم جلدی سے تعریف

کرتے ہیں۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ روپے پیسے کو دولت کہتے ہیں۔ جس کے
پاس بہت سے روپے اور اشرفیاں ہوں وہی دولت مند ہے۔ چنانچہ ہمارے
ملک میں اس غلط خیال نے لوگوں کے دلوں میں ایسی جڑ پکڑی ہوئی ہے
کہ بہت بعض مالدار آدمی تجارتی کاروبار میں روپیہ لگانے کے بجائے روپوں
کی تھیلیاں اپنے گھروں میں بند کرکے رکھ چھوڑتے ہیں۔ اور پہلے زمانے
میں تو یہ قاعدہ عام تھا کہ غریب سے غریب کے پاس بھی اگر دس بیس روپے
جمع ہوئے تو اس نے کوئی چاندی کی چیز بنوا کر بیوی کے گلے میں ڈال دی
اسی طرح امیر لوگ سونے جواہر کے زیورات بنوا کر اپنی دولت کو جمع رکھتے تھے
مگر اس زمانے میں فرنگی ممالک کے امیر باشندوں کے پاس بہت کم نقدی
ہوتی ہے۔ اشرفیوں کی تھیلیوں کے بجائے وہ اپنے بنک میں ہزاروں
لاکھوں روپے کا حساب رکھتے ہیں۔ مگر اس سے ہمکو یہ پتہ نہیں چلتا کہ دولت
کیا چیز ہے۔ اگر زر و جواہرات کو دولت کہیں تو سعدی کی حکایت کا خیال کرکے
اس کی تردید ہو جاتی ہے کیونکہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سعدی اثنائے سفر میں
ایک جنگل بیابان میں جا نکلے۔ زادِ راہ ان کے پاس ختم ہو چکی تھی اور بھوک کے
مارے بُرا حال تھا۔ خوراک کی تلاش میں انکی نظر ایک تھیلی پر پڑی جس میں کچھ دانے
سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کو امید بندھی کہ شاید چنے ہوں اس لیے پاس
جا کر اٹھا لیا۔ مگر کھول کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ تھیلی میں موتی ہیں۔ اس پر سخت
نا اُمیدی ہوئی اور حقیقت کھلی کہ موتی اور پنا اگرچہ قیمتی چیزیں ہیں مگر ایسے وقت
پر کسی کام کی نہیں۔ اس حکایت سے صاف پایا جاتا ہے کہ اصل دولت
کی تعریف فقط سونا چاندی یا ہیرے جواہر نہیں۔ کوئی یہ کہے گا کہ جس کے
پاس بہت سی زمین ہو وہ نہایت امیر آدمی ہوگا مگر اس کا انحصار زمین کے

موقع اور محل پر ہے۔ مثلاً ایک زمیندار ہے جس کے پاس ایک بہت بڑا گاؤں موجود ہے۔ مگر وہ نہر سے بہت فاصلہ پر واقع ہے اور اس لیے پانی سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا اُس سے وہ زمیندار جس کے قبضے میں نہر کے قریب کی زمین ہے زیادہ مالدار ہوگا اگرچہ وسعت میں اُس بڑے گاؤں سے یہ قطعہ زمین کہیں چھوٹا ہو۔ علاوہ ازیں ہمارے ملک میں آریاؤں کے حملے سے پہلے نیم وحشی آباد تھے اور اگرچہ اُن کے قبضے میں ہندوستان کے نہایت زرخیز خطے تھے لیکن وہ خود از حد مفلس اور قلاش تھے اور اپنا گزارا بڑی مشکل سے کرتے تھے اس لیئے زمین کے بڑے بڑے قطعوں پر قابض ہونا ہم دولتمندی کی نشانی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ہم فقط اپنے ہی ملک کی قدیم حالت میں یہ نہیں دیکھتے بلکہ فی زماننا اور ملکوں میں جہاں وحشی آباد ہیں وہاں افلاس بدترین صورت میں نظر آتا ہے۔ آریاؤں نے ہند کے ان خطوں کو لے کر قدرت کے پوشیدہ خزانوں سے پورا فائدہ حاصل کیا اور اپنی اقبالمندی کے زمانے میں ایک تہذیب کی بنیاد ڈالی جو باوجود کئی ہزار برس گزرنے کے اب تک قایم ہے۔ اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ ایسا ملک جہاں کی زمین زرخیز ہو۔ دریاؤں میں بیشمار مچھلیاں ہوں۔ جنگلوں میں اونچے اونچے درختوں کی افراط ہو جن میں سے اچھی لکڑی نکل سکے۔ زمین کے اندر کوئلے۔ لوہے۔ تانبے۔ سونے اور چاندی کی کانیں ہوں اور اس کے ساتھ ہی آب و ہوا خوشگوار ہو اور پانی کی کمیابی نہ ہو تو وہ ملک بیشک مالدار کہا جائیگا۔ لیکن یہ ساری خوبیاں از خود دولت نہیں کہی جا سکتیں۔ کیونکہ ایسے ملک کے باشندے سالہا سال تک اس میں بود و باش رکھیں لیکن اگر وہ ان قدرتی خزانوں کو اپنے کام میں لانے کی قابلیت

نہیں رکھتے تو ساری عمر غریب اور محتاج رہیں گے۔ اسکی وجہہ یہ ہے کہ دولت پیدا کرنے کے لیے محنت۔ ہنر او علم کی ضرورت ہے۔ بلکہ اچھی زرخیز زمین کے مقابلہ میں حصول دولت کے لیے ان تین باتوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ لہذا وہ قومیں جو یہ چاہتی ہیں کہ ہم اہل فرنگ کی طرح دولتمند ہو جائیں اُن کو محنت اور ہنر کے ساتھ علم کا بھی پورا استعمال کرنا چاہیئے۔ یہاں علم سے مُراد فقط جاننے سے نہیں بلکہ کسی چیز کے اصول اور اسباب کی واقفیت سے ہے مثلاً ہم ایک گنوار کو عالم نہیں کہتے اگرچہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر ہوا پچھوا ہوگی تو اُسکا ایک خاص اثر ہوگا۔ اور اگر پروا ہو تو اس کے برعکس مگر اسکو یہ خبر نہیں ہوتی کہ پچھوا ہونے سے وہ خاص اثر کیوں پیدا ہوتا ہے اور وہ کون سے اسباب ہیں جو ہوا کا رُخ بدل کر اس کی تاثیر بھی بدل دیتے ہیں یہی وجہہ ہے کہ اس مفہوم میں ہم اسکو عالم نہیں کہتے مگر وہ شخص جو مظاہر قدرت کے تغیر و تبدل کی وجوہات سے واقف ہے اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ اُسکی اصولی واقفیت کو علم کہا جائے۔ لہذا دولت کی ماہیت دریافت کرنے اور اس کے پیدا کرنے کے لیے ہم کو صرف سطحی باتوں کا جاننا ضروری نہیں بلکہ اُس کے متعلق ہر ایک شے کی علت غائی کا علم ہونا لازمی ہے چنانچہ ملکی کفایت کے علم میں بھی اول ہمکو دولت کی علمی رو سے تعریف کرنی ہے جس طرح حکمائے فرنگ نے اسکی تعریف کی ہے اگر اس کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کریں تو یہ ہوگا۔ کہ اصطلاح دولت میں تمام وہ اشیا مشتمل ہیں جو منتقل ہو سکیں۔ جن کی فراہمی محدود ہو اور جو براہ راست یا بالواسطہ انسانی خوشی کا باعث ہوتی ہیں یا تکلیف کو رفع کرتی ہیں" لیکن یہاں ہم مختصر الفاظ میں یوں کہیں گے کہ وہ چیزیں جو منتقل ہو سکیں۔ جن کی فراہمی محدود ہو اور جو ہمارے کام کی ہوں اُن کو

اصطلاح میں دولت کہتے ہیں۔ اب اگر دولت کی یہ تعریف صحیح ہے تو ہر ایک شے جس میں یہ تین باتیں پائی جائیں دولت کا جُز ہونی چاہئیں۔ اور اگر ایسا نہیں تو وہ دولت نہیں ورنہ یہ تعریف ٹھیک نہیں۔ مگر ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ دولت صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جس میں یہ تینوں باتیں موجود ہوں۔ فی الحال اس تعریف کے اچھی طرح معنی سمجھنے کے لیے ہم ایک ایک صفت کو لے کر یہ دیکھتے ہیں کہ کہاں تک درست ہے۔

——— محمد رؤف علی بیرسٹرایٹ لا

ایک گولڈ فنچ پر جو قفس میں بھوک سے مر گیا

اک زمانہ تھا کہ میں تھا شاد میں		جوں صبا ہر لحظہ تھا آزاد میں
تخمہائے خشخش تھے میری غذا		جن سے رغبت تھی مجھے انتہا
تھے ملائم بیج وہ کچھ اس قدر		گویا تھے چھاتی سے میری چند پر
صبح کی شبنم کے قطرے پیتا تھا		تھے مری حق میں وہی آب بقا
وادی و صحرا میں اڑتا پھرتا تھا۔		ہر شجر کی شاخ پر جا سکتا تھا
خوشنما ہونے میں مجھکو ناز تھا		اپنے ہم جنسوں میں ممتاز تھا
پر ہرے چمکیلے اور خوشرنگ تھے		میرے بازو تھے سنہری رنگ کے
خوش گلوئی سے میں گاتا پھرتا تھا		ہر شجر پہ چہچہاتا پھرتا تھا
گیت گاتا تھا ہمیشہ میں نئے		دل لبھانے والی خوش آواز کے
لیکن افسوس آپہ آتا ہے مجھے		میرے پر جو تھے نرالے رنگ کے
خوبصورت خوشنما جو بازو تھے		ہائے وہ کیسے تھے کہ گویا کچھ نہ تھے
میرا رنگ اور روپ اور میرا شباب		آہ تھا چند روزہ مانند حباب
آئی آفت مجھ پہ ٹوٹا کوہ غم		اس فلک نے اک نیا ڈھایا ستم
آن پکڑا مجھکو اک صیاد نے		بند پنجرے میں کیا کیا د نے
کچھ نہ کی فکر آب و دانہ کی مری		یوں ہی غم کھا کھا کے گذری زندگی
گر پڑے نیچے مرے جھڑ جھڑ کے پر		توڑ ڈالی میری صدموں سے کمر
زندگی اک بار مجھکو ہو گئی		تھی تمنا مجھکو ہر دم موت کی
موت ہی نے آخرش ہے تو یہ بات		مجھکو اس اندوہ و غم سے دی نجات

کلفتیں سب غیر محسوس ہو گئیں | جتنی تکلیفیں تھیں ساری مٹ گئیں
غم کے طوفاں سے بچایا موت نے | قید ہستی سے چھڑایا موت نے
بانیٔ ظلم و ستم جور و جفا | شکر کرتا ہوں نہایت میں ادا
تو نہ کرتا مجھ پہ گر یہ سختیاں | مجھ سے کب چھٹتیں قفس کی تیلیاں
کب مجھے آتی اجل یوں بے محل | کب مجھ کو ان آفتوں سے ملتی کل

بس ہمیشہ تیرا رہتا صید میں
زندگی بھر تک قفس کی قید میں

سراج احمد صاحب
فہیم اکبرآبادی

غزل

چہ شد ار بہ ہند فتادہ ام خبرش صبا بمن آورد | من ازاں بشارتے کہ نسیم در قرن آوردا
کہ رساندش بہ مراد او بجز از مروت باغباں ؟ | چہ عجب کہ بلبلِ خستہ را تصدقِ چمن آورد
ز طپیدنِ رگ آرزو سخنِ امید شنیدہ ام | من و شوقِ وادیٔ غربتے کہ بروتم از وطن آورد
سخنے بغیرِ حدیثِ او نزود بہ محفلِ اہلِ دل | ز حلاوتِ سخنش شبے چو سخنورے سخن آورد
شد خلوتم ہمہ انجمن ز ہجومِ شوقِ تصورش | سر و برگِ صحبتِ کس کجا کہ مرا بہ انجمن آورد
بہوائے مصرِ جمال او شدہ حالتِ دلِ من چناں | کہ چو بوئے پیرہنے رسد پدرم ز پیرہن آورد

نگرے شکوہ تجلش بہ بساطِ بزمِ ستمکشاں
غمِ عشق وحشتِ خستہ را چو برائے سوختن آورد

رضا علی وحشت

تاریخ گزیدہ

تصنیف ملا حمد اللہ مستوفی قزوینی

آٹھویں صدی کے اوائل میں حمد اللہ مستوفی زبان فارسی کا ایک مشہور و معروف مصنف اور مورخ گذرا ہے۔ مرحوم ڈاکٹر چارلس ریو۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ Charles [illegible] نے برٹش میوزیم کے فارسی کتابوں کی فہرست میں اس کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ جن کا ماحصل یہ ہے کہ حمد اللہ شہر قزوین کا باشندہ تھا، اور اس کے آباؤ اجداد سلاطین ایران کے دربار میں صاحب عزوجاہ مانے جاتے تھے اور انہیں سلطنت کیطرف سے مختلف ولایات میں مستوفیت کا عہدہ تفویض تھا۔ اسی وجہ سے وہ اور اوس کے تمام اہل خاندان "مستوفی" کہلاتے تھے۔

حمد اللہ نے تاریخ و جغرافیہ میں تین مفید اور کارآمد کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں تاریخ گزیدہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس کے بعد ظفرنامہ لکھا اور اس میں شاہنامہ کی طرز پر ظہور اسلام سے لیکر اپنے زمانہ (۷۳۰ھ) تک شاہان عرب و ایران کے تمام و کمال واقعات درج کیے تیسری کتاب نزہۃ القلوب سنہ ۷۴۰ھ میں تصنیف اور اوس میں مسالک و ممالک (علم جغرافیہ) کے متعلق ہر قسم کے معلومات جمع کر دیے۔

ساتویں صدی کے خاتمہ پر اقوام مغول کی تاخت و تاراج سے وسط ایشیا میں جو بدامنی پھیلی ہوئی تھی اوس کی وجہ سے علم و فن کا چراغ گل ہونے کے

قریب ہوگیا تھا۔ مگر اس آپرشوب زمانہ میں فارسی زبان میں چند تاریخیں ایسی تصنیف ہوئی ہیں کہ اُن پر اہل عجم جس قدر فخر و ناز کریں بجا ہے ۶۵۸ھ میں وزیر عطار الملک ملا علاء الدین جوینی نے تاریخ جہاں کشائی تصنیف کی جس میں اقوام مغول کی اصل و نسل اور اون کے خروج کے مفصل حالات درج ہیں ۷۱۰ھ میں ملا رشید الدین بن فضل اللہ نے جو کہ غازان خاں کا وزیر تھا جامع التواریخ قلم بند کیا۔ اس کے اٹھارہ سال بعد ۷۲۸ھ میں ملا عبد اللہ بن فضل اللہ شیرازی نے تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار لکھی جو تاریخ وصاف کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب اصل میں تاریخ جہاں کشائی کا تکملہ ہے کیونکہ اس میں صرف مغولیہ فتوحات کے حالات مذکور ہیں۔ جامع التواریخ عام تاریخ ہے اور اُس میں ابتدا ر تخلیق عالم و آدم سے لیکر مصنف نے اپنے زمانہ تک تمام سلاطین عالم اور خلفار اسلام کے حالات فراہم کئے ہیں۔ ان تینوں کتابوں سے صرف تاریخ وصاف ۱۲۶۹ھ میں بمبئی میں چھپ گئی ہے۔ باقی دونوں کتابیں سلسلہ اوقاف مشرگب میں چھپ رہی ہیں +

تاریخ گزیدہ وصاف کے دو سال بعد یعنے ۷۳۰ھ میں تصنیف ہوئی ہے مصنف نے اس کتاب کو اگرچہ جامع التواریخ سے انتخاب کیا ہے لیکن دیگر کتابوں سے اخذ کر کے بعض متفرق معلومات ایسی بھی جمع کر دی ہیں کہ اُنکی وجہ سے تاریخ ایران اور واقعات سلاطین عہد اسلام کے متعلق بہت عمدہ اور کار آمد کتاب ہوگئی ہے +

تاریخ گزیدہ کے دیباچہ میں اُن کتابوں کی بھی فہرست درج ہے جنکی اسکی تصنیف میں امداد لی گئی ہے اور اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) سیر النبی لابن ہشام

۲۔ قصص الانبیاء للثعلبی۔
۳۔ رسالہ امام قشیری۔
۴۔ تذکرۃ الاولیا مصنفہ شیخ فریدالدین عطار۔
۵۔ روضۃ الریاحین للیافعی۔
۶۔ تجارب الامم۔ لابن مسکویہ۔
۷۔ مشارب التجارب کشف الظنون نمبر ۱۱۲۰۴۳
۸۔ دیوان النسب۔
۹۔ تاریخ طبری۔
۱۰۔ تاریخ حمزہ اصفہانی۔
۱۱۔ تاریخ ابن اثیر۔
۱۲۔ زبدۃ التواریخ مصنفہ ابوالقاسم جمال کاشانی۔
۱۳۔ نظام التواریخ مصنفہ امام بیضاوی۔
۱۴۔ عیون التواریخ لابوطالب علی الخازن البغدادی۔
۱۵۔ کتاب المعارف لابن قتیبہ۔
۱۶۔ تاریخ جہاں کشا مصنفہ علاء الدین جوینی۔
۱۷۔ تاریخ یمینی ترجمہ ابی الشرف جرباذقانی۔
۱۸۔ سیر الملوک نظام الملک طوسی (جس کا دوسرا نام سیاست نامہ ہے دیکھو Journal of the Royal Asiatic Society.
۱۹۔ شاہنامہ فردوسی۔
۲۰۔ سلجوق نامہ ظہیری نیشاپوری +

۲۱- مجمع ارباب الملوک مصنفہ قاضی رکن الدین کوہی۔
۲۲- استظہار الاخبار مصنفہ قاضی احمد دامغانی
۲۳- جامع التواریخ مصنفہ ملا رشید الدین۔

تاریخ گزیدہ میں مفصلہ ذیل ابواب و فصول ہیں:-

مقدمہ

باب اول- در ذکر پیغمبران و حکما کہ قبل از اسلام بودہ اند۔
فصل اول- در ذکر انبیا و پیغمبران و رسل اولو العزم
فصل دوئم- در ذکر حکما۔
باب دوم- در ذکر بادشاہان پیش از اسلام۔
فصل اول- در ذکر پیشدادیان۔
فصل دوئم- در ذکر کیانیان۔
فصل سوئم- در ذکر احوال ملوک الطوائف۔
فصل چہارم- در احوال ساسانیان
باب سوئم- در ذکر محمد مصطفٰے و خلفائے او۔
فصل اول- نسب پیغمبر و کیفیت او۔
فصل دوئم- خلفائے راشدین۔
فصل سوئم- آئمہ اثنا عشر۔
فصل چہارم- بعضے از صحابہ و تابعین
فصل پنجم- خلفائے بنی امیہ۔
فصل ششم- خلفائے بنی عباس۔
باب چہارم- بادشاہان بعد از اسلام۔

فصل اول - در ذکر صفاریان ۲۵۳ھ - ۲۸۷ھ -

فصل دوم - در ذکر سامانیان ۲۸۷ھ - ۳۸۹ھ -

فصل سوئم - در ذکر غزنویان ۳۹۰ھ - ۳۸۹ھ -

فصل چہارم - در ذکر غوریان ۵۴۵ھ - ۶۰۹ھ -

فصل پنجم - در ذکر آل بویہ ۳۲۱ھ - ۴۴۸ھ -

فصل ششم - در ذکر سلجوقیان -

(۱) - سلجوقیان ایران ۴۲۹ھ - ۵۹۰ھ -

(۲) سلجوقیان کرمان ۴۳۳ھ - ۵۸۳ھ -

(۳) سلجوقیان روم ۴۸۰ھ - ۶۷۹ھ -

فصل ہفتم - در ذکر خوارزم شاہیان ۴۹۱ھ - ۶۲۸ھ -

فصل ہشتم - در ذکر آتابکان -

(۱) آتابکان دیار بکر و شام ۴۸۱ھ - ۶۰۱ھ -

(۲) آتابکان فارس ۵۴۳ھ - ۶۶۳ھ -

فصل نہم - در ذکر اسمعیلیان -

(۱) اسمعیلیان مصر و مغرب ۲۹۶ھ - ۵۵۶ھ -

(۲) اسمعیلیان ایران ۴۰۳ھ - ۵۵۴ھ -

فصل دہم - در ذکر قراختائیان کرمان ۶۲۱ھ - ۷۰۶ھ

فصل یازدہم - در ذکر آتابکان - لرستان -

(۱) آتابکان لر بزرگ ۵۵۰ھ - ۷۳۰ھ -

(۲) آتابکان لر کوچک ۵۸۰ھ - ۷۳۰ھ -

فصل دوازدہم - بادشاہان مغول ایران ۵۹۹ھ - ۷۳۰ھ -

تاریخ گزیدہ کے مختلف حصّوں کو یورپ کے بعض مستشرقین نے فرانسیسی اور انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ باب چہارم کو جس میں شاہان ایران کا تذکرہ ہے موسیو یوس گانٹن M. Y. Gonton نے فرنچ میں ترجمہ کرکے ۱۹۰۳ء میں بمقام پیرس چھپوایا۔ موسیو باربی دی مینارڈ

M. Barbier de Meynard نے فرانس کے مشہور
رسالہ ایشیا Journal Asiatique بابتہ سنہ ۱۸۵۷ء سلسلہ پنجم جلد دہم
میں باب ششم کا ترجمہ شائع کرایا جس میں شہر قزوین کی تاریخ اور وہاں کے آثار
و ابنیہ وغیرہ کے حالات مذکور ہیں۔ مسٹر اے۔ جی۔ براؤن۔ ایم۔ اے۔ E. G.
Browne نے انگریزی میں فارسی شعراء کے حالات ترجمہ کیے جو باب پنجم
کی فصل ششم میں شامل ہیں اور ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۰۰ء اور جنوری سنہ ۱۹۰۱ء کے رسالہ
رائل ایشیاٹک سوسائٹی Royal Asiatic Society
میں شائع ہوئے ہیں +

تاریخ گزیدہ کے قلمی نسخے دنیا میں بہت سے موجود ہیں۔ یورپ کے مشرقی
کتب خانوں میں (۴) نفیس نسخوں کا پتہ چلتا ہے (۱) ایک قدیم نسخہ جس کی
سنہ ۸۵۰ھ میں کتابت ہوئی تھی ایران میں معتمد الدولہ حاجی فرہاد میرزا مصنف
جام جم کے یہاں موجود تھا۔ مشہور عالم شرقیات مسٹر اے۔ جی۔ براؤن E. G.
Browne نے جو کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی پروفیسر ہیں اس نسخہ کو حاجی میرزا عبد الحسین
کاشانی کے توسط سے منگوایا اور عکس میں چھپوا کر اوقاف مسٹر گب کی طرف سے
سنہ ۱۹۱۰ء میں شائع کرایا +

اب ہم کتاب مذکور کے چند صفحات ذیل میں بطور نمونہ درج کرتے ہیں۔

بادشاہان بنی صفار

فصل اول ۔ از باب چہارم

لیث کر بچہ سیستانی بود۔ در خود نخوتی میدید و ذکر تلطف نشد از صلاح

درراستے بہ عیاری و راہزنی افتاد - اما دران راہ طریق انصاف سپردی و مال کسی بہ یکبارہ نبردی و بودی کہ از بردہ بعضی باز دادی شبی خزانہ درہم بن نصر بن لیث بن سیار کہ والی سیستان بود برید و مال بے قیاس بیرون برد، پس چیزے شفاف یافت تصور گوہری کرد برداشت و زبان امتحان برآورد نمک بود - چوں حق نمک پیش او بہ قبض مال غالب آمد - مال را بگذاشت و برفت شبگیر خازن از آن متعجب شد - بدرہم بن نصر باز نمود - درہم منادی کرد و دزد را امان داد تا حاضر شود لیث صفار پیش او رفت درہم پرسید کہ چون بر اموال قادر شدی - موجود نابردی چہ بود لیث حکایتہ نمک و حق آن یاد کرد - درہم را پسندیدہ آمد او را بر درگاہ خود سرہنگ ساہ چاوشی داد و پیش او مرتبہ جاہ و یافت و امیر لشکر شد بعد از و پسرش یعقوب بن لیث صفار پس از وفات درہم بن نصر پسرانش خروج کرد - از ۲۳۷ھ سبع و ثلثین و مائتین برکار او ترقی گرفت امرا و ارکان دولت درہم بن نصر با و متفق شدند - تا ۲۵۳ھ ثلث و خمسین و مائتین بر تمامت ولایت سیستان مستولی شد نصر و صالح بگریختند و پناہ بہ بادشاہان کابل بردند - بمدد ایشان با سی[3] ہزار مرد بہ جنگ یعقوب آمد - یعقوب با سہ ہزار مرد برابر رفت - یعقوب از حیلت با تنبل بادشاہ کابل مکر کرد و او را بہ فریفت و پیغام داد کہ از کردہ پشیمان ست و آرزدی مخدوم زادگان شرمسار اگر عذر در پذیرد و چوں دران طرف امید امان یا بم و عہد و میثاق آید و مطاوعت آیم و ملک بسپارم - تنبل این فریب بخورد و بجہت تمہید عہد و میثاق با نصر و صالح در زیست - و سی[3] صد سوار از لشکر بہ گوشہ و در رفت یعقوب نیز با ہمیں مردم برفت و بر ایشان غلا کرد و تمامت لشکر را بکشت و با لشکر بر سر کابلیاں تاخت و از ایشاں شش ہزار آدمی بہ تیغ گذرانید و کار سیستاں با قرار گرفت بعد از دو سال بر ملک ہری مستولی شد - محمد بن احمد

بن طاہر بن عبد اللہ طاہر ذو الیمین حاکم خراسان بود در خود قدرۃ مقاومت او نیافت۔ خواست کہ بہ حیلہ با وچیرہ شد۔ آن معنی خود بسبب نیکوی دولت یعقوب بن لیث گشت بدوستی پیغام فرستاد وحکومت کرمان باو داد۔ تا در غیبت یعقوب مرسیستان مستخلص کند۔ یعقوب از این معنی خورم شد چہ اندیشناک بود کہ اگر قصد خراسان کند لشکر کرمان از پشت رو در آئینہ برفت وکرمان مستخلص گرد۔ محمد طاہر در غیبت یعقوب امیرے قاسم نام باسپاہی کرمان باستخلاص سیستان فرستاد۔ غلام یعقوب لعیان نام بایشان حرب کرد قاسم کشتہ شد ولشکرش شکستہ گشت۔ یعقوب بہ لطف ومہر امرا خراسان را بیغامہا فرستاد وبہ بیم وامید ایشان را مطیع خود گردانید۔ محمد طاہر در شراب افتاد وملک بگذاشت وبہ بغداد رفت۔ یعقوب بہ تمامت خراسان مستولی شد وعزیمت فارس کرد۔ علی بن حسین بہ جنگ او با مردم شہر بیرون رفت وطوق بن قیس را اسیر کرد وبہ شیراز رفت وبعد از محاربہ اسیر شد وملک فارس بہ دست یعقوب آمد۔ معتز خلیفہ او را بادشاہی داد ومنشور وخلعت فرستاد تا علی بن حسین وطوق بن قیس از د خلاص شدند۔ یعقوب لیث مدت دو سال وشش ماہ بادشاہی کرد۔ ہر جا کہ نشان مال یافت بزور وظلم بستد مالہا جہاں باو گرد ید ہوس عراق کرد وبا مازندران بہ جنگ الداعی الی الحق حسین وبک الہا فرفت ومظفر شد۔ پس از این ہواے بغداد کرد وروے بہ جنگ معتمد خلیفہ نہاد۔ خلیفہ برادر خود موفق را بہ جنگ او فرستاد۔ در حلوان جنگ کردند یعقوب شکستہ بہ خوزستان رفت باز معاودت کرد ودر رابع عشر شوال سنہ ۲۶۵ خمس وستین ومائتین انجا در گذشت چنانکہ ذکر رفت ٭

عمر بن لیث الصفار۔ بعد از برادر بادشاہی باز تعلق باو گرفت و

بیست و دو [۲۲] سال حکم کرد و کار او عروج تمام یافت بر خراسان و عراق و فارس و کرمان و سیستان و قهستان و مازندران و غزنه مستولی شد۔ رافع بن هرثمه با او مخالفت کرد و با حکام طبرستان و مازندران اما بوقت حرب مخالفت نمودند و معاونت رافع نکردند۔ رافع منهزم شد و به باورگیرخت آهنگ تحشب کرد۔ عمرو لیث راهش گرفت بیشتر لشکر تنها را عمرو لیث رفتند۔ رافع پناه به بادشاه خوارزم برد و او بر رافع عذر کرد و بکشت و سرش به عمرو لیث فرستاد۔ کار عمرو لیث قوی شد و طمع در خوزستان و عراق عرب کرد با معتمد خلیفه طریق مخالفت سپرد و خلیفه اسمعیل سامانی را الفرمود تا با او جنگ کند۔ در ربیع الآخر سنه سبع و ثمانین و مائتین با دوازده هزار مرد جنگی به جنگ عمرو لیث رفت گذر بر هری داشت در کوچه باغی درختی سیب سر براه داشت۔ اسمعیل غلامی را نهان برو گماشت تا خود کسے از آن تصرف نخواهد کرد یا نه همه لشکر بران گذشتند و به یک سیب تصرف نه کردند۔ اسمعیل خدائے تعالیٰ را سجده شکر گزارد که سیاست و عدل او در لشکر بدین مرتبه رسیده است و امید در ظفر بست۔ عمرو لیث با هشتاد هزار مرد برابر آمد چون فریقین صف بیاراستند و طبل فرو کوفتند اسپ عمرو لیث نشاط کرد و او را در ربود و به میان لشکر اسمعیلیان آورد تا بے جنگ گرفتار شد و آن همه به بانگ طبلے منهزم شدند۔ عمرو لیث را در خزانه محبوس کردند از فراشان او یکے آنجا یگه بگذشت عمرو او را بخواند و گفت جهت من چیزے خوردنی ترتیب کن فراشی پاره گوشت بدست آورد و در دیغلاوے قلید ساخت در خوابچی رفت سگے سر در دیغلاوے کرد و استخوانی برگرفت و دهانش بسوخت سر به تعجیل بیرون آورد۔ حلقه دیغلاوے به گردنش افتاد و مید و دید دیغلاوے میبرد۔ عمرو بخندید موکلان که ملازم بودند سوال کردند

که عجب خند چه بیست گفت که امروز بامداد خواستم شکایت میکرد که
بلخ ... ترمذ ... می برند زیادت می باید کرد شب هنگام مشاهده کنیم
که سگی آسمانی ...

اسمعیل از حاجب رایش عمرو لیث فرستاد و استمالت داد که انشاء الله
ترا از چشم خلیفه خلاص کنم عمرو اسمعیل آفرین کرد و گفت میدانم که مرا از خلیفه روی
خلاص نخواهد بود اما امیر اسمعیل اینجا طریقه مردی بود گفت بازو بندی بران حاجب
داد و گفت این نسخهای گنجهای من و برادر من است همان بهتر که این مال
به بندگان تو عاید گردد تا ایشان را ازین اسبی باشد از بندگی امیر توقع آن است که
کردار موافق گفتار فرمایند و از خزان من دست کوته کنی و مرا به حضرت خلیفه فرستی
حاجب تصور آنکه جهت امیر اسمعیل تحفه آورده بشاش می آمد حال باز گفت
اسمعیل بانگ بر وی زد و گفت برو این نسخه باز ده و بگوی اسمعیل می گوید از
غایت دانش میخواهی که بدین فضولی جهل تو و برادرت را گنج کجا بود و همه جهان را
معلوم است که شما رویگر بچگانید و دو سه روزی مساعدتی که بحقیقت عین شقاوت
است - مساعد شما گشت و در جهان استیلا یافتند - بزور ظلم و جبر اموال حاصل
گردید مظلمه که از آن اموال در گردن شماست می خواهی که به صنعت در گردن
من کنی دامن از آنها شستم و آنچه گفته ام قصد خونش نه کنم چون مرا باد حق
خون نیست چرا دست بخونش بیالایم و آنچه گفته او را به خلیفه فرستم بغیر ازین چگونه
توان کرد - حاجب برفت و گنج نامه باو رسانید با جواب هزار آفرین بر روان
و اعتقاد اسمعیل باد - امروز بربالای افتاده ایم که برادر خون برادر جهت اندک فائده
روا میدارد و غنیمت میشمارد - اسمعیل سامانی عمرو لیث را بحضرت خلیفه فرستاد
چون چشم خلیفه بر عمرو لیث آمد گفت الحمد لله الذی کفتی مئنک وکفی شغلک

واو را محبوس کرد۔ در عہد معتضد دو سال محبوس بود۔ بوقت وفات معتضد بر اتی خادمی بہ فرستاد تا او را بکشت او را فراموش کردند۔ و خوردنی ندادند از گرسنگی بجرو کار او از اعتبار جہانیان ست بآنکہ از بادشاہان ہیچکس را چون او سفرہ نبود از گرسنگی مرد۔ آز آثار عمرو لیث جامع عتیق شیراز است۔

طاہر بن محمد بن عمرو لیث الصفار۔ چون جدش اسیر گشت ارکان دولت او را بہ بادشاہی بہ نشاندند یک سال و چند ماہ کر دفردی کرد۔ و سر انجام اسمٰعیل سامانی باو غلبہ کرد و بادشاہی بستد بعد از مدتی حکومت سیستان بنیرہ اش احمد داد واز وبہ پسرش رسید بعد از وبہ نبیرہ اونصر بن احمد بن طاہر بن خلف حاکم شد و تا ۵۵۹ تسع و خمسین و خمسمائۃ حکم کرد و عمرش از صد سال گزشتہ بود۔ این زمان نسل بہ نسل حکومت ایشان سیستان تعلق دارد۔

(از صفحہ ۳۱۷ تا ۳۷۸)

حکیم سید شمس اللہ قادری۔ آنریری سکریٹری آرکیولوجیکل سوسائٹی

یاسمین۔ پروفیسر میرزا احمد سعید صاحب ایم۔ اے مصنف خواب ہستی کا یہ لاجواب و نتیجہ خیز ناول اور تمدن ایجنسی کی پہلی کتاب جس کا عرصہ سے ملک کو انتظار تھا تیار ہوگئی ہے۔ یہ کتاب جو در حقیقت حسن و محبت کی زندہ تصویر ہے۔ قابل مصنف نے خصوصیت سے نوجوان طلبائے کیواسطے لکھی ہے اور مختلف مضامین پر اس قابلیت سے بحث کی ہے کہ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ یاسمین جو اس تمام قصہ کی جان ہے او بنگال کی ایک مشہور نازنین ہے اسکی زندگی کا ہر ورق فلسفہ حیات کے پیچیدہ مسئلہ کو نہایت خوبی سے حل کر رہا ہے۔ قابل مصنف کا اسم گرامی کتاب کے لاجواب ہونے کی کافی ضمانت ہے قیمت فی جلد عہ ر ایک روپیہ منیجر عصمت و تمدن دہلی۔

روضۂ امام رضا کی تباہی

وہ مرقد جس کے گنبد کی طلاکاری سکھاتی ہے　　فلک پر قرص خورشید درخشاں کو زر افشانی
قسم مامون عباسی نے کھائی جس کی حرمت کی　　نگہباں جس کی تھی عباس اعظم کی جہانبانی
جہاں جاروب کش پلکیں ہوئی ہیں کجکلاہوں کی　　ادب سے چومتے ہیں جس کو ایرانی و تورانی

اُسی مرقد کو ڈھانے آئے ہیں واحسرتا روسی　　فنا گستر ہے جنکی توپ کے گولوں کی غلطانی
نکلکر اشقیا کا لشکر آیا ہے جہنم سے　　ہے بہرِ تیغ سفاکاں یہاں مسلم کی گرانجانی
جوان و پیر و طفل و زن ہوئے سب قتل مشہد میں　　کہ گذرا سر سے کل من علیہا فان کا پانی
وہ روضہ جس کے خادم تھے ملائک آہ کل شب تک　　شریر و لعیں کے ہوتی ہے اُس کی آج دربانی

مرا دوٹو آپ کو اسلامیوں کی کیوں نہیں پروا　　پریشاں کیوں نہیں کرتی تمہیں اُنکی پریشانی
مسلماں ایک ہیں اسواسطے غم ایک ہے اُن کا　　حقیقت کس لیے اب تک نہیں تم نے یہ پہچانی
لگایا روس نے پہلوئے مسلم میں نشاں خنجر کا　　یہاں لائی ہے رنگ اُس زخم کی خوں نابہ افشانی

ضعیفوں پر نہیں جو رحم کرتا برملا اُس سے　　یہ نکتہ جس میں مضمر ہے حقیقت ایک یزدانی
عجب ناداں ہیں جنکو ہے عجب تاج سلطانی　　فلک بالِ ہما کو پل میں بخشے ہے مگس رانی

شیدا -

رملہ بنت زبیر

نمبر۴

طویس تنہائی کا نام آتے ہی وہاں سے بلا کسی انتظار کے کھسک آیا اور آتے ہوئے دروازہ بھی بند کر دیا، اس کے بعد لیلی مسند سے اٹھ کے عزہ کے پہلو میں جا بیٹھی اور خفیف آواز میں عزہ سے پوچھنے لگی "رملہ بنت زبیر سے تو آپ واقف ہوں گی"

عزہ۔ رملہ سے کون واقف نہیں، جو عبداللہ ابن زبیر کی بہن ہے، وہ عبداللہ جو اس وقت شریعت اسلام کا سچا حامی اور جان نثار ہے اور امویوں نے جسے عبدالملک خلیفہ دمشق کی بیعت کا انکار کرنے سے محصور فی الکعبہ کر رکھا ہے۔

لیلی۔ اس اجمال کی ذرا تفصیل کیجئے۔

عزہ۔ یہ تو ایک مشہور واقعہ ہے کہ بعد وفات امیر معاویہؓ عبداللہ ابن زبیر نے حرمین کو مستقر قرار دیکر اپنی بیعت طلبی کا اعلان کیا تھا، جسمیں انہیں سید الشہداء کی شہادت، کے بعد کچھ آثار کامیابی نظر آئے اور یزید کے مرنے سے ان کے دعوے کو خاطر خواہ، تقویت اور ان کے گروہ میں معتدبہ اضافہ ہوا تھا، مگر عبدالملک کے نیر اقبال نے ان کے طالع بخت کو ماند کر دیا، اور آجکل اسی اپنے دعوے پر قایم رہنے، اور عبدالملک سے مصالحت پر راضی نہونے کی وجہ سے وہ اور اس کی جماعت عبدالملک کے لشکر کے محاصرہ میں گھری ہے۔

لیلیٰ۔ اس کا علم تو مجھے بھی ہے کہ اہل حجاز نے عبداللہ ابن زبیر کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور اسی مصیبت کی وجہ سے بنی امیہ اُس کے قتل کی اور اُس کی بیعت کا رُخ اپنی طرف پھیرنے کی گھات میں عرصہ سے لگ رہے تھے۔ مگر میرا سوال محض اُس نازک معاملہ کی تفصیل کے متعلق تھا، جو آجکل عبداللہ ابن زبیر کو درپیش ہے۔

عزہ۔ کیا تمہیں اس کی خبر نہیں کہ حجاج ابن یوسف ثقفی حسب فرمان عبدالملک معہ لشکر کے مکہ پر آکر اس لیے خیمہ زن ہوا ہے کہ عبداللہ ابن زبیر کو قتل کر کے حجاز میں بھی عبدالملک کا پورا تسلط بٹھا دے،

لیلیٰ۔ مجھے ضرور کچھ یاد پڑتا ہے کہ شام سے نکلتے ہوئے یہ خبر میرے گوشگذار ہوئی تھی،

عزہ۔ حجاج کے ظلم و ستم کی یوں ہی کیا کم دھاک تھی، مگر آجکل تو اُس نے عبداللہ ابن زبیر پر عرصۂ دنیا تنگ کر رکھا ہے،

یہ سنکر لیلیٰ چپ ہو گئی، اور فکر و حیرت کے آثار اُس کے چہرہ سے نمایاں ہونے لگے، مگر عزہ نے فوری ہی اُس سے پوچھا، کیوں خاموشی کی وجہ؟ تمہارے دل میں جو کچھ ہے اُسے تو کہو،

لیلیٰ۔ میں مدینہ سے ایک ایسے کام کے لیے نکلی تھی، جس کا تعلق رملہ سے تھا، لیکن عبداللہ بن زبیر کے مصائب اور شدائد کو دیکھتے ہوئے اب اس کا موقع ہی کیا ہے، کہ اُن اغراض کا ذکر زبان پر لایا جائے۔ تاہم یہ تو کہئے کہ رملہ کیا عبداللہ ابن زبیر کے ساتھ مکہ ہی میں ہے؟

عزہ۔ بے شک مکہ ہی میں ہے۔ اور کمی قوت وغیرہ کی وجہ سے وہ شب

اسوقت ناقابل برداشت مصائب کا شکار بن رہے ہیں،

یہ سنکر پھر لیلیٰ بحر تفکر میں غوطہ زن ہوئی اور اُس کی نظریں سامنے کے حصّہ مسند پر اس طرح گڑ گئیں، گویا اُس کے سوزن کاری، اور بناوٹ کے تار تار و علیحدہ کر رہی ہے،

عزہ نے پھر کہا، "لیلیٰ تمھارا مافی ضمیر کیا تھا؟ اُسے تم نے ابتک نہ ظاہر کیا، تمھارے سکوت سے مجھے سخت بے چینی ہو رہی ہے، آخر وہ معاملہ کیا ہے جس کا تعلق رملہ اور عبداللہ ابن زبیر سے ہے"

لیلیٰ ۔ آپ سے پوشیدہ رکھنے کی کوئی بات نہیں، بات صرف اتنی ہے کہ ہمارے امیر کا جو خاندان بنی امیہ کا ایک ممتاز رکن ہے رملہ کو خطبہ دینے کا منشا رہے اس لیے اُس نے مجھے رملہ کے صحیح حالات کی اطلاع اور خبر لانے کے لیے بھیجا ہے۔ آپا تو کہیے کہ رملہ کے بارہ میں آپکی رائے کیا ہے۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ رملہ سے آپ کا سابقہ بہت رہ چکا ہے۔ ایسی صورت میں آپ سے بہتر اُس کے حالات کی صحیح اور معتبر اطلاع دینے والا بھی مجھے کوئی نہیں نظر آتا۔

عزہ ۔ سبحان اللہ! رملہ کیا بحیثیت اپنے حسن و جمال ظاہری کے کیا اپنے خلق خصائل کی خوبیوں کے اعتبار سے، اور کیا فہم و فراست شائستگی اور سنجیدگی میں زنانِ مکہ کے لیے سرمایہ صد نازش و افتخار ہے لیکن مجھے تمہارے امیر کے اس طرفہ آرزو پر تعجب ہی نہیں بلکہ حیرت ہے کہ بنی امیہ اور رملہ کے بھائی عبداللہ ابن زبیر میں کہاں تو یہ کشمکش اور معرکہ آرائیاں درپیش ہیں، اور کہاں ایک امیر خاندان جو بنی امیہ سے ہے رملہ بنت زبیر کو خطبہ دینے کا خیال قائم کر رہا ہے۔

اسپر لیلی تہوڑی دیر تو ساکت رہی، پہر بولی "یہ عقدہ نام کے ظاہر ہو جانے
پر بہ آسانی حل ہو سکتا ہے۔ مگر نام کے اظہار میں مجھے صرف یہ خیال مانع ہے کہ بات
دوسرے کانوں میں کہیں نہ جا رہے، اور مجبیر قانون امانت اور راز داری کی
خلاف ورزی کی سنگین دفعہ عائد نہ کیجائے۔

عزّہ۔ تمہیں میری ذات سے مطلق اس کی امید نہ رکھنی چاہیئے، کیا جو سینہ
اعیان و شرافت مدینہ کے اسرار کا حامل ہے، وہ ایک تمہارے
راز کا متحمل نہ ہوگا اپنی تنگ ظرفی کا ثبوت دیدے گا،

لیلی۔ رملہ کو خطبہ دینے کا خواہشمند وہ امیر ابن امیر ہے، جو اپنی محاسن ذاتی
اعتبار سے خاندان بنی امیہ میں آفتاب ہے، جس کی عقل و فراست جسکی
تحقیق اور وسعت معلومات، جس کی قدرت کلام اور فصاحت کا اور
خاصکر جس کی کیمیا دانی کا اسوقت شہرہ ہے۔
چھوٹتے ہی عزہ نے کہا "میں سمجھ گئی" خالد ابن یزید" کہو کیا سمجھی!

لیلی۔ بے شک! خوب سمجھیں، پہر اب کیا مشورہ ہے۔
عزہ کی بھووں پر غور و فکر کے بل پڑگئے، اور تہوڑی دیر کے بعد بولی
کہ "اب میں اسباب کی تہ کو پا گئی کہ خالد کو رملہ کے خطبہ دینے پر آمادہ کرنے
والے اسباب کیا ہیں؟۔

لیلی۔ بے شک آپ کا ذہن اسکی کنہ کو پہونچا ہوگا، مگر مناسب ہے کہ دل کی
بات دل ہی میں رہے، اور لیجیئے تحفۃً یہ خالد نے اس مسئلہ کی تکمیل
کے لیے آپ کو بھیجا ہے، یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی آستین سے
ایک آبدار موتیوں کا ہار نکالکر اس کی طرف بڑھایا، جسے
عزہ نے لیکر کہہ لیا۔ سلسلۂ کلام میں رملہ کی اوصاف اور خوبیوں ک

ذکر بہت تفصیل سے آیا، جس پر عزہ نے اپنے ذاتی تجربہ اور سابقہ کو
بہت کچھ روشنی ڈالی۔ اس کے بعد لیلیٰ نے پھر ان سب باتوں کی
رازداری کے اہتمام کے متعلق مکرر عزہ سے کہا۔ عزہ نے کہا "لیلیٰ! تم
ٹھنڈے دل رہو۔ تمھارا راز مرے سر اور آنکھوں پر"۔ اخفار راز کا عہد
لینے کی لیلیٰ نے رخصت چاہی عزہ نے وہیں شب گزاری کی
اس سے درخواست کی، لیلیٰ نے معذرت کی کہ اُس کے دوسرے
رفیق سفر اُس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اور اب اُس کا یہاں
زیادہ ٹھہرنا ضرورت کے لحاظ سے نامناسب ہوگا۔
عزہ کو تسلیم کرنا پڑا، اور وہ رخصت ہوئی۔ جاتے ہوئے راستہ میں
باغ کے اندر طویس ملا۔ اور اُس کا سلام لیتی ہوئی وہ وہاں سے روانہ ہوئی
یہ بات اوپر بیان ہو چکی ہے کہ لیلیٰ عرب کی نامور شاعرہ عورتوں میں
شمار ہوتی تھی اکثر اُمرا اور سلاطین کے درباروں میں بالطریق وفد حاضر ہوتی
مدحیہ قصائد اُن کی شان میں پڑھتی اور صلہ و جائزہ حاصل کیا کرتی تھی۔ اسی عادت
کے مطابق اس سال وہ عبدالملک ابن مروان کی خدمت میں باریاب ہوئی
تھی اور اُس کی شان میں قصیدہ بھی پیش کیا تھا۔ اس کے بعد وہ خالد کے
یہاں بھی حاضر ہوئی جہاں رملہ کا ذکر ہو رہا تھا۔ جب یہ گئی تو عزہ کے توسط سے
رملہ کے حالات وغیرہ کی دریافت کی خدمت اس کے سپرد کی گئی۔ اور جب
وہ وہاں سے اس مرحلہ کے لیے روانہ ہوئی تو حسن نامی ایک سجیلا جوان سال
شخص بطور امداد اُس کے ساتھ کیا گیا۔ جو خاص خالد کا انیس صحبت تھا۔
حسن کی شان نزول یہ ہے کہ عبدالملک عراق میں مصعب برادر عبداللہ
ابن زبیر کو قتل کر کے اس کے لشکر کو ہزیمت دے چکا۔ اور عراق

یہ اپنا پورا تسلط جما کے اپنے دار الخلافہ شام کو واپس آیا تو حسن بھی قیدیان جنگ کے زمرہ میں اس کے ساتھ آیا تھا۔

حسن عراق میں عبداللہ ابن زبیر کی خلافت کے نقیبوں میں سے تھا اسی وجہ سے مختار ابن عبید ثقفی سے مصعب کو جو صف آرائی عراق کی مہم کے متعلق کرنی پڑی تھی اس میں حسن نے بڑی جانبازی کے جوہر دکھائے تھے جسکا انجام یہ ہوا تھا کہ مختار قتل ہوا۔ اور مصعب کو عراق کی نمایاں فتح حاصل ہوئی مگر پھر اس جنگ کے پیچھے عبدالملک کے مقابلہ کی جنگ میں مصعب کو جو گھمسان کی لڑائی پیش آئی اوس میں بھی اگرچہ حسن نے اپنی مردانہ شجاعت کی خوب داد دی، مگر عبدالملک کے لشکر کے سامنے مصعب اور اس کے ساتھیوں کی بساط ہی کیا تھی۔ نتیجہ وہی ہوا جو ایسے موقع پر چھوٹی فوجوں کو بڑے اور آراستہ لشکروں کے مقابلہ میں پیش آتا ہے

اس جنگ میں حسن کا باپ کام آیا۔ اور وہ خود بطور ایک قیدی کی فوج شام میں گرفتار ہوا۔ فوج کی واپسی پر خالد نے اُسے دیکھا تو پسند کیا اور اپنے ہمراہیوں میں لے لیا، اس کے بعد حسن کے حُسن، فانت رضا جوئی اور آقا پرستی نے قدرشناس خالد پر جو اثر کیا اُسی کا یہ ظہور تھا کہ وہ خالد کے تمام جزئی و کلی اسرار کا مالک، اور اس کا مشیر خاص بن گیا اس کے تمام اسرار کا حتیٰ کہ عبدالملک اور اس کے درمیانی رنجش اور کشیدگی کے سر بمہر راز کا باب بھی اس کے لیے مفتوح تھا۔

خالد، رملہ کے اوصاف وحسن کا شہرہ سُنکر عرصہ سے اس کے حُسن کا دلدادہ ہو رہا تھا۔ اور رملہ کے خطبہ دینے کی آرزوئے پنہاں اس کے دل میں تھی۔ ابتجہ لیلی اس کی مجلس میں گئی تو بخیال واقفیت اس سے رملہ کے حالات پوچھے گئے۔ مگر لیلی نے

جب اپنی ناواقفیت محض کا اظہار کیا تو عزہ کے توسط سے دریافت حال کی خدمت
تو اُس کے سپرد ہوئی اور عبد اللہ ابن زبیر کے نام ایک خط لکھا گیا جس میں
رملہ کا پیام اُن کو دیا گیا تھا اور وہ خط حسن کے حوالہ ہوا - کہ مدینہ سے لیلیٰ کے
استمزاج کرکے وہ مکہ جائے اور خط عبد اللہ ابن زبیر کو پہونچائے - اور اُس کے ہموار
کرنے اور موافق بنانے میں اپنی تشفی بخش جادو بھری تقریر کو پوری طرح کام میں لائے

حسن جس کا شریف دل خالد کے حسن سلوک کا ممنون تھا، اور جو ہمیشہ جان
نثاری پر تُلا رہتا تھا ظاہر ہے کہ جب اس مقصد کے لیے وہ خالد کے پاس سے
روانہ ہوا ہوگا کوشش اور سعی کے کیسے کیسے بلند عزائم اور ارادے کرکے
نہ چلا ہوگا - لیکن چلنے کے وقت اُسکی قلبی کیفیات اور اندرونی جذبات کا
یہ وفور تھا کہ بے ساختہ مسرت اور بشاشت اوس کے چہرہ سے پھوٹی نکلتی تھی
یہ کہنا کہ اوس کا ظاہری مقصد سفر اُس کی اِن بے اختیاریوں کا محرک تھا -
گویا تلاش و جستجو سے جی چرانا ہے - کیونکہ سفر کا آغاز تھا انجام نہ تھا -

واقفان اسرار قلوب، اور قیافہ شناسان بعلامات الوجوہ یوں انکشاف
حال کرتے ہیں - کہ حسن کو ذوق و شوق کی بے چینی محبت کی وارفتگی تھی
اُسکا قیافہ بولتا تھا کہ عشق صادق کو حسن دلفروز کا شوق نظارہ باعث حیرانی ہے -

غرض بعد طے منازل جب وہ لیلیٰ کے ساتھ گذشتہ روز شام کو مدینہ پہونچا جس کا
ذکر اوپر آچکا ہے - تو حسن ایک مقام پر عزہ کے مکان سے لیلیٰ کی واپسی کی انتظار میں ٹھیر گیا
لیلیٰ نے عزہ کے یہاں سے واپسی میں ملازم کو تو حکم دیا کہ اونٹ وغیرہ ..... کے مکان
کو لیجائے اور خود حسن کے پاس گئی - جہاں اُسکو انتظار کرتے ہوئے پایا اپنی
اور عزہ کی درمیانی گفتگو اوس سے نقل کی - پھر اُسے سفر مکہ میں تعجیل کرنے کی صلاح دی اور
کامیابی کی دعائیہ الفاظ کہکر خود وہاں سے روانہ ہوگئی - فقط (باقی) (عالی)

دنیائے اسلام

لہو روتا ہوں نقشہ دیکھ کر دنیائے ملت کا
جدھر دیکھو ادھر چھائی ہوئی ہے اک گھٹا غم کی
نہالِ آرزو تو خشک ہیں اس باغ میں لیکن
گلے مل مل کے شاخیں رو رہی ہیں نخلِ ماتم کی
خدا ہی اب محافظ ہے ان اپنے بھولے بھالوں کا
کہ سفاکانہ پڑتی ہیں نگاہیں ایک عالم کی
کہاں تک کوئی روکے، ہر گھڑی ہر ایک جانب سے
چلی آتی ہیں بوچھاڑیں مصیبتہائے پیہم کی

بہت کچھ سن رہے تھے غلغلہ تہذیبِ یورپ کا
حقیقت کھل گئی پر دشمنی سے صرف دو روم[عــہ] کی
ہوا اٹلی کے کرتوتوں سے یہ اندھیر عالم میں
کہ بے تقصیر لاکھوں کٹ گئی اولادِ آدمؑ کی
ہزاروں عورتیں بیوہ ہوئیں لاکھوں بے زباں بچے
ہوئے نذرِ اجل جب سر پہ شمشیرِ ستم چمکی

کلیجا منہ کو آتا ہے خیالِ حالِ ایراں سے
کہاں تک روئیے اب ابتر ہے حالت چشمِ پرنم کی
ادھر گلیوں میں بہتے ہیں لہو اعیانِ دولت کے
ادھر سڑکوں پہ لاشیں ہیں بزرگانِ مکرم کی
نہ کوئی عورتوں کو امن دیتا ہے نہ بچوں کو
ہے قتلِ عام کا بازار، بگڑی گردن خم کی

دہائی ہے دہائی ہے خبر لو یا رسول اللہ!
کمائی لٹ رہی ہے حضرت فاروق اعظمؓ کی

تمنائے عمادیؒ پھلواروی عظیم آبادی

عــہ دو روم سے مراد روم اور ایران ہیں۔ ۱۲۔ تمنا عمادیؒ غفرلہ۔

عہد واجد علی شاہ کے نامدار شعراء

حضرت بادشاہ سلامت خود بہت بڑے شاعر تھے۔ اختر تخلص تھا اور وقت کا زیادہ حصّہ مضامین آفرینی ہی میں گذرتا تھا قدر دانی کی وجہ سے دار السلطنت لکھنؤ میں شعرائے نازک خیال و سخنوران شیریں مقال ہر جگہ سے اُمنڈ آئے تھے ذیل میں اُن حضرات کا ذکر کیا جاتا ہے جو اُس وقت میں نامدار شعراء کہلاتے تھے اور دربار شاہی میں اُنکا وقار تھا۔

بطور تبرک حضرت بادشاہ کے چند اشعار لکھے جاتے ہیں بعد ازاں اور حضرات کا کلام درج ہوگا۔ فرماتے ہیں۔

جب کبھی برسات کی فصل آ گئی　　یاں گھٹا الفت کی دل پر چھا گئی
خضرِ دل تو چھوڑ دی الفت کی رہ　　اب طبیعت عشق سے گھبرا گئی

دیگر

شراب عشق سے پھول کے جام کی رونق　　کہ جیسے شعر و سخن سے کلام کی رونق
اسی طرح صفِ عشاق کی نمایش ہے　　نماز جمعہ میں جیسے امام کی رونق

نواب سیّد محمد خان رند } خلف نواب سراج الدولہ غیاث الدّین محمد خاں بہادر نصرت جنگ نیشاپوری تلمیذ رشید حضرت آتش فصیح و بلیغ صاحب کلام تھے فرماتے ہیں۔

کھلی ہے کُنج قفس میں مری زباں صیّاد　　میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیّاد
اُجاڑا موسم گل ہی میں آشیاں میرا　　الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیّاد

رند کے دیوان میں شکوۂ صیّاد نہایت پُر درد اور نفیس نظم ہے اوسی کے

چند اشعار یہ ہیں - ایک غزل کے اشعار ہیں کسقدر منجھا ہوا کلام ہے۔

زیبا ہیں جو گیسوئے خمدار کے لیے | ہیں پیچ و خم ازل سے بنے مار کے لیے
تسبیح کے لیے ہے نہ زنار کے لیے | گردوں ہے میرے ابروئے خمدار کے لیے
قطرے عرق کے ابرو پہ اپنے پونچھ ڈالیے | چھالوں کا ہونا عیب ہے تلوار کے لیے

ایک مرتبہ مشاعرہ میں نواب صاحب نے غزل پڑھی جس کے ایک شعر پر عجب مزا ہوا۔ وہ یہ ہے۔

رستہ روک کے کہو لو نگاہ کہتا ہے مجھی | کیا ملو گے نہ کبھی راہ میں آتے جاتے

غالباً پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار مرحوم نے (میں اسوقت بھولتا ہوں) نے فرمایا کہ نواب صاحب مصرعۂ دویم کو یوں پڑھ دیجیے۔

کیا ملو گی نہ کبھی راہ میں آتی جاتی

اسمیں کنایہ یہ ہے کہ نواب صاحب عاشق مزاج بزرگ تھے - پنڈت صاحب پر بہت ناراض ہوئے

تدبیر الدولہ منشی مظفر علیخان بہادر اسیرؔ (تلمیذ رشید مصحفی) حضرت بادشاہ سلامت کے دربار میں منشی تھے - عالم و فاضل اور بڑے پایہ کے شاعر گذرے ہیں - ہزہائی نس نواب یوسف علی خاں صاحب والی رامپور و ہزہائنس نواب کلب علی خاں صاحب والی رامپور نے بہت دنوں تک جناب اسیر سے استفادہ حاصل کیا - ملک الشعرا منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی اسیر کے ہی شاگرد تھے - آپ کا خاندان اب تک لکھنؤ میں موجود ہے۔

کلام

ہوں میں زخمی تیغ ابروئے ستم ایجاد کا | چاہیے زخموں کو مرہم بیضۂ فولاد کا
چشم مست یار میری فکر سے غافل نہیں | الحذر اے مرغ دل یہ خواب ہے صیاد کا

آفتاب الدولہ خواجہ اسد علی خاں قلق (خواجہ وزیر لکھنوی کے ہمشیرزادے اور

اور شاگرد ہیں۔ ان کی مثنوی طلسم الفت بہت مشہور و معروف ہی۔ سلطان عالم واجد علیشاہ کی کے مصاحبوں اور مقربین میں سے تھے۔ میرزا ولی عہد بہادر کے جشن شادی میں حسب معمول ان کو بھی خلعت ملا تو فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

خلعت و نیرے تو سب کچہ میں سنوا لیجاؤں
ایسی شادی میں تو سلق کہہ کے پکار اجاؤں

بادشاہ سلامت بہت خوش ہوئے اور خطاب آفتاب الدولہ مرحمت فرمایا۔

فتح الدولہ میرزا محمد رضا خاں برقؔ سلطان عالم واجد علیشاہ کے معزز مصاحبین میں سے تھے اور بخشی الملک کے عہدہ پر سرفراز تھے۔ انتزاع سلطنت کے وقت بھی بادشاہ سلامت کے ساتھ رہے اور ۱۸۵۷ء میں بمقام ٹیابرج کلکتہ انتقال کیا۔ میرزا برقؔ کا کلام بہت پرمغز و بلیغ ہے فرماتے ہیں

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو
دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

دیگر

ہم تو اپنوں سے بھی بیگانہ ہوئے الفت میں
تم جو غیروں سے ملے تم کو نہ غیرت آئی

میر وست علی خلیلؔ بادشاہ کے ہاں بعہدہ نظامت مامور تھے۔ ملک الشعرا خواجہ حیدر علی آتشؔ کے شاگرد رشید اور اجل شعرا میں سے تھے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

بتوں کا سبزہ خط خال کا نہیں محتاج
بغیر مہر یہ خط اعتبار رکھتا ہے

دیگر

رونے پہ باندھے جو میری چشم تر کمر
کیا فلک زمین پہ ہٹنی کمر کمر

میر وزیر علی صباؔ مشہور استاد ملک الشعرا آتشؔ کے شاگرد رشید ہیں کلام فصیح اور نازک ہے۔ فرماتے ہیں ؎

خدا کے فضل سے یوسف جمال ہو صاحب
اب اور چاہتے کیا ہو ہمیری ہو جائے

کلام

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہو گیا
پھر مشک شب جلن سے کافور ہو گیا
گویا کہ زنگ آئینہ سے دور ہو گیا
باطل سیاہ شب دیجور ہو گیا

کیا بخیہ روشنائی تھی قدرت کے خانہ میں
مضمون تھا آفتاب کا ذروں کے خانہ میں

کھولے ہوا میں طائر زریں نے بال و پر
بیٹھا وہ آکے چرخ چہارم کے بام پر
دانے ستاروں کے جو پڑے تھے ادھر ادھر
منقار زر سے چن لیے اس نے وہ سر بسر

پھر سیحان چشمۂ مہتاب ہو گیا
چشمہ تو خشک اور وہ سیراب ہو گیا

میر ببر علی انیس

تین چار پشت سے میر صاحب کے خاندان میں مرثیہ گوئی و شاعری موجود تھی۔ میر حسن آپ کے والد بڑے مشہور شاعر اور مثنوی گلزار ارم و بے نظیر کے مصنف ہیں حقیقت میں میر انیس فردوسی اردو تھے جس طرح فارسی میں شاہنامہ لاجواب کتاب ہے اوسی طرح اردو میں میر صاحب کی مراثی۔ میرزا دبیر اگر بلاغت کے بادشاہ ہیں تو میر صاحب فصاحت کے شہنشاہ۔

میر انیس و میرزا دبیر کی شہرت ہندوستان سے نکل کر یورپ تک بھی پونہچ گئی ہے۔ اور ہندوستان میں بھی تین قابل اشخاص نے دونوں صاحبوں

کے تذکرے لکھے ہیں سب سے اول اس میدان میں شمس العلما علامہ شبلی نعمانی مدظلہ آئے اور موازنہ انیس و دبیر کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھی مگر مجھے تعجب ہے کہ علامہ ممدوح نے میرزا دبیر کے کلام میں سو اشعار بھی ایسے نہ پائے جو میر انیس کی برابری کرتے۔ خیر یہ اپنا اپنا خیال ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ میرزا دبیر کا نمبر میر صاحب سے دوسرا ضرور ہے اور یہ خداداد بات ہے کہ قبولیت میر صاحب کو حاصل ہو گئی البتہ یہ بالکل بے انصافی ہے کہ میرزا دبیر کے کلام کو کلیتۂ میر صاحب کے مقابلہ میں پامال بنایا جائے۔

دوسری کتاب حیات انیس مولوی سید محمد علی صاحب اشہری مرحوم نے لکھی ہے۔ یہ کتاب کوئی معقول سوانح عمری و تنقید نہیں ہے۔ معمولی ہے تیسری واقعات انیس کے نام سے سید مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی نے تالیف کی ہے۔ میں نے اس کو دیکھا نہیں اس لئے ٹھیک رائے نہیں دے سکتا مگر خیال ہے کہ جناب احسن نے جو لکھا ہوگا اچھا ہوگا۔ وہ تمام حالات سے واقف اور اُن کے ذرائع معلومات وسیع ہیں میر صاحب کا خاندان لکھنؤ میں ابتک موجود ہے۔ اور لوگ ان افراد کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں۔

کلام

یارب چمنِ نظم کو گلزار ارم کر
اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر
گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر

جب تک یہ چمک مہر کی پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میری قلم رو سے نہ جائے

اس باغ میں چشمے ہیں تری فیض کے جاری
بلبل کی زباں پر ہے تری شکر گذاری
ہر نخل برومند ہے یا حضرت باری
پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری

وہ گل ہوں عنایت چمن طبع نکو کو
بلبل نے بھی سونگھا نہ ہو جن پھولوں کے بو کو

بلیغ الزماں
منشی ...

گرمی کی رُت

گرمی کی ترشت چڑھائی ہے جانِ عالم لبوں پہ آئی ہے
العطش العطش زباں پر ہے سب نے رٹ ایک ہی لگائی ہے
دھوپ سے ہوگئے ہرن کالے اور تیتری پہ شامت آئی ہے
ملوطلوں کی ہوگئی ہٹ ہیں فش چیل بھی انڈے چھوڑ آئی ہے
تیتر بھی جا کے چھپا ہے ریں میں اک ذرا واں جو ٹھنڈ پائی ہے
پانی پر چلتی اور کچھوے سب ایک خلقت اُمڈ کے آئی ہے
ہے سمٹوں اُڑتی دھول شہر کو نہر راہ گیروں نے خاک کھائی ہے
جھلسے دیتی ہے منہ کو بادِ سموم ایسی تیزی سے تلملائی ہے
جس نے اس تند خو لپٹ سے ذرا منہ ملایا تو منہ کی کھائی ہے
آندھیوں کے ہیں اُٹھ رہے طوفاں خس و خاشاک کی چڑھائی ہے
مرے جاتے ہیں پانی بھر بھر کر سقّوں کی جان پہ بن آئی ہے
ٹپکی پڑتی ہے رال شربت پر برف کی اب بہار آئی ہے
ہیں پسینہ میں تر بتر کپڑے دل میں اِک آگ سی سمائی ہے
اُٹھ رہا ہے دھواں سمندر سے آگ پانی میں کیا لگائی ہے
میلہ سا اک لگا ہے دریا پر پانی بھرنے کو خلقت آئی ہے
کچھ نہاتے ہیں لوگ مل جل کر ہوتی آپس میں ہاتھا پائی ہے
دن بڑا ہوگیا ہے چھوٹی رات واہ کیا شانِ کبریائی ہے
دن تو بس جیسے تیسے کرکے کٹا رات اِک اور تحفہ لائی ہے

کھٹملوں کا شروع ہوا آنا + مچھروں کی بھی رونمائی ہے + الغرض اک عذاب ہے دل کو + گرمی کیا آئی موت آئی ہے + سید لطف علی بلگرامی دفتر گڑھ

حسنِ تلافی

ایک دن جنگل میں دوپہر کے وقت جب سورج آفتاب محشر کی گرمیاں دکھا رہا تھا - اور لو باد سموم کا مزا چکھا رہی تھی - ایک ہرنی بچے کو لیے ایک ہرے بھرے مہوے کے درخت کے نیچے بیٹھی تھی - اسی درخت کی شاخوں میں ایک کبوتر نے بھی آفتاب کی جلانے والی کرنوں سے پناہ لی تھی - اور وہیں اس کے سر پر ہرے ہرے پتوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھکر خوشی سے غوں غوں کر رہا تھا - ہرنی نے سر اُٹھایا اور ایک حسرت بھری نظر سے کبوتر کو دیکھکر کہا "واہ واہ کیا خوش نصیب پرند ہے - ہوا اسکو ورثے میں ملی ہے کہ جہاں جی چاہے جائے - اور جدھر جی میں آئے اُڑے - اس کی سرعت پرواز نسیم اور صرصر کے جھونکوں کو گرد کی طرح پیچھے چھوڑ جاتی ہے - اور اس کی قوت بازو اسے دوڑتے ہوئے بادلوں کے اوپر لیجاکر آسمانوں کی سیر کراتی ہے - ایک میں ہوں کہ اس تودۂ خاک سے وابستہ ہوں - میری عمر تلاش معاش ادھر سے اُدھر بھٹکتے ہی بھٹکتے تمام ہو جاتی ہے - شیر و پلنگ کے دندان آز بھی مجھ پر تیز ہیں - آدمیوں کے تیر و تفنگ کا نشانہ بھی میں ہی ہوں عجب زندگی ہے کہ نہ جائے اقامت ہے نہ پائے گریز"

کبوتر نے ہرنی کی یہ باتیں سنکر ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا "اسمیں شک نہیں کہ ہوا میں اُڑنا اور آسمان کی سیر کرنا بہت دلچسپ ہے - مگر نہ اتنا جتنا کہ تو سمجھتی ہے - ہرنی - ہرنی - اگرچہ میں درخت کی ٹہنیوں پر بیٹھا ہوں - مگر

میں حسرت سے تیرے بچے کو دیکھ رہا ہوں جس کو تو محبت سے اپنی چھاتی سے لپٹائے ہوئے ہے۔ اور جسکو تو اپنا خون جگر پلا پلا کر پرورش کر رہی ہے۔ کاش اگر اختیار ہوتا تو میں اپنے بال و پر نوچ کھسوٹ کر پھینک دیتا اور اپنی ساری آزادی اور بے فکری کو ایک دم کے لیے اپنے بچے کو اس طرح گلے لگانے کے عوض میں قربان کر دیتا۔ تو کیا جانے کہ میں تیری اس پابندی کی حالت پر کتنا رشک کرتا ہوں۔ میرا دل ان مشفقانہ جذبات اور مادرانہ خیالات کے احساس کے لیے کیسا تڑپتا ہے۔ جن کی تیرے نزدیک کچھ قدر ہی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کیا تو مجکو ہوا میں اڑنے کی وجہ سے اپنی نسبت زیادہ محفوظ گمان کرتی ہے۔ افسوس۔ میں بھی یہاں شکرے اور شاہین کا شکار ہوں۔ مجھ پر بھی انسانی صیاد نے اپنا دام بلا پھیلا رکھا ہے۔ یہ سچ ہے کہ تو ایک حد تک پابند ہے۔ اور میں آزاد لیکن اگر تجھے میری آزادی پر رشک ہے تو مجھے تیری پابندی پر۔"

ہوا کے ایک جھونکے سے درخت کی شاخوں میں سائیں سائیں ہوئی۔ اور اس کے پتوں نے تھرتھراتے ہوئے زبان حال سے کہا "اگر ہرنی کو اپنی پابندی پر افسوس ہے تو میں تو جس قدر افسوس کروں بجا ہے۔ یہ ہرنی جو روئے زمین پر سب سے زیادہ سریع السیر اور تیز رفتار جانور ہے جو صبح کو یہاں اٹھے تو شام کو یہاں سے سیکڑوں میل دور ہو۔ جس کے پاؤں تلے زمین اڑتی جاتی ہے۔ جس کی رفتار کے سامنے قدرت زمین کی کی طنابیں کھینچ دیتی ہے۔ اسکو اور اپنی پابستگی کی شکایت۔ اپنی سست رفتاری کا گلہ؟

اے جرس اینہمہ فریاد ز دلتنگی چیست شکرہا کن کہ دلالت جائے طپیدن او

مجھ کو دیکھو کہ جس حصۂ زمین نے میرے بیج کو اپنے پیٹ میں پالا تھا۔ جس کے دامنِ شفقت میں میں بڑھا پھولا اور پھلا۔ اس بڑھاپے میں بھی اس جگہ کھڑا ہوں موسم آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ گرمی۔ سردی۔ بہار۔ خزاں۔ دھوپ۔ چھاؤں سب اپنے اپنے بندھے ہوئے وقتوں پر آتے ہیں۔ اور مجھے وہیں پاتے ہیں۔ اور آخر سب چلے جاتے ہیں۔ اور مجھے وہیں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہوا کے جھونکوں سے میری ہری شاخیں جھومتی ہیں۔ میرے پتے ہلتے ہیں۔ گویا وہ بھی ان کے ساتھ ہی دنیا کی سیر کے شوق میں مست ہو کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں لیکن ہوائیں چلی جاتی ہیں اور وہ وہیں رہ جاتے ہیں پرندے آکر میری ٹہنیوں پر بسیرا لیتے ہیں اور اُڑ جاتے ہیں۔ جانور آکر میرے سایے میں آرام کرتے ہیں۔ اور چلے جاتے ہیں۔ مگر ایک میں ہوں کہ زمین نے میرے پاؤں پکڑ رکھے ہیں۔ جہاں اُگا تھا وہیں لگا ہوا ہوں۔ اور وہیں کھڑا رہونگا۔ یہاں تک کہ آخر ایک دن سوکھ کر گر جاؤں گا۔ اور میرا زاد بوم ہی میرا مرقد ہوگا۔ میرا وطن ہی میری قبر بنے گا۔"

یکایک درخت کی جڑ سے دبی ہوئی ایک آواز آئی۔ جسکو نہ درخت پہچانتا تھا۔ نہ ہرنی جانتی تھی اور نہ کبوتر اس سے آشنا تھا۔ یہ ایک ہیرے کی صدا تھی جو ایک چٹان میں چھپا ہوا تھا۔ اور اپنی آب و تاب اور اپنے رنگ روپ کو پتھر کے پردے میں چھپائے ہوئے کسی قدردان جوہر شناس کے انتظار میں پڑا تھا۔ اس نے اپنے سنگین قید خانے میں سے ہرنی کبوتر اور پیڑ کی یہ باتیں سنی تھیں اور آخر جب اس سے نہ رہا گیا تو اس نے بھی کہا "جب تم سب چیزیں اپنی حالت پر افسوس کر رہے ہو تو پھر میری حالت تو قابلِ بیان ہی نہیں ہے۔ تم سب زندہ تو ہو۔ تم سب میں جان تو ہے

اے درخت مجھ میں ہی - تیری شاخیں ہر سال پھلتی پھولتی ہیں - تیری کونپلیں ہر برس نکلتی ہیں اور پھوٹتی ہیں - تو اپنی بے شمار زبانوں سے پانی پیتا ہے - اور اپنے لاانتہا منہ سے سانس لیتا ہے - نسیم سحری تیری کلیوں کو کھلاتی ہے - باد بہاری تیرے پھولوں کو جھولا جھلاتی ہے تو نے وحشی پرندوں کے لیے اپنی آغوش محبت کھول رکھی ہے انسان و حیوان کے لیے اپنے پھل پتوں کا خوان عام بچھا رکھا ہے - جس پر دوست دشمن کی تمیز نہیں - جہاں اپنے بیگانے میں فرق نہیں -

شکوہ سنگدلی غنچہ بہ ناطق بہ گزار شکر ہا کن دلت امید شگفتن دارد

اسیر بھی - تجھے اپنی حالت پر قناعت نہیں - الٹی شکایت ہے بیٹھے دیکھ اور شرما - سچ یہ ہے کہ اگر کسی کا شکوہ درست ہے تو میرا - اور کسی کی شکایت بجا ہے تو میری - اور صرف میری "

درخت نے جواب دیا" افسوس - یہ سچ ہے کہ ہم میں جان ہے جو تجھ میں نہیں ہے - مگر ساتھ ہی ہمارے لیے ایک اور چیز بھی ہے جو تیرے لیے نہیں ہے - اور وہ زندگی کا سایہ ہے - یعنی موت - تیرے خوبصورت دربایچے - میرے پھل پھول - جنکو ہر سال میں ایسی محبت اور محنت سے پالتا ہوں - وہ اس لیے کھلتے ہیں کہ مرجھائیں - وہ اسی لیے شگفتہ ہوتے ہیں کہ کھلا جائیں - ان کے پیدا ہونیکا نتیجہ کیا ہے ؟ - فنا - جہاں وہ گئے ہیں وہیں عنقریب میں بھی جانے والا ہوں - مگر تو - اے میرے تو تو جیسا ہے ویسا ہی رہے گا تیری آب و تاب - تیری چمک دمک ہمیشہ یونہی رہیگی - اور تو آخری انسان کے سورج کی کرنوں سے بھی اسی طرح چمکیگا - جیسا کہ آج چمک رہا ہے - (ترجمہ) منشی انوار الحق عفی

انتہائے حمیت

مظلوم سے ہمدردی عطیۂ فطرت نہیں ورنہ ظالم بھی اس نعمت سے محروم نہ ہوتا البتہ شیوۂ انسانیت ضرور ہے۔ مگر یہ فیصلہ کہ فاعل کے اس فعل پر ظلم کا اطلاق ہوسکتا ہے یقیناً اُس وقت قابل اعتبار نہیں جب مظلوم کے ساتھ فیصلہ سے قبل ہمدردی موجود ہو اسی سبب کافی یا ناکافی اگر ہم کو ان واقعات میں جو ہمارے پیش نظر ہیں اپنی معقول نامعقول ایک وجہ بھی خواہ وہ اصلیت پر مبنی ہوتی یا برائے نام میسر آجاتی تو ہم ابن حمیرہ کیا اس کے معزز معاصر علامہ بیرونی تک سے اس اشتداد کے بدظن ہونے میں نہ چوکتے مگر اسکا کیا علاج کہ از ابتدا تا انتہا کہیں پاؤں ٹکانے کی بھی جگہ نہیں ملتی اور مجبوراً یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ صادقہ اور یوسفی دونو بہنیں ایک سے ایک بڑھ کر کرموں جلی اور نصیبوں پہوٹی نکلیں حاشا وکلّا اگر ہم نے مولانا یوسف کے تقدس میں قصداً تساہل کیا ہو ہم ایسے بزرگوں کا احترام جو ہمارے پیشوا اور امام ہوں عام اس سے کہ وہ مستحق وقعت ہوں یا نمک حرام نصب العین تصور کرتے ہیں مگر علمائے اکرام یہ دیکھکر ناخوش نہ ہوں گے کہ آج کامل تین صدیاں گذر جانے پر بھی ایک متنفس ابن حمیرہ کے ان چند واقعات کا جو وہ قلمبند کر گیا بطلان نہ کرسکا ❊

مسئلہ تقدیر حیات انسانی کی پاٹ یا مذہب کی ایک آڑ ہی مگر خالق و مخلوق کا

اصل مابہ الامتیاز وجہ ہے اس حق الیقین کی کہ صادقہ اور یوسفی کی مصائب سے قدرت کو اس کے سوا کوئی فائدہ نہ تھا۔ کہ دونوں بہنوں کی داستان بنی نوع انسان کے واسطے ایک عبرت ہو۔

مقدرات پر یقین ہمیشہ عقدۂ لاینحل رہا اور گو یقین جزو مذہب سہی تاہم مذہب چونکہ نصف دائرہ محدود ہے اس لیے کسی خاص مذہب کے احکام اصول مسلمہ نہیں ہو سکتے اور ہمارا یہ عقیدہ کہ انسان اپنے قول افعال حرکات سکنات حتی کہ ترقی و تنزل کا خود ذمہ دار ہے گو یقین مذہب ہی سہی مگر ہم اس معاملۂ خاص کی کسی بحث کو مذہب سے متعلق کرنا نہیں چاہتے اسی وجہ سے ہمکو مولانا یوسف کی اس حرکت پر مطلق اعتراض نہیں کہ انہوں نے مذہب کو نظر انداز کر دیا۔ ہاں انسانی دنیا کے ساتھ ان کے تعلقات پر رائے زنی کا استحقاق ہر شخص کو تھا اور ہے اور رہے گا۔

قیاس میں نہیں آتا کہ وہ شخص جس کے تقدس کی یہ کیفیت کہ نہی ایک عالم اس کا معتقد اور ایک دنیا جسکی مرید آخر وقت آکر اسکی ایسی مٹی پلید ہو کہ کال دوپہر اس قہر کی گرمی میں جنازہ پر مکھیاں بھنکیں اور کوئی اٹھانے والا نصیب نہو جنگل میں مرا نہیں کنبہ میں گرا پڑا نہیں نگوڑا ناٹھا غریب نہیں زندگی میں بدنصیب نہیں بیٹے موجود بیٹیاں موجود۔ بچوں کے بچے موجود۔ رہنے کی محلسرا سنگین حسینی درگاہ کا سجادہ نشین۔ پانسو کا وظیفہ خوار اور دو گاؤں کا معافیدار اپنا شہر اور پھر مسلمانوں کا مردہ کہ رستہ چلتے اور بوجھ ڈھوتے اپنے اپنے کام چھوڑ کر کندھا دیں کسی نے یہ تک نہ پوچھا کہ مولانا کب مرے کہاں مرے اور کس وقت مرے غضب یہ کہ چھ بجے صبح سے مردہ پڑا سڑا کیا اور دن ڈھلے محلہ اور پڑوس تو در کنار سگے بیٹے اور بیٹیوں نے ٹھٹھے مار مار کر تو اسے اڑائے اور مردے کو کلمہ اور درود کس کا جھانکا تک نہیں

ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ مولانا آنکھوں کے تھے اندھے نہ غرض سے کچھ بندے ماباپ سے لگاؤ نہ بہن بھائیوں سے مس کینہ سے واسطہ نہ پڑوس سے غرض زعم حکومت میں چور نشہ دولت میں بیہوش جیسے میں گئی انسانیت اور بھاڑ میں گیا خون، کا جوش ہانکے پکارسے کہتا اور علی رؤس الاشہاد کہتا کہ دنیا واسطے اس کے اور وہ واسطے اپنے غرض الامر یہ ہے کہ نفس پروری کا مادّہ موجود تھا اور تربیت مجسٹریٹی نے اور بھی دو دونا بنایا۔ اب اس پر طرّہ آزادی ولاپروائی دنیا کا خوف نہ خدا کا ڈر شراب. بنی رفیق بیوی نہیں شفیق، دوست نصیب ہوئے تو ایسے جو خلق کو کہیں گناہ سلوک کو بتائیں حرام بیوی میسر ہوئیں تو ایسی جو محلہ بھر کو سمجھیں فقیر۔ کنبہ بھر کو جانیں غلام اپنی سادت وہ بیوی کی حقیقت یہ۔ دوستوں کی صحبت سونے پر سہاگہ اس کینڈے کا آدمی جتنا بیٹھا ہوتا جائے دوست

ہمیں صادقہ اور یوسفی دونوں سے زیادہ ان کے جدامجد مولانا یوسف سے ہمدردی ہے مگر ایمان نہیں نگلا جاتا واقعات چیخ چیخ کر پکار رہے ہیں کہ باایں ہمہ نخوت و رعونت مولانا کی بیبیاں خاوند کے ہاتھوں مجبور رہیں۔ وہ کٹھ پتلی کی طرح ستلی سے بندھی اس کے اشاروں پر ناچتی تھیں ورنہ پہلی دوسری تیسری۔ چوتھی چاروں میں سے ایک تو انسان نکلتی مولانا کی بعد چوتھی بیوی اٹھارہ برس کے قریب زندہ رہی وہی گھر تھا وہی محلہ اور محلہ والے مالدار تھی اور خودمختار۔ مگر وہی بیوی جو میاں کے جیتے جی کسی سے بات تک کرنے کی روادار نہ تھی۔ پڑوسیوں تک کی دکھ بیماری میں ساری ساری رات بیٹھ کر گذار دیتی۔

مولانا یوسف کو دنیا سے اٹھے تین صدیاں ہوچکیں مگر ان کے کارنامے

زندہ ہیں اور دو یتیم بچیوں کی روح جنپر اسی شقی ازلی نے مصیبت توڑی آج
تک لعنت برسا رہی ہے۔

(۱)

ماں کی موت یا سوت کا سانحہ ہماری طرز معاشرت میں معصوم بچوں کے
واسطے قیامت کا سامنا ہے مگر حسرت نصیب نہیں وہ دو بچیاں جن کو حقیقی
دادا کی بدولت زندگی سے ہاں روح ہو گئی یہہ مصیبتوں کے پہاڑ اگر باپ کے
ہاتھوں ٹوٹتے تو صبر آ جاتا۔ مگر رونا تو یہ ہے کہ وہ دادا جس سے یہ توقع
تھی کہ مرے ہوئے لڑکے کی ان نشانیوں کو کلیجہ سے لگائیگا جان کا دشمن ہو گیا۔
مفصل داستان کے بیان سے بات کہیں کی کہیں پہنچ جائے گی مختصر یہہ ہے
کہ مولانا یوسف کا بڑا لڑکا یامین پی۔ ایچ ڈی۔ ہوتے ہی چھ سو روپیہ کا پرنسپل
ہوا عاشق زار مارندہ تھی مولانا کا ارمان جی میں تھا جس تزک احتشام سے
یہ شادی رچائی گئی اس کے بیان میں ابن حمیرہ پورے بیس صفحے رنگ ڈالے
سہہ باجے گاجے ناچ رنگ کہانہ دانہ یامین کی برات نے نوابوں اور رئیسوں کی
بھی مات کیا ہر چیز کی افراط اتنی تھی کہ دیکھنے والے اش اش کرتے تھے۔
آتشبازی اور چراغاں سے شہر جگمگا اٹھا یوسفی اور صادقہ اسی شادی کی
یادگار ہیں مگر افسوس بدنصیب ماکو پوتیوں کی بہار دیکھنی نصیب نہوئی۔ اگر اسکی
عمر وفا کرتی تو وہ بن باپ کی بچیوں کو سر بٹھاتی اور آنکھوں پر رکھتی اس کی
زندگی میں یہ وقت نہ آتا کہ یامین کی بچیاں دوسروں کے پیروں میں
رلتی پھریں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ یامین کی اور یامین اپنی بچیوں کا دیوانہ
تھا مگر اس کے سامنے یامین کی اتنی مجال نہ تھی کہ وہ بچیوں کو ٹیڑھی آنکھ سے
دیکھے صرف اتنی سی بات پر کہ چھوٹی بچی صادقہ ایک دفعہ باپ کے ہاتھ میں

اشرفیاں دیکھ مچل گئی اور باپ اشرفیاں نبدکر صندوقچہ میں رکھ باہر چلدیا وہ بیاہے تہائے جوان صاحب اولاد لڑکے کو گھر سے نکالنے کھڑی ہوگئی اور جب تک پانچوں اشرفیاں اس چار برس کی جان کو نہ دلوا دیں جس میں سے ایک آخر کار کھوئی گئی ماں نے یامین سے سیدھے منہ بات نہ کی +

ان بچیوں کے ناز بردار آنا باوا اور دادی تینوں قبروں میں جا سوئے اور جن آنکھوں نے انکی ہٹیں اور ہٹوں کی تکمیل دیکھی وہ بھی ہمیشہ کو بند ہوگئیں لیکن یہ سونے والی آنکھیں کاغذ کے صفحوں پر وہ واقعات چھوڑ گئیں جو یامین کو یعقوب کے پہلو میں بٹھا رہے ہیں۔

مولانا یوسف کی حقیقی چچا نادہن راحیل ایک رات کے واقعات اسطرح بیان کرتی ہے عشا کی اذان ہو چکی تھی صادقہ باپ کے گلے میں بائیں ڈالے بیخبر پڑی سوتی تھی۔ ماں وضوں کی نیت باندھ چکی ہی تہی کہ دفعتہً صادقہ نے استغراق کیا گھر بہر میں کھلبلی مچ گئی گرمی کا موسم ضرور تہا مگر یامین جیسے معقول آدمی کے رونے پر ہنسی آتی تہی چیخیں مارنے لگا اور اگر خود بچی کی حالت اس کو یقین نہ دلادے تو وہ ہیضہ سمجھ اسکی زندگی سے نا امید ہو ہی چکا تھا۔ ماں تا کیا جنون تھا کہ ایک ساعت میں ڈیڑھ ہزار روپیہ نقد خیرات ہو گیا۔ بچی اچھی بھلی پڑی سوتی ہے اور دو تو ماں باپ اس کے سانس گن رہے ہیں۔ ماں کی مامتا ضرور تھی مگر باپ باپ نہیں دیوانہ تہا جو بچیوں کے قدم قدم پر آنکھیں بچھاتا مجال نہیں کہ دم بھر کو ایک بھی آنکھ سے اوجھل ہو جائے۔ ایمان اگر کوئی چیز ہے تو بالآخر یہ کہنا پڑے گا کہ یوسفی اور صادقہ ماں کی گود میں بیٹھیں باپ کی آنکھوں میں رہیں دادی کے سینہ پر لوٹیں اور بیسیوں خوشامدیوں کے سر پر بیٹھیں ماننا پڑے گا اور پہر ماننا پڑے گا کہ یامین کی بچیاں یوسفی اور صادقہ

سونے چاندی میں کھیلیں اللہ آمین سے ملیں اور ہاتھوں چھاؤں بڑھیں۔

(۲)

یاسمین کے واسطے ماں کی موت صدمہ جگر خراش یا ناقابل تلافی نقصان جو کچھ بھی ہو عارضی تھا جس کا اثر زائل ہوتے ہوتے نام کو بھی نہ رہا۔ مگر مولانا یوسف کی حالت قابل رحم تھی کہ تیس برس کا بنا بنایا گھر بڑھاپے میں اُجڑ گیا کیسے درد سے روتا تھا کہ سننے والوں کے کلیجے پھٹتے بیٹا بیٹیاں پوتے پوتیاں تیس بتیس آدمیوں کا کنبہ۔ مگر جو آرام بیوی کے دم سے تھا وہ کہاں حق الامر یہ ہے کہ یاسمین کی ماں عورت نہیں فرشتہ تھی جو تیس برس زندہ رہی۔ مگر تمام عمر میں ایک دفعہ بھی میاں کی حکم عدولی نہ کی بیسیوں باتیں عادت کے برعکس اور طبیعت کے خلاف ہوتیں مگر اس خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتی کہ کسی کو شبہ تک نہ ہوتا ایسی بیوی اگر مر کر میاں کو زندہ درگور کر گئی تو تعجب کیا دوسرے نکاح کی مولانا یوسف کو نہ ضرورت تھی نہ عمر تھی ساٹھ سے اوپر سن بڑھاپے کے دن خدمت کو نوکر فرمانبرداری کو اولاد بیماری کا ساتھ قویٰ میں انحطاط اچھی ہوئی نیند تھکا ہوا کھانا سچ پوچھو تو مولانا یوسف کے اللہ اللہ کا زمانہ تھا۔ مگر کس کا سال اور مہینہ ایک دو ہی ہفتہ کے اندر اندر وہ راج پلٹا کہ پندرہ برس کی سہ جبین مولانا کے پہلو میں براجی ہی تھی دونا جو کی بیوی سوداگر کا گھوڑا مشہور سے عورت تھی نوتا جربہ کار مگر بہار کا موسم تھا زیور اور کپڑا سلے اوڑھا مولانا انیس برس بعد پھر دولہا بنے اور نئی دولہن کی چٹک مٹک دیکھنی نصیب ہوئی گو زیادہ حسین نہ تھی مگر مولانا کی موت کو بہت تھی عطر میں بسی پھولوں میں مہکی زیور میں لوٹی کپڑوں میں لدی

ہاتھوں میں مہندی پور پور چھلّے مولانا آ بیگے کلمہ پڑھتے بیٹے اور بہو اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ ابّا جان نئی بیگم کے لیے پان بنا رہے ہیں اور منہ پھیر لیتے بیٹیاں اپنے کانوں سے سنتیں کہ باپ کا منہ دولہن بیگم کہتے کہتے خشک ہو رہا ہے اور سنی ان سنی کر دیتیں ✤

(باقی آئندہ) راشد الخیری

حاجی احسان الحق صاحب قادری ہیں لال کرتی چھاؤنی میرٹھ نے ان تمام مضامین کو جو جنگ طرابلس کے متعلق مشہور اہل قلم نے مختلف اخبارات میں لکھے جمع کر کر دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور جس کا پہلا حصہ خون ناحق کے نام سے تیار ہے ✤

کونسا ایسا مسلمان ہوگا جسے جنگ طرابلس سے ہمدردی نہ ہو یہ مجموعہ سرزمین طرابلس کی ایسی سچی تصویر کھینچ رہا ہے کہ ہر مضمون کو مکرر سہ کرر پڑھنے کے بعد بھی سیری نہیں ہوتی۔ کتاب بڑی تقطیع پر نہایت آب و تاب سے شائع ہوئی ہے اور ہمیں امید ہے کہ قوم حاجی صاحب کی قدردانی کرے گی قیمت (عہ) ایک روپیہ

حاجی صاحب سے مل سکتی ہے۔

غزلیں

ازخان بہادر سید الشعرا مولانا شاد عظیم آبادی

جہاں سے جاتے ہیں اب جی کے ہارنے والے — کدھر گئے مرے گیسو سنوارنے والے
پلٹ کے دیکھ تو لیتا، دیا تھا گر نہ جواب — چلے سے گڑ گئے تجھ کو پکارنے والے
کچھ اس طرح سے ستائے گئے گلی میں تری — پلٹ کے آئے نہ پھر جی کے ہارنے والے
سمجھ کے تیری گزرگاہ در پہ غیر کے ہیں — جیا بھی ہار گئے دل کے ہارنے والے
بس اب جواب ملے گا یہی رہی امید — پکارتے رہے تجھ کو پکارنے والے
ذرا سی ٹھیس بھی شیشے کیواسطے ہے پہاڑ — سنبھل کے طاق سے مینا اتارنے والے

بس اب بے خبری خیر اُن کے حُسن کی اے شاد
بلائیں لے کے چلے جان وارنے والے

از حضرت رشید مدظلہ'

عقدے الفت کے سب اے رشک قمر کھول دیے — سینہ یوں چاک کیا داغ جگر کھول دیے
آگیا ہوش تری چال سے مشتاقوں کو — حشر کی سُن کے صدا دیدۂ تر کھول دیے
جا تعجب کی نہیں گر اہل محبت رو دے — میرے ماتم میں حسینوں نے بھی سر کھول دیے
پائی تاروں نے ضیا بڑھ گئی تاریکیٔ شب — اُسنے منہ ڈھانک کے کانوں کے گہر کھول دیے
جام باراں کیطرح سے ہے کرم ساقی کا — آئی برسات کہ میخانہ کے در کھول دیے
آنکھیں کھولے ہوئے سب دیکھ رہے ہیں تجھکو — دل کے جانیکو یہ عشاق نے در کھول دیے
امتحان حسرتِ پرواز کا منظور رہا — ذبح کر کے مجھے صیاد نے پر کھول دیے

شرم آئیگی مجھے لوگ سمجھ جائیں گے
تم نے گیسو مرے لاشے پہ اگر کھول دیے

اصلی قیمت (عہ) رعایتی (عہ) علاوہ محصول۔ آخر اگست ۱۹۱۲ء تک محصول معاف

وصل حبیب کے متعلق ایک تازہ اور وقیع رائے

(از مولوی حکیم بشیر احمد خان صاحب دہلوی چیف میڈیکل آفیسر ریاست دوجانہ)

ناول وصل حبیب بذریعہ وی۔ پی۔ وصول ہوا۔ خدا معلوم آپ کی تحریر میں کیا کشش مقناطیسی ہے کہ باوجود عدیم الفرصتی بغیر ختم کئے چھوڑنے کو دل گوارا نہیں کرتا۔ برخلاف تمام ناولوں کے آپ کا رنگ مخصوص ہے اور یہ صرف آپ ہی کا حصہ ہے۔ آج کل علاوہ مشاغل دربار۔ انتظامات طاعون میں سخت منہمک ہوں۔ اور ایک لمحہ کی بھی فرصت نہیں۔ مگر آپ کے مصنفہ ناول کے واسطے دو راتوں کی پیاری نیند کو قربان ہی کرنا پڑا۔ علاوہ میرے جس شخص نے دیکھا بے حد پسند کیا۔ اور غائبانہ آپ کے مشتاق ہیں۔

۱۹۔ اپریل ۱۹۱۲ء

مندرجہ ذیل کتب بھی رعایت پر ملسکتی ہیں

سیر ظلمات ...	عمر	دیگر وقتیدا	۱۲آر	حسلوۂ ایثار	۱۴ار
فسانۂ لندن ہر دو حصہ	۱۲ر	فتح اندلس	۱۲ار	عیار شہزادہ	۱۲ار
انتقام کامل	۱۲ر	مقدس نازنین	۱۲ار	روزا البرٹ	۱۲آر
غیبداں دلہن	۱۲ار	حسن انجلینا	۱۲ار		

المشتہر محمد عبد العلیم مہتمم کتب خانہ حبیبیہ ڈاکخانہ گوہر گنج ریاست بھوپال

ڈاکٹر برمن کی بنائی ہوئی مشہور دوائیں

ستائیس برس سے سارے ہندوستان میں استعمال میں آ رہی ہیں

(۱) دما جسے زور سے اچھلتا ہو اس دوا کے دو ایک موتا دہی سے دب جاتا ہے۔

(۲) پتا ہو اور اس دوا کا استعمال کیا جائے تو دما جڑ سے جاتا ہے۔

(۳) پورانے دما والے یا جن کا دما دم کا ساتھی ہو گیا ہے وہ بھی اس دوا سے بہت صحت پاتے ہیں

دمہ کی دوا۔ ڈاک محصول ایک سے تین شیشی تک ۸ قیمت ایک شیشی ایک روپیہ چار آنہ (عہ)

مقوی گولیاں ڈاکٹری میں طاقت دینے والی دوائیوں میں مشہور دوائیں۔ فاسفورس آئرن اور کونینا ملا کر یہ گولیاں بنی ہیں مغز ہیر و رگ ناس۔ اور خون کو یہ طاقت دیتی ہے اس لیے ان کی کمزوری سے پیدا ہوئی معمولی کمزوری تو ا ... دل۔ یاد ہونا۔ ... بھوکا لگنا ... وغیرہ ان گولیوں سے آرام ہو جاتا ہے ایک ہفتہ کی خوراک تیس گولیوں کی شیشی قیمت ایک روپیہ (عہ) ڈاک محصول ایک سے چار شیشی تک پانچ آنہ۔

امراض مستورات کی دوا یہ ہر ایک اقسام کے مستورات کی دوا ہے ہر طرح کی رحم کی بیماری پردر درد حمل کی کمزوری پیٹ جانا نگ ہر و وغیرہ کو مٹا کر اس دوا کے استعمال سے رحم کی خرابی تمام دور ہو کر جسم قوی ہوتا ہے ایک دفعہ اس دوا کی بھی آزمائش کیجیے قیمت ایک شیشی ایک روپیہ (عہ) ۱۶ خوراک ڈاک محصول ۷

ان دوائیوں کی مفصل حالت معہ سرٹیفکیٹوں کی پوری کتاب بلا قیمت ملتی ہے منگا کر پڑھیے

ڈاکٹر ایس۔ کے۔ برمن

نمبر ۶ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ

نوٹ۔ ہمارے ایجنٹ آغا منصب علی کشمیری دروازہ دہلی میں ہیں۔

فرمایش کے ساتھ اخبار کا حوالہ ضرور دیں